OSMANIA UNIVERSITY

جامعہ عثمانیہ

تاریخ ہند

(عہد جدید)

سلسلۂ مطبوعات نصابیہ جامعۂ عثمانیہ

نشان (۳۷۲)

تاریخ ہند

(عہد جدید)

از سنہ ۱۷۶۴ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

تالیف

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب

صدر شعبۂ تاریخ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۶۷ھ سنہ ۱۳۵۷ف سنہ ۱۹۴۸ء

مطبوعۂ

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

تاریخ ہند

(عہد جدید)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخِ ہند

(عہدِ جدید)

پہلا باب

اہلِ یورپ کی آمد

اہلِ یورپ کی بیداری

چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ کی قوموں میں زندگی اور بیداری کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس بیداری کی بدولت کلیسا اور مملکت کے اصول اور زندگی کے عام نقطۂ نظر میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی جس کی مثال یورپ کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ عالمگیر بادشاہی اور عالمگیر کلیسا کے تصورات کی جگہ قومی حکومت اور انفرادی ضمیر کی آزادی کے اصول کا چرچا ہوا۔ سند اور روایت کی بجائے تنقید اور تحقیق کا

سہارا تلاش کیا جانے لگا کہ ان ہی کے بطن سے نئی زندگی نے جنم لیا تھا۔ یونان و روما کے قدیم علوم کے احیاء کی کوشش اس واسطے کی گئی کہ ان میں ازمنۂ وسطیٰ کے متکلمانہ علوم کی اندھی تقلید اور روایت پرستی کے مقابلے میں تنقید اور آزادئ فکر کے اصول کی زیادہ گنجایش نظر آئی۔ غرض کہ اس نئے دور کی خصوصیت خاصہ آزادی ایجاد اور تسخیر کے عام اصول تھے جنھوں نے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا زندگی کی ان نئی قوتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسی عہد میں فن طباعت اور کاغذ کے استعمال سے لوگ واقف ہوئے۔ بارود کے پوشیدہ خواص سے واقفیت ہوئی۔ قطب نما ایجاد ہوا جس کی مدد سے سمندر پار کے نئے نئے ملکوں کی دریافت کا شوق اہل یورپ کے دلوں کو گدگدانے لگا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ نظام بطلیموسی کی جگہ کوپرنیکس کے نظام شمسی کو تسلیم کیا گیا جس کی بدولت علوم طبعی اور سائنس کی بنا پڑی۔ یہ ذہنی تحریک جس نے یورپ میں ان زبردست تغیرات کو پیدا کیا نشاۃ جدیدہ (رینے سانس) کہلاتی ہے۔

نشاۃ جدیدہ کی تحریک کے کچھ بعد یورپ میں اصلاح مذہبی (ریفارمیشن) کا غلغلہ بلند ہوا۔ لوگوں کے دلوں میں توہمات کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کی خواہش پیدا ہوئی جن کی وجہ سے قوائے عملیہ شل ہو گئے تھے۔ یہ زندگی کے پرانے اور فرسودہ اصول کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اسی واسطے اس کو پروٹسٹانٹزم کہتے ہیں لیوتھر، کالون اور دوسرے مصلحوں نے پاپائیت کے عالمگیر اثر کو ختم کرنے اور مذہبی معاملات میں ضمیر انسانی کو فیصلے کا آخری حق دلوانے کا بیڑا اٹھایا۔ انجیل کی نئے طرز پر توجیہ کی گئی تاکہ ہر فرد بشر بغیر کسی واسطے کے اپنے مالک حقیقی سے تعلق قائم کر سکے۔ اس کے لیے پاپا اور اس کے عملے کی وساطت درکار نہ ہو۔ مذہب کے اس نئے نقطۂ نظر کی بدولت عمل و تسخیر کی بے پناہ قوتیں جاگ اٹھیں جنھوں نے اہل یورپ کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے اُکسایا اور ساری دنیا میں ان کا سکہ بٹھایا۔

تاریخ یورپ کے محققوں کا خیال ہے کہ نشاۃ جدیدہ اور اصلاح مذہبی کی تحریکیں خود بخود پیدا نہیں ہو گئیں بلکہ ان کا وجود اسلامی تہذیب و تمدن کے اصول کا

رہین منت ہے۔جن کا چرچا اس زمانے میں یورپ میں ہو چکا تھا۔اس زمانے میں سوائے اسپین کے یورپ میں کوئی ملک نہ تھا جہاں علم و تحقیق کو توہمات کے غلاف میں لپیٹ کر نہ رکھ دیا گیا ہو۔پندرھویں صدی تک یورپ کے کسی بڑے مصنف کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا جس نے عرب مصنفوں سے استفادہ نہ کیا ہو۔یونانی اور لاطینی سے عربی میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں پر اہل یورپ کی تحقیق کا تمام تر دار و مدار تھا۔عرب محققوں کے طریقۂ تحقیق کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تجربے اور مشاہدے سے اپنے نتائج اخذ کرتے تھے۔تجربی طریقے کی بدولت ان کی تحقیق میں صحت اور جدت پیدا ہو گئی جس کی مثال یورپین مصنفوں کے یہاں نہیں ملتی جو تجریدی مباحث اور صرف اپنے پیشرووں کی رایوں کو بار بار دہرانے ہی کو تحقیق خیال کرتے تھے۔تجربے اور مشاہدے کو تحقیقاتِ علمی کی بنا قرار دینا اسلامی مفکروں کا زبردست کارنامہ ہے کہ بغیر اس کے اسباب و حوادث کا ٹھیک ٹھیک کھوج لگانا ممکن نہیں یہی اصول جدید سائنس کی بنا ہے جسے اہل یورپ نے اپنے عرب استادوں سے سیکھا انھوں نے انسانی آزادی کا سبق بھی اسپین کی جامعات میں پڑھا تھا جس کی انھوں نے سارے یورپ میں اشاعت کی۔اس کی بدولت نئے ذہنی اور اخلاقی تصورات نے جنم لیا اور قومی اور بین الاقوامی سیاست کے نئے باب کا آغاز ہوا۔عالمگیر سلطنت کی بجائے قوموں کی انفرادیت وجود میں آئی۔

اب تک یورپ کے بیشتر لوگ بحرِ روم کے ملکوں کے علاوہ دوسرے ملکوں سے واقف نہ تھے۔صلیبی جنگوں کے بعد اہل یورپ کی واقفیت میں تھوڑا بہت اور اضافہ ہوا۔اور اسلامی ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔اٹلی کے شہروں میں وینس اور جینوا تجارت کے بڑے مرکز بن گئے۔مشرقی ملکوں کا سامان عرب تاجروں کے ذریعے سے ان شہروں تک پہنچتا اور وہاں سے وسط اور شمالی یورپ کے بازاروں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔مشرقی تجارت کی بدولت وینس اور جینوا یورپ کے سب سے زیادہ دولتمند شہر بن گئے۔

خلفائے عباسیہ نے شہرِ بصرہ کو ترقی دی تاکہ خلیج فارس میں ہندوستان اور مشرق بعید سے جو سامان آتا تھا وہ شام میں خشکی کے راستے سے اور پھر

جہازوں میں یورپ کے ملکوں تک پہنچایا جائے۔ اسی طرح بحرِ احمر تک عرب جہاز راں مشرق سے سامان اپنے جہازوں پر لاتے، وہاں سے اسکندریہ تک خشکی کے راستے اور پھر جہازوں کے ذریعے اٹلی کے شہروں تک اسے پہنچاتے تھے۔ حکومتِ مصر اور وینس کی جمہوری حکومت میں تجارتی اغراض کے لیے معاہدہ ہوگیا تھا جس کی منظوری پاپائے روما نے بھی دے دی تھی۔ مصر کے فاطمی خلفا اور مملوک سلاطین کے عہد میں ہندوستان کی تجارت کے محاصل کی بدولت حکومت مصر کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ محققوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد اہلِ یورپ کی ضروریات میں جو اضافہ ہوا اس کو پورا کرنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ مشرقی ممالک سے تجارت کو فروغ دیا جائے۔ ہندوستان اور مشرق بعید کے ملکوں کا سامان بحر احمر تک عرب جہاز راں لاتے تھے اور اس کے بعد اسکندریہ سے اطالوی جہاز راں وینس اور جینوا کے تجارتی مرکزوں کو یا یورپ کے دوسرے ملکوں کو لے جاتے تھے۔ چنانچہ اطالوی جہاز رود بار انگلستان اور بالٹک کے ساحل تک جاتے اور مشرقی ممالک کے سامان کو شمالی یورپ کی مختلف منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ لیکن پندرھویں صدی کے وسط میں یورپ کے شمالی ممالک میں بھی اولوالعزمی پیدا ہوئی اور وہ اپنے جہاز اطالوی شہروں کو مشرقی ممالک کا سامان خریدنے کے لیے بھیجنے لگے۔

قطب نما کی ایجاد سے یورپ کے مختلف ملکوں کے حوصلہ مند جہاز ران نئے نئے ملک دریافت کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ خاص طور پر لاطینی ملکوں میں بحری سفر کا شوق بہت بڑھ گیا۔ اس بحری مہم جوئی کی بدولت اہل یورپ کو ایسے تجارتی مواقع حاصل ہوگئے جن کے سامنے بحر روم کی محدود تجارت ہیچ ہو گئی۔ اس ضمن میں اسپین اور پرتگال نے دوسرے ملکوں پر سبقت کی۔ اہل پرتگال کو خاص طور پر اطالوی شہروں کی دولتمندی پر رشک ہونے لگا اور انھوں نے کوشش شروع کی کہ ہندوستان اور مشرق بعید کی تجارت کو براہِ راست سمندر کے راستے سے اپنے ملک کی طرف کھینچ لیا جائے تاکہ عرب اور اطالوی تاجروں کا واسطہ باقی نہ رہے۔ پرتگال کے جہاز ران کئی سال اس فکر میں لگے رہے کہ افریقہ کے گرد ہو کر ہندوستان پہنچیں۔

اسی طرح اسپین کے جہاز راں مغرب کی طرف سے اٹلانٹک کو پار کر کے ہندوستان پہنچنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ان مساعی کی بدولت حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ اور دنیا کے جغرافیے کا صحیح علم حاصل ہوا۔

بحری سفر اسپین کے حکمراں فرڈیننڈ اور ازابلا نے ایک اطالوی جہاز راں کرسٹو فر کولمبس کو جو جنیوا کا رہنے والا تھا ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کے لیے ۱۴۹۲ء میں روانہ کیا۔ کولمبس یورپ کے ان جہاز رانوں میں سے تھا جنھوں نے قطب نما کو سب سے پہلے اپنے بحری سفر میں استعمال کیا مارکو پولو اور دوسرے سیاحوں کے بیانات سے کولمبس کو یقین تھا کہ بحر اٹلانٹک کے مغرب میں جانے سے ایشیا کے براعظم تک پہنچنا ممکن ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس منصوبے میں کامیابی ہوگئی تو مشرق کی ساری تجارت عربوں کے ہاتھ سے نکل کر اہل یورپ کے تصرف میں آجائے گی۔ اس کے یہ خیالات دنیا کے جغرافیے سے متعلق اس قدر انقلاب انگیز تھے کہ اس کو کئی سال تک کوشش کرنی پڑی کہ یورپ کی کوئی حکومت اس کے بحری سفر کے اخراجات برداشت کرنے اور اس کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے آمادہ ہو۔ بالآخر حکومت اسپین نے کولمبس کی حوصلہ افزائی کی اور نئی دنیا کے معلوم کرانے کا سہرا اسی کے سر رہا۔ کولمبس جب جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) پہنچا تو اس کو یقین ہوگیا کہ یہ ہندوستان کے مشرق کے جزیرے ہیں جن کا ذکر وہ سن چکا تھا۔ غرضکہ اس طرح ویسٹ انڈیز اور جنوبی امریکہ کے انکشاف سے اہل یورپ کو پتا چلا کہ بحر اٹلانٹک کے مغرب میں بھی زمین واقع ہے جس سے وہ اب تک بے خبر تھے۔ اسپین نے جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے علاوہ پیرو اور میکسیکو میں بھی اپنی نوآبادیاں قائم کریں۔ شاہ انگلستان ہنری ہفتم کے عہد حکومت میں انگلستان میں بھی بحری جد وجہد کا آغاز ہوا۔ جس کے نتائج نہایت دوررس نکلے۔ ۱۴۹۷ء میں جان کیبٹ جو جنیوا کا رہنے والا تھا انگریزی بیڑے کو لے کر اٹلانٹک کے شمال کی طرف بڑھا اور نیو فاونڈ لینڈ پہنچ گیا۔ اس طرح انگریزوں نے امریکہ کے شمال مغربی ساحل پر اسی طرح اپنے حقوق قائم کر لیے جس طرح اسپین نے جنوبی امریکہ میں چند سال قبل اپنے حقوق قائم کر لیے تھے۔ بعد میں ملکہ الزبتھ

کے عہد حکومت میں وسیع پیمانے پر انگریزی نوآبادیاں شمالی امریکہ میں جگہ جگہ قائم ہوگئیں اور تجارت اور نوآبادکاری کے سلسلے میں انگریزوں اور اسپین والوں کی سیاسی رقابت بڑھ گئی۔

اہلِ پرتگال کی ہندوستان میں آمد

لیکن اہل پرتگال نے بحری سفر کرنے میں بڑے استقلال اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ پرتگالی شاہی خاندان میں ہنری نے (۱۳۹۴ء۔ ۱۴۶۰ء) جو جہازراں کے لقب سے مشہور تھا یورپی قوم کی توجہ کو بحری جدوجہد کی طرف مبذول کرا دیا۔ ہر صاحب ہمت شخص نے اپنا یہ فرض قرار دیا کہ نئے اور غیر معلوم مقامات کا سفر اختیار کرے۔ وہ خود جہاز رانی کے فن سے خاص لگاؤ رکھتا تھا، اور اپنے جہازرانوں کو ہدایات دے کر روانہ کیا کرتا تھا۔ وہ ایک نئی شہنشاہی کی بنا ڈالنا اور مسیحی مذہب کی اشاعت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ذاتی مثال اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگالی جہاز ران افریقہ کے مغربی ساحل کے ممالک تک جانے لگے اور انھوں نے خط استوا کو عبور کر لیا۔ ۱۴۸۶ء میں بارتھولومیو دیاز راس امید تک ہو آیا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکو دی گاما ایک عرب جہازراں احمد بن ماجد کی رہبری میں راس امید ہوتا ہوا مالابار کے ساحل پر کالی کٹ پہنچا۔ اور وہاں کے حکمراں زمورن کو بادشاہِ پرتگال کا خط پیش کیا۔ زمورن نے اس کی آؤ بھگت کی اور پرتگالی تاجروں کے لیے خاص رعایتیں منظور کیں۔

پوپ الگزنڈر ششم نے ۱۴۹۳ء میں اس زمانے کی معلوم دنیا کو شمالی جنوبی خط کے ذریعے جو کیپ ورڈ سے گزرتا تھا مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ افریقہ اور ایشیا پرتگال کے حصے میں آئے اور امریکا اسپین کے حصے میں بعد میں اسپین اور پرتگال کی حکومتوں نے پوپ کے اس فرمان کے موجب ایک صلح نامہ طے کر لیا جس کی رو سے دونوں ملکوں کے مفاد کے تصادم کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ یورپ کے کیتھولک ممالک میں ابھی پوپ کے فرامین کی اہمیت باقی تھی۔ اس فرمان کے شائع ہونے کے سو سال بعد پروٹسٹنٹ قوموں نے اس کی خلاف ورزی کی اور ہالینڈ اور انگلستان کے جہاز رانوں نے اپنے ملکوں کی

تجارت کو ترقی دینے کے لیے بحری سفر اختیار کیے۔

اس زمانے میں مالابار کے ساحل پر عربوں کی تجارتی نوآبادیاں موجود تھیں۔ مصری تاجر زیادہ تر مسالوں کی تجارت کرتے تھے اور ہندوستان اور مشرق بعید سے جہاز لاد کر بحر احمر تک لے جاتے تھے۔ واسکوڈی گاما نے اپنے سفر کے دوران میں دیکھا کہ مڈگاسکر سے لے کر آبنائے ملاکا تک تقریباً سارے بحرِ ہند کی تجارت عرب تاجروں کے قبضے میں ہے۔ یہ لوگ سماترا اور جاوا سے مختلف مسالے اور سونا اور چاندی لاتے تھے اور مالابار سے مسالے، مرچ، ہاتھی دانت مونگا، ریشم، تانبا اور جست لے جاتے تھے۔ عرب اور ایران سے گھوڑے اور چین سے ریشمی کپڑے خریدتے اور جس ملک میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی وہاں ان کی نکاسی کرتے تھے۔ مصری تاجروں کے گماشتے بحر احمر میں، جدے میں اور ساحل مالابار پر کالی کٹ میں رہا کرتے تھے۔ جدے میں اسی قیمت پر مرچ فروخت ہوتی تھی جس قیمت پر کالی کٹ میں۔ مصری حکومت کا حکم تھا کہ ہندوستان سے جو سامان آئے اس میں لازمی طور پر ۱/۳ مقدار مرچ کی ضرور ہو جس کی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ اگر کوئی تاجر اتنی مقدار مرچ کی نہ لے جاتا تو وہ جدے میں خرید کر کمی پوری کر لیتا تھا۔ جدے سے سامان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوئز جاتا اور وہاں سے اونٹوں پر لد لد کر قاہرہ پہنچتا تھا۔ قاہرہ سے اسکندریہ اور پھر وہاں سے اطالوی جہازوں کے ذریعے بحر روم اور شمالی یورپ کی بندرگاہوں میں فروخت ہوتا تھا۔ اس ساری تجارت میں مختلف محصولوں کے ذریعے مصری حکومت کی خوب آمدنی ہو گئی تھی۔ اندازاً ہر بحری سفر میں سامان کی مالیت کا ۱/۳ حصہ مصری حکومت کو مل جاتا تھا۔ غرضکہ ہندوستان کی تجارت کا اصلی منافع مصری حکومت اور عرب تاجروں کو ملتا تھا۔ اطالوی تاجروں کا کام سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اسکندریہ سے مشرقی سامان کو اپنے جہازوں میں لے جائیں اور یورپ کی مختلف منڈیوں میں تقسیم کر کے تھوڑا بہت نفع کمائیں۔[1]

Rise of Portuguese Power in India, PP.7,8-By R.S.Whiteway

پرتگالیوں کی یہ دلی خواہش تھی اور یہی اصل محرک تھا جو انھیں مشرقی ملکوں کی طرف کھینچ لایا کہ کسی نہ کسی طرح سے ہندوستان اور مشرق بعید کی تجارت میں حصہ بٹائیں۔ واسکوڈی گاما کو کالی کٹ میں عرب تاجروں کا مقابلہ کرنا پڑا جو ظاہر ہے اس قدر آسانی سے اپنی بحرِ ہند کی وسیع تجارت کو پرتگالیوں کے حوالے نہیں کرسکتے تھے۔ ساحل مالابار پر عربوں کی مستقل نوآبادیاں بس گئی تھیں اور ان کے تعلقات یہاں کے حکمراں زمورن سے نہایت خوشگوار تھے۔ زمورن نے شروع میں تو پرتگالیوں کی آؤبھگت کی اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ ان کی وجہ سے اس کے علاقے کی تجارت کو اور فروغ ہوگا۔ لیکن بہت جلد وہ ان سے بیزار ہوگیا اور ان کے مقابلے میں عرب تاجروں کی حمایت کرنے لگا۔ چنانچہ واسکوڈی گاما اپنا کوئی مستقل اثر قائم نہ کرسکا اور اگست سنہ ۱۴۹۹ء میں لسبن واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی کے دوسرے سال پرتگال کے بادشاہ نے پیدرو والواریس کبرال کی سرکردگی میں تیرہ جہازوں کا بیڑا روانہ کیا۔ اس کے ساتھ بارہ سو مسلح سپاہی بھی تھے۔ کبرال نے کالی کٹ میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کی اور واپسی پر کنانور اور کوچین سے جہاں کے حکمرانوں سے پرتگالیوں کے تعلقات نسبتہً بہتر تھے۔ مسالوں کے علاوہ دوسرا بہت سامال اپنے جہازوں پر لاد کر پرتگال روانہ ہوگیا۔ اب براہِ راست پرتگالیوں کا تجارتی تعلق جنوبی ہند سے قائم ہوگیا۔ جوں جوں پرتگالی تجارت جنوبی ہند میں بڑھتی گئی اتنا ہی عربوں کی تجارت کو نقصان ہونے لگا۔ اب پرتگالی بغیر عرب اور اطالوی تاجروں کے واسطے کے مشرقی ملکوں کا سامان یورپ کی مختلف تجارتی منڈیوں کو لے جانے لگے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عربوں اور پرتگالیوں میں سخت رقابت اور کشیدگی پیدا ہوگئی۔ پرتگالیوں نے مالابار میں اپنے قدم جمانے کے بعد کھلم کھلا یہ کوشش شروع کردی کہ عربوں کی بحرِ احمر اور خلیج فارس کی تجارت کو نقصان پہنچایا جائے۔ انھوں نے عربوں کے جہازوں کو بحرِ ہند میں لوٹنا شروع کردیا۔ واسکوڈی گاما دوبارہ سنہ ۱۵۰۲ء میں بیس جہازوں کا بیڑہ لے کر ہندوستان آیا۔ اس کے حکم سے حاجیوں کا ایک جہاز جس میں عورتیں، بچے بھی شامل تھے مال و اسباب لوٹ لینے کے بعد بحرِ ہند میں آگ لگا کر غرق کرا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس خونیں منظر کو اپنے جہاز

میں دور سے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا تھا۔ واسکوڈی گاما نے زموَرن کو مجبور کرنا چاہا کہ وہ اپنے علاقے میں عرب تاجروں کی آمد و رفت کو حکماً بند کر دے تاکہ آئندہ ان کے جہاز ساحلِ مالابار پر نہ آسکیں لیکن زموَرن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پرتگالیوں سے بہت بیزار ہوگیا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کے قدم اس کے ملک میں نہ جمنے پائیں۔ چنانچہ اس کے حکم سے پرتگالیوں کو کالی کٹ کی کوٹھی بند کرنی پڑی جس کا انھوں نے سخت انتقام لیا۔ زموَرن کے اس طرزِ عمل پر واسکوڈی گاما کو بڑا طیش آیا اور اس نے زموَرن کی رعایا اور خاص کر عربوں پر ایسے وحشیانہ مظالم کیے کہ جن کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان مظالم کی نسبت خود پرتگالی مورخین نے بھی ذکر کیا ہے۔ واسکوڈی گاما نے کوچین اور کنانور کے رئیسوں کو جو زموَرن کے مخالف تھے اپنے ساتھ ملا لیا اور کالی کٹ پر سمندر کے راستے سے حملہ کر دیا۔ راستے میں چند چھوٹی کشتیوں کو پکڑ لیا جن میں پندرہ آدمی تھے۔ ان سبھوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اور اس کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ساحل پر پھینک دیے گئے تاکہ زموَرن کو عبرت ہو جائے۔ واسکوڈی گاما کے حکم سے کالی کٹ پر سخت گولہ باری کی گئی اور خود زموَرن کا محل گولوں کا نشانہ بنا۔ زموَرن کے بیڑے نے مقابلے کی کوشش کی لیکن وہ زیادہ عرصے تک پرتگالی بیڑے کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ واسکوڈی گاما کی واپسی پر زموَرن نے عرب تاجروں کی مدد سے کوچین پر حملہ کر دیا لیکن اس کو مٹھی بھر پرتگالیوں سے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پرتگالیوں کی اس کامیابی سے ان کی فوجی اور تنظیمی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۵۰۵ء میں المائڈا پہلا پرتگالی وائسرائے مقرر ہو کر جنوبی ہند آیا اور چار سال تک رہا۔ اس کے عہد میں زموَرن نے عرب تاجروں کے علاوہ گجرات اور بیجاپور کے سلاطین سے طے کیا کہ وہ سب مل کر پرتگالیوں کو ملک سے نکال دیں گے۔ پرتگالیوں کے خلاف اس معاہدے میں مصر کے مملوک حکمراں کو بھی شریک کر لیا گیا جس کے محاصل کی آمدنی پرتگالیوں کی تجارت کے باعث بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ۱۵۰۸ء میں جدے کے گورنر امیر حسین کی سرکردگی میں مصری بیڑہ اور پرتگالی بیڑے میں بحرِ ہند میں زبردست بحری جنگ ہوئی۔ گجرات کا بیڑا جوناگڑھ اور دانتو کے

فوجدار ملک عیاض کی سرکردگی میں مصری بیڑے کے ساتھ شریک تھا۔ اس بحری جنگ میں پرتگالی بیڑے کو سخت شکست کھانی پڑی اور المیدا کا بیٹا بھی اس میں مارا گیا۔

پرتگالی وائسرائے المیدا نے اس شکست کے بعد ایک سال تک خوب تیاری کی اور جس قدر پرتگالی جہاز موجود تھے انھیں مسلح کر کے وہ امیر حسین اور ملک عیاض کے بیڑے کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ڈیو کے قریب دونوں بیڑوں میں زبردست جنگ ہوئی جس میں پرتگالیوں کو کامیابی ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے جتنے قیدی گرفتار کیے انھیں قتل کرا دیا گیا۔ اس کامیابی نے پرتگالیوں کی بحری قوت کا سکہ مشرق میں بٹھا دیا۔ اور بحر ہند میں آئندہ تقریباً سو سال تک کوئی دوسری قوم ان کے مقابلے پر نہ آسکی۔

المیدا کے بحری مہم کے روانہ ہونے سے قبل ۱۵۰۸ء میں البوقرق کنانور پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ پرتگال نے اس کو المیدا کا جانشین مقرر کیا تھا۔ لیکن المیدا نے اس کو اس وقت تک اپنے عہدے کا جائزہ دینے سے انکار کیا جب تک کہ وہ اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام نہ لے لے۔ ڈیو کی بحری جنگ کے بعد اس نے کنانور واپس ہو کر البوقرق کو جائزہ دیا اور پرتگال واپس روانہ ہو گیا۔ راس امید میں اس کو کسی جھگڑے کے سلسلے میں ایک حبشی نے قتل کر دیا۔

البوقرق پرتگالی قوم کے ملک گیری کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس نے ۱۵۱۰ء میں یوسف عادل شاہ والئ بیجاپور کی فوج کو شکست دے کر گوا پر قبضہ کر لیا اور وہاں قلعہ بنا کر دیسی لوگوں کو قواعد پریڈ سکھا کر اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ اس کے عہد میں گوا کی تجارتی اہمیت اور آبادی بہت بڑھ گئی۔ چین اور ہندوستان کے درمیان گوا پرتگالیوں کا سب سے بڑا تجارتی اور فوجی مرکز بن گیا۔ ملاکا پر پرتگالی قبضہ ہو جانے سے مشرق بعید کی تجارت بھی عربوں

(1) Rise of the portuguese power in India, P115. 116;
Danvers-The Portuguese in India, P,129,130.

کے ہاتھ سے نکل گئی اور پرتگالی اس پر قابض ہو گئے۔ پرتگالیوں نے ملاکا۔ لنکا ساحلِ مالابار۔ ایران اور ہرمز میں اپنی قلعہ بند کوٹھیاں قائم کریں۔ ان مقامات سے پرتگالیوں نے پورے بحرِ ہند پر قابو حاصل کر لیا اور عرب تاجر بالکل بید خل کر دیے گئے۔ البو قرق نے پرتگالیوں کی نو آبادیاں قائم کرنے کی کوشش کی پرتگالیوں نے دیسی باشندوں کی عورتوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے جس طرح ان سے قبل عربوں نے کیے تھے تاکہ ان کی جڑیں مشرق میں مضبوط ہو جائیں۔ لیکن نو آبادیاں قائم کرنے کا یہ طریقہ انھیں راس نہ آیا۔ اور ان کی قومی سیرت بہت جلد بگڑ گئی۔

البو قرق بڑا متعصب شخص تھا۔ اس نے عیسائیت کی اشاعت تلوار کے زور سے کرنا چاہی اور اس ضمن میں دیسی لوگوں پر بڑے وحشیانہ ظلم ڈھائے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ البو قرق نے اہلِ ہند کی سیاسی کمزوری اور ان کی آپس کی عداوتوں کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ وہ ہندوستان میں چھے سال تک متواتر رہا اور اس عرصے میں وہ جنوبی ہند میں پرتگالی حکومت قائم کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے مقبوضات کے باشندوں کو جبری طور پر عیسائی بنانے کی کوشش کی تو اہلِ پرتگال کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور ان کی تجارت کو نقصان پہنچا۔ بہت جلد ان کے عہدہ دار راشی ہو گئے۔ پرتگالیوں نے ہندوستانی حکمرانوں اور اس ملک کی رعایا سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا رویّہ رعایا کے ساتھ اس قدر جارانہ تھا کہ عام طور پر اہلِ ہند چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان ان کے دشمن ہو گئے اور انھیں نفرت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پرتگالیوں کے بے رحم بادشاہ جان سوم نے حکم دے دیا تھا کہ پرتگالی مقبوضات میں جو لوگ بھی آباد ہیں انھیں عیسوی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے اور اگر کوئی عیسائی مذہب اختیار کرنے کے بعد پھر جائے تو اس کو زندہ جلا دیا جائے۔ سنہ ۱۵۶۰ عیسوی میں گوا میں محکمۂ احتساب قائم کیا گیا اور مذہب کے نام پر سخت مظالم کیے گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پرتگالی حکومت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی بنا ایسے غلط اصولوں پر

رکھی گئی تھی جو انسانیت کے خلاف تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مشرقی ملکوں میں جہاں جہاں بھی پرتگالیوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں وہاں انھیں کبھی بھی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اور جب ولندیزی اور انگریز ان کے مقابلے پر آئے تو ہر جگہ پرتگالیوں کو چھوڑ کر رعایا نے ان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر لیے۔ اس طرح پرتگالی تجارت کا خاتمہ ہو گیا اور ان کے ملک گیری کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔

گوا پر پرتگالی قبضہ ہو جانے سے دکن کی عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں کو پرتگالیوں کی طرف سے خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۵۶۹ء میں علی عادل شاہ اول، مرتضیٰ نظام شاہ اور کالی کٹ کے راجا نے مل کر گوا پر حملہ کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ گوا کو فتح کرنے کے بعد ساحل مالابار پر پرتگالیوں کی جتنی کوٹھیاں ہیں ان پر قبضہ کر لیا جائے۔ لیکن اس منصوبے میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ دس مہینے تک متحدہ افواج نے گوا کا محاصرہ جاری رکھا لیکن پرتگالیوں کی قلعہ بند فوج کو جو تعداد میں بہت ہی کم تھی زیر نہیں کیا جا سکا۔ اس کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ وہ جدید اسلحہ اور جنگ کے جدید سائنٹفک طریقوں سے واقف تھے۔ یہی ان کی قوت کا راز تھا۔ بالآخر عادل شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں نے پرتگالیوں سے صلحنامے کر لیے اور ان کے ساحلی مقبوضات کو تسلیم کر لیا۔

گجرات میں ڈیو، ڈامن اور بسین پر پرتگالیوں نے قلعہ بندی کر لی تھی۔ اکبر اعظم نے جب ۱۵۷۳ء میں حملہ کیا تو اس نے پرتگالی بندرگاہوں کو چھوڑ کر باقی کل ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس لیے کہ اکبر ان سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر سال ہزاروں ہندی مسلمان حج کی غرض سے جاتے ہیں۔ اگر پرتگالیوں سے بگاڑ ہو گیا تو وہ حاجیوں کے جہازوں کو لوٹیں گے اور انھیں گرفتار کریں گے۔ بحری تجارت سے مغل سلطنت کی جو آمدنی ہوتی تھی اس کے کم ہو جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ پرتگالیوں نے بھی بڑی دانشمندی سے کام لیا۔ گجرات کے حکمران نے اکبر اعظم کے خلاف جب پرتگالیوں کی مدد طلب کی تو انھوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا اس واسطے کہ وہ جانتے تھے کہ اکبر کی مخالفت مول لینا انھیں بڑی دشواریوں میں

پھنسا دے گا۔ جب اکبر سورت پہنچا تو پرتگالیوں نے اپنی سفارت اس کی خدمت میں روانہ کی اور بعد میں تین مرتبہ آگرہ ان کی سفارتیں گئیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطنت مغلیہ اور سلاطین دکن کے انتہائی عروج کے زمانے میں ہندوستان کے حکمرانوں نے بحری قوت کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ بحر عرب میں پرتگالی بیڑہ پوری طرح حاوی تھا۔ پرتگالیوں کے اجازت ناموں کے بغیر کوئی جہاز بحر عرب میں نہیں جا سکتا تھا۔ بحری قوت اور سائنٹفک علم کی طرف سے لاپروائی کا خمیازہ اہل ہند کو بعد میں بھگتنا پڑا۔ اسی سبب سے مٹھی بھر یورپینوں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بے بس خیال کرتے تھے جس کی بیسیوں مثالیں ہماری اس عہد کی تاریخ میں ملتی ہیں۔

ابو قرق کے بعد پرتگالیوں نے مدراس کے قریب سینٹ تھومے اور بنگال میں ہگلی پر اپنی کوٹھیاں قائم کیں۔ گوا کی طرح ڈیو کی بندرگاہ پر بھی انھوں نے زبردست قلعہ بندی کی تھی تاکہ اگر ترکی کے حکمراں کبھی ان کی تجارت میں رکاوٹ ڈالنا چاہیں تو وہ ان کا مقابلہ کر سکیں۔ ہگلی میں جب انھوں نے وہی طرز عمل اختیار کیا جو جنوبی ہند کے مقبوضات میں اختیار کیا تھا اور خود مختار حکومت کی شان ظاہر کرنی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے انھیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ ان کے جہازرانوں نے خلیج بنگال میں بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کر کے بعض دشوار گزار ساحلی مقامات میں اپنے اڈے بنا لیے جن کے سبب سے بنگال کے مغل صوبہ دار کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ان پر قابو حاصل کر لیا گیا۔ بنگال میں آئندہ پھر کبھی پرتگالیوں کی تجارت کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔

سولھویں صدی کے آخری زمانے میں یورپ میں بعض ایسے سیاسی واقعات پیش آئے جن کا اثر ہندوستان کی تاریخ پر بھی پڑا۔ ۱۵۸۱ء میں پرتگال کے سارے ملک پر اسپین کے حکمراں فلپ دوم نے قبضہ کر لیا۔ اگرچہ اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ مشرقی ملکوں سے پرتگالیوں کی جو تجارت تھی وہ پرتگالی جہازوں ہی کے ذریعے سے ہوا کرے گی اور پرتگالیوں کو مشرقی ملکوں میں حسب سابق

حقوق حاصل رہیں گے لیکن اس واقعے سے پرتگالی تجارت کو سخت نقصان پہنچا۔ یورپ کی وہ سب قومیں جو اسپین کی دشمن تھیں اب پرتگال کی بھی دشمن بن گئیں اس واسطے کہ وہ اب اسپین کا جزو بن گیا تھا۔ مشرقی ملکوں میں پرتگالی نوآبادیوں کو ان کی قومی حکومت سے جو امداد ملا کرتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ بعد میں اگرچہ تقریباً نصف صدی کے بعد پرتگال پھر اسپین سے علٰحدہ ہو گیا لیکن اس عرصے میں دوسرے یورپین حریف ایشیائی سمندروں میں پہنچ چکے تھے اور پرتگال کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی حیثیت مضبوط کر چکے تھے۔ ان حالات میں پرتگالی قوم کی حوصلہ مندی کو سخت ٹھیس لگی اور اس کی تجارت و قوت کو پہلا سا فروغ آئندہ کبھی نصیب نہ ہوا۔

۱۵۸۴ء میں اسپین اور انگلستان کے سیاسی تعلقات منقطع ہو گئے اس واسطے کہ ملکہ الزبتھ نے ہالینڈ کی بغاوت میں جو اسپین کی حکومت کے خلاف ہوئی تھی باغیوں کی کھلم کھلا امداد کی تھی۔ اس زمانے میں ہالینڈ اور انگلستان سیاسی لحاظ سے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور مذہبی اعتبار سے بھی چونکہ یہ دونوں ملک پروٹسٹنٹ تھے اس لیے دونوں اس کے درپے ہوئے کہ اپنے کیتھولک حریف اسپین کو یورپ کی سیاست میں نیچا دکھایا جائے۔ ہالینڈ اور انگلستان دونوں نے اسپین اور پرتگال کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جو پاپائے روم کے فرمان کی رو سے ان دونوں ملکوں کو اپنی تجارت کو ترقی دینے اور نوآبادیاں قائم کرنے کے ضمن میں حاصل ہوا تھا۔ سو سال تک پرتگال اور اسپین دنیا کے سمندروں پر حاوی رہے لیکن اب ہالینڈ اور انگلستان نے ان کے اس تفوق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان دونوں ملکوں نے سمندروں کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ حکومت اسپین کی ممانعت کے باوجود ڈریک نے سمندر کے راستے سے دنیا کا چکر لگایا۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے بیڑے (آرمیڈا) کی جو تباہی ہوئی اس سے اسپین کا رعب دلوں سے اٹھ گیا۔ اس واقعے کے تین برس بعد کپتان لنکاسٹر جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر راس کماری ہوتا ہوا ملایا پہنچا اور پرتگالی جہاز ران اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ اسپین اور پرتگال یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں میں اس بری طرح سے الجھے ہوئے

تھے کہ ان کے لیے ناممکن تھا کہ وہ مشرقی ملکوں کو اپنا بیڑا بھیج سکیں۔ پھر اسپین اور پرتگال کی مالی حالت بھی ویسی نہیں رہی تھی جیسی کہ کچھ عرصہ قبل تھی۔ اسپین کے جبر و استبداد سے تنگ آکر نیدرلینڈ (ہالینڈ) آزاد ہو چکا تھا۔ ہالینڈ والوں نے اپنے سابق ہسپانوی حکمرانوں کا بدلہ پرتگال کے مشرقی مقبوضات میں لینے کی کوشش کی۔ ان کے جہاز راں مشرقی سمندروں میں پہنچ چکے تھے اور آہستہ آہستہ پرتگالی تجارت پر تصرف حاصل کر رہے تھے۔ ہندوستان کی دولت اور مغل دربار کی شان و شوکت کی شہرت اس وقت یورپ کے ہر ملک میں پہنچ چکی تھی۔ اسپین اور پرتگال کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہالینڈ اور انگلستان کے تاجروں نے ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنے ملکوں کی دولت میں تجارت کے ذریعے اضافہ کیا جائے۔

ولندیزوں کی ہندوستان سے تجارت

ہالینڈ اسپین کے جوئے سے ابھی حال ہی میں آزاد ہوا تھا اس ملک کے باشندوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ مہم جوئی کے لیے بیتاب تھے۔ فن جہاز رانی کو اس ملک میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔ دراصل ولندیزیوں کی نوآبادیوں کا باعث ان کی خود مختاری کی وہ طویل جنگ تھی جو اسپین کے خلاف پیش آئی اور جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ جب پرتگال اور اس کی نوآبادیاں ۱۵۸۰ء میں اسپین میں ضم ہو گئیں تو ولندیزی لوگ پرتگالی نوآبادیوں کو اپنے قبضے میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ولندیزی تجارت اور ان کی نوآبادیوں کا مرکز مشرقی بحرِ ہند میں ہے جہاں کبھی پرتگالیوں کا طوطی بولتا تھا۔ ہالینڈ کے بعض اولوالعزم تاجروں نے ۱۵۹۲ء میں ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے تجارت کرنے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی کی طرف سے ہاؤٹ مان لسبن گیا تاکہ وہاں جا کر ہندوستان کے متعلق ضروری معلومات جمع کرے اور پتا چلائے کہ کن اشیا کی تجارت میں زیادہ فائدہ ہوگا۔ ہاؤٹ مان نے لسبن میں ضروری معلومات جمع کیں اور اس کے تین سال بعد وہ راس امید سے ہو کر جاوا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ عام طور پر پرتگالی تاجروں سے بیزاری کے آثار

پائے جاتے تھے۔ لوگ دوسرے یورپین تاجروں سے لین دین کرنے کو آمادہ تھے۔ ہاوٹ مان کا یہ سفر کامیاب رہا اور ہالینڈ والوں کے لیے مشرق کی تجارت کا دروازہ کھل گیا۔ ہالینڈ میں مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کے لیے متعدد کمپنیاں قائم ہوگئیں جن میں آپس میں رقابت رہنے لگی جس سے قومی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ حکومت کی دخل اندازی سے سنہ ۱۶۰۲ء میں ان سب کمپنیوں کو ملاکر ایک کمپنی بنادی گئی جس کو حکومت نے مشرقی ممالک سے تجارت کا اجارہ بذریعہ منشور دے دیا۔ سنہ ۱۶۰۶ء میں حکومت گولکنڈہ نے ولندیزوں (ڈچ) کو مسولی پٹم میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے کچھ عرصے بعد پتاپولی اور پلی کٹ میں ان کی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ یہ مقامات بھی گولکنڈے کے ماتحت تھے۔ حکومت گولکنڈہ سے یہ طے ہوا کہ ان بندرگاہوں میں درآمد و برآمد پر چار فی صدی محصول ولندیزی کمپنی ادا کیا کرے گی جنجی کے نائک نے دیونا پٹنم میں ولندیزوں کو کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ چونکہ ولندیزی کمپنی کی زیادہ تر تجارت جزائر شرق الہند سے تھی اس واسطے اس نے ہندوستان میں مالابار کے بجائے کارومنڈل کے ساحل پر اپنی کوٹھیاں قائم کیں تاکہ اپنے مرکز سے قریب رہیں۔ ولندیزی کمپنی کی شروع ہی سے ہالینڈ کی حکومت نے سرپرستی کی بلکہ اس کے نظم ونسق میں مداخلت بھی کی تاکہ مشرقی ملکوں کی تجارت سے پوری ولندیزی قوم نفع اندوزی کرسکے۔

ولندیزوں کی بحری قوت میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا وہ پرتگالیوں کی تجارت پر تصرف حاصل کرتے گئے اور ان کے تجارتی مرکزوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ کچھ عرصے میں انھوں نے جزائر شرق الہند (ایسٹ انڈیز) اور ملایا سے پرتگالیوں کو بالکل بے دخل کر دیا۔ اور جاوا میں بٹے ویا ان کا زبردست فوجی اور تجارتی مرکز بن گیا۔ ہندوستان میں ہگلی، چنسورہ اور مسولی پٹم کی کوٹھیوں میں ان کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ وہ ہندوستان سے نیل، چاول اور کپڑا جزائر شرق الہند کو لے جاتے تھے اور اس کے بدلے میں ہالینڈ کا بنا ہوا مال یہاں فروخت کرتے تھے۔ جزائر شرق الہند سے مسالے یورپ بھیجے جاتے

تھے۔ اسٹرڈم اور انٹ ورپ مشرقی تجارت کے زبردست مرکز بن گئے جہاں سے شمالی اور وسط یورپ کو سامان بھیجا جاتا تھا۔

پرتگالیوں کی طرح ولندیزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو قلعہ بند کر لیا تھا۔ ولندیزی کمپنی کو حکومت ہالینڈ نے دیسی حکمرانوں کے ساتھ جن سے ان کا واسطہ پڑے صلح اور جنگ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ مشرق بعید سے پرتگالیوں کو بالکل بے دخل کرنے کے بعد ولندیزی بیڑے نے ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کی ناکہ بندی شروع کر دی۔ سیلون اور مالابار میں پرتگالیوں کی جس قدر تجارت تھی وہ آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ میں آگئی۔ پرتگال کے جہازوں کی آمد و رفت مشرقی سمندروں میں بہت کم ہو گئی۔ اس واسطے کہ ولندیزی جہاز وہاں انھیں لوٹ لیتے اور غرق کر دیتے تھے۔ بالآخر جزائر شرق الہند کی طرح سیلون اور مالابار کے ساحل پر کنانور اور کوچین پر بھی ولندیزوں کا قبضہ ہو گیا اور گوا کی موثر ناکہ بندی کر دی گئی۔ لیکن ولندیزوں نے ساحل مالابار کی طرف کبھی بھی زیادہ کاروبار پھیلانے کی کوشش نہیں کی اس لیے کہ انھیں مسالے اور مرچ جزائر شرق الہند میں مالابار کے مقابلے میں زیادہ سستی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ مالابار میں انگریز اور ہندوستانی تاجروں سے انھیں مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جنوبی ہند کے حکمرانوں نے مسالوں اور مرچ کی تجارت کا ٹھیکا معاہدوں کے ذریعے ولندیزوں کو نہیں دیا جس طرح مشرق بعید میں انھیں مل گیا تھا۔ ان حالات میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر ولندیزی کمپنی نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

اس اثنا میں ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی مشرقی ملکوں کی تجارت سے خوب مالدار ہو چکی تھی اور اس کے پاس زبردست سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ کمپنی حکومت کے تحت آگئی تھی اور اس کے تقررات اور حکمت عملی کا تعلق براہ راست حکومت سے ہو گیا تھا۔ حکومت ہی اس کے حسابات کی تنقیح کرتی اور منافع تقسیم کرتی تھی۔ اس کو مشرقی حکمرانوں سے صلح اور جنگ کرنے، قلعے تعمیر کرانے، سکہ بنانے اور دوسری یورپین قوموں سے تجارتی مقابلے کے لیے تدابیر اختیار کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ ولندیزی لوگوں نے اسپین کے جوئے سے جو رہائی حاصل کی تھی

اور ان میں جو سیاسی اولو العزمی اور شعور پیدا ہوا تھا اس کا اظہار سب سے زیادہ تجارت کے میدان میں ہوا۔ ان کے سابق حکمران اسپین اور پرتگال کو جو تجارتی اجارے حاصل تھے انھیں توڑنے اور خود ان کی جگہ لینے کے لیے انھوں نے کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں ہالینڈ کی مرفہ الحالی اور قومی دولت میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ اور وہ یورپ کے سب سے زیادہ مالدار ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ ولندیزوں نے پرتگالیوں کی طرح مشرق میں مسیحی مذہب کی اشاعت کو اپنا مقصد کبھی نہیں بنایا بلکہ انھوں نے صرف تجارت اور معاشی نفع اندوزی تک اپنی مساعی کو محدود رکھا لیکن اپنے مقبوضات میں انھوں نے جو نظام حکومت نافذ کیا وہ جابرانہ تھا اور دیسی لوگوں کی ترقی کا اس میں مطلق خیال نہیں رکھا گیا تھا۔

ولندیزوں کی طرح انگریز بھی پرتگال کے مشرقی ملکوں کی اجارہ داری کے خلاف تھے۔ انھوں نے بھی پرتگال کی مشرقی تجارت پر کاری ضرب لگائی۔ ان کے مشہور جہاز راں ڈریک نے دنیا کا چکر لگایا اور انگریزی حکومت نے اعلان کر دیا کہ سمندروں پر کسی کی حکومت نہیں ہے۔ جو ملک چاہے آزادی سے جہاز رانی کر سکتا تھا۔ پوپ نے دنیا کو پرتگال اور اسپین کے درمیان جو تقسیم کیا تھا اسے ہالینڈ کی طرح انگلستان نے بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۵۸۸ء[1] میں اسپین کے بیڑے (ارمیڈا) کی تباہی سے انگریز جہاز رانوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور ان میں مہم جوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ اسپین اور پرتگال نے بحری مہم جوئی کی ابتدا کی تھی لیکن انگریز بھی فن جہاز رانی میں اپنے آپ کو یورپ کی کسی دوسری قوم سے ہیٹا نہیں سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں اسپین اور پرتگال کے جہاز راں نئے نئے سمندروں کا کھوج لگا رہے تھے، انگریز بھی اس دھن میں تھے کہ شمال مغربی راستے سے ایشیا پہنچیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے جہاز رانوں نے کیبٹ کی سرکردگی میں جزیرۂ نیو فاونڈ لینڈ دریافت کیا اور شمالی امریکہ میں

[1] Camden, History of Elizabeth, P.255. لے

اپنا حق نوآبادکاری قائم کر لیا۔ رالف فچ پہلا انگریز ہے جو ۱۵۹۱ء میں خشکی کے راستے سے ہندوستان آیا۔ اس نے انگلستان واپس جاکر پرتگالی تجارت کی وسعت اور ہندوستان کی دولت کے قصے اپنے ہم وطنوں کو سنائے۔ ۱۵۹۱ء میں کپتان لنکاسٹر راس امید ہوتا ہوا راس کماری پہنچا اور پھر وہاں سے نکوبار ہوتا ہوا ملایا چلا گیا۔ ان سمندری سفروں سے انگریزوں کو مشرقی ممالک کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ پرتگال کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر مشرق میں اپنی تجارت کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ انگریز تاجر مشرقی ممالک کی طرف اس لیے اور بھی متوجہ ہوئے کہ بحیرۂ روم میں جو ان کی تجارتی کمپنی کاروبار کر رہی تھی اس کو اسپین کی مخالفت کے باعث بہت نقصان ہو رہا تھا۔ اور آبنائے جبرالٹر انگریزی جہازوں کے لیے بند کر دی گئی تھی۔

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی

لندن کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں مشرقی ملکوں سے تجارت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور ملکۂ الزبتھ نے اس کمپنی کو منشور عطا کیا۔ اس کمپنی کا انتظام ایک گورنر اور چوبیس ارکان کے سپرد کیا گیا۔ جن کا انتخاب حصہ دار ہر سال کرتے تھے اس کمپنی کو بحر اٹلانٹک اور بحر ہند میں تجارت کا ٹھیکا حاصل ہو گیا۔ اس زمانے کی تجارت مسلح نوعیت کی تھی اور بغیر حکومت کی سرپرستی کے کسی قوم کے لیے ناممکن تھا کہ وہ دور دراز کے ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کرے۔ پھر انگریزوں کے سامنے ولندیزی کمپنی کی مثال موجود تھی جو اپنی حکومت کی سرپرستی کی بدولت خوب نفع حاصل کر رہی تھی۔ چنانچہ شروع ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت نے سرپرستی کی۔ لیکن ولندیزی کمپنی کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی بالکل حکومت کے تحت نہ تھی۔ انگریزی کمپنی کا سرمایہ بھی ولندیزی کمپنی کے مقابلے میں کم تھا۔ پھر ایک بڑی خرابی اس کے کاروبار میں یہ بھی کہ ہر بحری سفر کے لیے علیحدہ سرمایہ جمع کیا جاتا تھا۔ جس کے سبب سے کمپنی کے کاروبار کو عرصے تک استحکام نصیب نہ ہو سکا۔

انگریزی تاجروں نے دیکھا کہ جزائر شرق الہند میں وہ ولندیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو شروع ہی سے انھوں نے ہندوستان کے مغل حکمرانوں سے تجارتی مراعات حاصل کرنے کی فکر شروع کر دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے کپتان ہاکنس ۱۶۰۹ء میں جہانگیر کے دربار میں آیا اور ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت چاہی لیکن اس زمانے میں مغل دربار میں پرتگالیوں کا اچھا خاصہ اثر تھا۔ ان کی کوشش اور سازش سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ شہزادہ خرم پرتگالیوں کی تائید میں تھا۔ ۱۶۱۲ء میں ٹامس بسٹ انگریزی بیڑے کو لے کر بحر ہند میں پہنچ گیا تاکہ پرتگالیوں کو جنھوں نے مغل دربار میں انگریزوں کی مخالفت کی تھی اطمینان اور چین سے تجارت نہ کرنے دے۔ اس نے دریائے تاپتی کے دہانے کے قریب پرتگالی بیڑے کو شکست دی۔ اور مغل دربار پر واضح کر دیا کہ جس طرح پرتگالی بحری قوت رکھتے ہیں تو انگریز بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ ۱۶۱۳ء میں ٹامس الیڈورتھ کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوسری سفارت جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس دفعہ انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی جو اس زمانے میں مشرق کی نہایت بارونق بندرگاہ تھا۔ بعد میں اس کوٹھی کی شاخیں۔ برہان پور۔ احمد آباد۔ اجمیر اور آگرہ میں قائم ہوئیں۔ جو ہندوستان کے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ اب انگریزوں کے لیے ہندوستان کی تجارت کا دروازہ کھل گیا۔ ۱۶۱۵ء میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول نے سر ٹامس رو کو بہت سے تحائف دے کر بحیثیت سفیر ہندوستان بھیجا۔ جہانگیر سر ٹامس رو سے بڑے اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا اور اپنے خلوت کے جلسوں میں بھی اسے شرف باریابی بخشا۔ سر ٹامس رو سے بادشاہ نے جس اعزاز و اکرام کا سلوک کیا اس سے اہل دربار کی نظر میں انگریزی قوم کی وقعت بڑھ گئی اور وہ انھیں پرتگالیوں اور ولندیزوں کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے لیکن بہت دنوں تک انگریزوں کی تجارت ولندیزوں کی تجارت کے مقابلے میں کمزور تھی بقول ہنٹر "انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی ملکہ الزبتھ کی

بڑھاپے کی اولاد تھی جسے جیمس کی تلون مزاج حکمتِ عملی نے اور زیادہ نکما بنا دیا تھا۔ برخلاف اس کے ولندیزی کمپنی نے ایک نئی قوم کے جو کھم میں جنم لیا تھا۔ جبکہ وہ ہسپانوی جابروں سے نجات پانے کے لیے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا بھی تھی۔[1]

سر ٹامس رو نے سلطنت مغلیہ کی قوت کا صحیح اندازہ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل و عقد کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ تجارت میں سیاست کو نہ لائیں اور پرتگالیوں کے حالات سے عبرت حاصل کریں۔ اس نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ "پرتگال نے ہندوستان اور جزائر شرق الہند سے فائدہ نہیں اٹھایا اس واسطے کہ اس کو فوجی حفاظت کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود دولتمند علاقوں اور ملکوں پر تصرف رکھنے کے ملک پرتگال کنگال کا کنگال رہا۔ اس کی فوج جو حقیر سی ہے اس کی ساری آمدنی کو کھا جاتی ہے۔ ہمیں اس مثال سے سبق لینا چاہیئے۔ ولندیزوں نے بھی یہی غلطی کی کہ تلوار کے زور سے انھوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کیں جن میں غلاموں سے کاشت کرائی جاتی ہے ...... ہمیں یہ قاعدہ بنا لینا چاہیئے کہ ہم سوائے پُرامن بحری تجارت کے اور کسی ذریعے سے نفع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس میں کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ ہندوستان کی سرزمین پر فوجیں رکھنا اور جنگ بڑی بھاری غلطی ہوگی"۔[2] سر ٹامس رو کے اس مشورے پر بہت کافی عرصے تک کمپنی نے عمل کیا اور ہندوستان کی تجارت سے نفع کمایا لیکن بعد میں اورنگ زیب کے عہد میں کمپنی کی حکمت عملی بدلی جس کے سبب سے اس کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

شروع شروع میں پرتگالیوں کا مشرق میں زور توڑنے کے لیے ہالینڈ اور انگلستان میں اتحاد ہو گیا تھا۔ ان کے اتحاد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان

---

[1] Hunter, A History of British India, Vol.I, P, 351.

[2] The Embassy of Sir Thomas Roe, ed. by W. Foster (Hakluyt Society), Vol.II, P, 344.

دونوں ملکوں نے پوپ کے اقتدار سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا چنانچہ جب پرتگال کی قوت کمزور ہو گئی تو ان دونوں ملکوں میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ولندیزی بیڑے نے پرتگالی بیڑے کو شکست دے کر جزائر شرق الہند میں مسالے کی تجارت پر قبضہ کر لیا اور وہاں بڑے زبردست فوجی اور تجارتی مرکز قائم کر لیے۔ انگریزوں نے بھی پرتگالیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر جزائر شرق الہند میں اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہا لیکن ولندیزی تاجروں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ انگریزوں نے جب ولندیزوں کے مقابلے کی کوشش کی تو بڑی ناخوشگوار صورت حالات پیدا ہو گئی۔ اس واسطے کہ ولندیزی کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی یورپین قوت مشرق بعید میں ان کی مدِمقابل بنے۔ بڑی مشکل سے انگریز تاجروں کو جزائر شرق الہند کی ایک تہائی تجارت کی اجازت معاہدے کے ذریعے سے حاصل ہوئی لیکن باوجود انگریزوں کی تجارت محدود ہو جانے کے ولندیزوں اور انگریزوں میں تعلقات کی صفائی نہیں ہوئی۔ ولندیزوں کی دشمنی کا سبب سے مشہور واقعہ سنہ ۱۶۲۳ء کا "امبوئے نا" کا قتل ہے۔ یہ مقام ملایا میں ہے۔ ولندیزوں نے اٹھارہ انگریزوں کو ولندیزی حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا اور سرسری تحقیقات کے بعد انھیں قتل کرا دیا گیا۔ چند جاپانی ملاحوں کو سخت بیدردانہ اذیتیں دے کر اقبال کرایا گیا۔ اور ان انگریزوں کے جرم کی مصنوعی طور پر شہادت فراہم کی گئی۔ ولندیزوں کے گورنر کونن نے انگریزوں کی بنٹم (جاوا) کی کوٹھی کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ غرضکہ ان حالات میں انگریزوں نے مجبور ہو کر جزائر شرق الہند سے تجارت ختم کر دی اور آئندہ اپنی تمام تر توجہ ہندوستان کی تجارت کی طرف مبذول کر دی۔

انگلستان میں بادشاہ چارلس اور پارلیمنٹ کے درمیان جو جھگڑا شروع ہوا اس میں اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ وِھگوں کی جماعت کمپنی کو شاہ پرست خیال کرتی تھی اور خود بادشاہ اس سے ناخوش تھا۔ چنانچہ چارلس نے سنہ ۱۶۳۵ء میں منشور کے ذریعے نئی کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کمپنی کا سرغنہ

سر ولیم کورٹین تھا اسی لیے اس نئی کمپنی کو کورٹین ایسوسی ایشن بھی کہتے ہیں۔ اس نئی کمپنی نے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان میں جن مقامات پر پرانی کمپنی کی کوٹھیاں ہوں گی وہاں وہ اپنی شاخیں نہیں قائم کرے گی لیکن اس وعدے کی پابندی نہیں کی گئی۔ دونوں کمپنیوں کے درمیان ۱۶۵۷ء تک مقابلہ جاری رہا جبکہ کرامول نے دونوں کو ملا کر ایک کر کے مشترک سرمایے کے اصول پر اس کے کاروبار کی تنظیم کا حکم دے دیا اور کمپنی کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ عود شاہی کے بعد بھی کمپنی کے کاروبار کو خوب ترقی ہوئی۔ اس واسطے کہ اس کو کچھ عرصے کے لیے اپنے یورپین حریفوں کے مقابلے سے امن مل گیا اور اس کے سرمایے میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ بہت دنوں تک انگریزوں نے اپنے آپ کو ولندیزی حریفوں کے مقابلے میں بے بس محسوس کیا۔ لیکن بالآخر اسٹورٹ خاندان کے خاتمے پر کرامول برسر اقتدار ہوا تو اس نے حکومت ہالینڈ سے ۸۵ ہزار پونڈ کا ہرجانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو "امبوینا" کے قتل کے سلسلے میں دلوایا اور ساڑھے تین ہزار پونڈ مقتولوں کے وارثوں کو دلوائے۔ انگریزوں کو جزائر شرق الہند سے بے دخل کرنے کے بعد ولندیزوں نے وہاں جو نظام حکومت قائم کیا وہ جبر و استبداد پر مبنی تھا۔ پرتگالیوں کے وحشیانہ مظالم غیر مسیحوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے ہوتے تھے لیکن ہالینڈ کے مظالم کا محرک ان کا مادی مفاد تھا۔

اس زمانے میں جس طرح ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی اس طرح مشرق بعید میں کوئی منظم حکومت موجود نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولندیزوں نے جزائر شرق الہند میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور نفع اندوزی کی حکمت عملی کے تحت در و بست کے مالک بن گئے۔ انھوں نے تجارت کے ساتھ محاصل اور مالگزاری سے اپنی حیثیت کو خوب مستحکم کر لیا۔ ان کے مشہور گورنر کوئن نے ولندیزی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ پرتگالیوں کی طرح ولندیزوں نے افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں سے غلاموں کو خرید کر مشرق بعید کے مقبوضات میں آباد کیا اور زرعی استحصال کی دوسری تدابیر بھی اختیار کیں۔ ان کا خیال تھا کہ گرم ملکوں میں زراعت کے لیے یورپ کے سفید فام لوگوں کو لا کر آباد کرنا سخت غلطی

ہے اس لیے کہ وہ یہاں زیادہ محنت نہیں کر سکیں گے۔ ولندیزوں نے گرم مسالوں کی کاشت بھی وسیع پیمانے پر شروع کر دی اور گرم مسالوں کی تجارت تو پہلے سے انھیں کے ہاتھ میں تھی اس طرح ان کی نفع اندوزی دگنی ہو گئی۔

اب تک انگریزوں کو سلطنت مغلیہ کے حدود میں کہیں بھی اپنی کوٹھیوں کو قلعہ بند کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس زمانے میں جنوبی ہند میں اچھی خاصی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ وجیانگر کے زوال کے بعد یہاں کے مقامی رئیس خود مختار ہو گئے تھے۔ انگریزوں کو کارومنڈل ساحل پر سنہ ۱۶۳۲ء میں مسولی پٹم میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حکومت گولکنڈہ سے مل گئی۔ اس کوٹھی کے قیام سے ہندوستان کے مشرقی ساحل پر انگریز اپنے ولندیزی حریفوں کا خوب مقابلہ کر رہے تھے۔ مسولی پٹم (مچھلی پٹم) کی کونسل کے ایک رکن فرانسس ڈے نے ولندیزوں کی کوٹھی واقع پلی کٹ سے ۳۰ میل جنوب میں مقامی رئیس سری رنگا راے سے تھوڑی سی زمین چناپٹم (مدراس پٹم) کے گاؤں میں بطور معافی حاصل کر لی۔ انگریزوں نے یہاں قلعہ بندی کر لی جس کی اجازت انھیں مغلوں کے علاقے میں اب تک کہیں نہ ملی تھی۔ مدراس کے پاس سینٹ تھومے میں پرتگالیوں کی آبادی پہلے سے موجود تھی جن کے ساتھ انگریز تاجروں نے دوستانہ تعلقات قائم کیے اس واسطے کہ اب وہ ان کے مدمقابل نہ رہے تھے۔

فرانسس ڈے نے مدراس کی کوٹھی کمپنی کی مجلس نظما کی اجازت کے بغیر بہ امید منظوری قائم کر لی تھی۔ وہ ولندیزوں کو موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ یہاں بھی وہ پیش قدمی کر کے اپنا کارخانہ قائم کر لیں۔ کمپنی کی مجلس نظما نے سورت کی کونسل پر چھوڑ دیا کہ اگر وہ اپنے تجارتی اغراض کے لیے مناسب خیال کرے تو مدراس میں کوٹھی قائم کرنے میں روپیہ صرف کرے۔ مدراس کا جائے وقوع خلیج بنگال میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس واسطے سورت کونسل نے یہاں قلعہ بند

Talboy Wheeler, Madras in the olden times, compiled from the official Records, Vol,1.P,25. ۱ؕ

کوٹھی بنانے کی تائید کی جس کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا گیا کیونکہ اس کی تعمیر سینٹ جارجس ڈے پر ختم ہوئی۔ اس قلعہ بند مرکز سے انگریز ولندیزوں کا کارومنڈل کے ساحل پر مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ بہت جلد مدراس کی مرفہ الحالی میں اضافہ ہوا۔ چھپی ہوئی سوتی چھینٹ یہاں تیار ہوتی تھی جس کی انگلستان میں بہت مانگ تھی۔ سنہ ۱۶۵۲ء میں مدراس پٹنم کو علیحدہ پریسیڈنسی بنا دیا گیا اور سنہ ۱۶۵۹ء میں کارومنڈل ساحل اور بنگال کی سب کوٹھیاں اسی کے ماتحت کر دی گئیں۔ مدراس کے پاس جو زمین انگریزوں نے بطورِ معافی حاصل کی تھی وہ ہندوستان کی سرزمین پر ان کی پہلی ملکیت تھی۔ انھوں نے سنہ ۱۶۴۵ء میں گولکنڈے کے حکمران سے اس معافی کی باضابطہ توثیق حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے گولکنڈے میں اپنا ایک مستقل ایجنٹ رکھنا شروع کر دیا تاکہ وہ ان کے حقوق و مفاد کی نگرانی کر سکے۔ والیٔ گولکنڈہ نے بھی انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت میں خود اپنا سرمایہ بھی لگانے کی خواہش ظاہر کی جسے کمپنی کے ارباب کار نے بڑی ہوشمندی سے ٹال دیا۔[لہ]

شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولندیزی کمپنی سے مل کر ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگالی تجارت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انگریزوں اور ولندیزوں کے جہاز مل کر بحرِ ہند میں پرتگالی تجارتی جہازوں کو لوٹا کرتے تھے لیکن جب پرتگال کی تجارت کو زوال آیا اور ولندیزی لوگ مشرقی ملکوں کی تجارت کو اپنے تصرف میں لانے کے درپے ہوئے تو مجبوراً انگریزوں نے پرتگالیوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگال کی رہی سہی حکومت کے ساتھ انھوں نے اتحاد کر لیا۔ پرتگالیوں نے انگریزوں کو گوا میں رہ کر تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ سنہ ۱۶۶۱ء میں انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی کیتھرائن برگنزا کے ساتھ ہوئی۔

لہ Madras Gov[illegible]ment Manual of Administration, 1,P, 162; Bruce's Annals ,1, P,415

تو بمبئی کا جزیرہ جو حکومت پرتگال کے تحت تھا جہیز میں چارلس دوم کو دیا گیا۔ اس نے اس جزیرے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک سو پچاس روپے سالانہ کے معاوضے میں دوامی ٹھیکے پر دے دیا۔ انگریز تاجروں نے یہاں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کرلی اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے ڈر سے اس کو قلعہ بند کرلیا۔ بمبئی کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے انگریزوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر تجارتی اغراض کے لیے بڑی سہولتیں حاصل کرلیں اور وہ گوا اور سورت دونوں سے بے نیاز ہوگئے۔ سنہ ۱۶۸۷ء میں بجائے سورت کے بمبئی مغربی ساحل کی پریسیڈنسی کا مرکز بنادیا گیا۔ اس وقت جبکہ نہر سوئز موجود نہیں تھی دور اندیش انگریزوں نے محسوس کیا کہ بمبئی کی جغرافی حیثیت ایسی ہے کہ بہت جلد وہ انگلستان اور ہندوستان کی تجارت کا مرکز بن جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ باوجود ولندیزوں اور مرہٹوں کے حملوں کے بمبئی کی روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ سورت کے پریسیڈنٹ سر جارج آکسن ڈن اور اس کے جانشین جیرالڈ آن جیر نے تاجر لوگوں کو خاص رعایتیں دیں تاکہ وہ بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کریں۔ اس کی آبادی بیس ہزار سے بڑھ کر جو پرتگالیوں کے زمانے میں تھی بارہ سال میں ساٹھ ہزار ہوگئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں اپنی پہلی کوٹھی سنہ ۱۶۳۳ء میں بالاسور میں قائم کی تھی۔ بعد میں سنہ ۱۶۵۱ء میں ہگلی میں دوسری کوٹھی قائم کرنے کی انھیں اجازت مل گئی۔ ان کوٹھیوں کے تحت قاسم بازار اور پٹنے میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تجارتی اغراض کے لیے قائم کرلی گئیں۔ سنہ ۱۶۵۰ء میں سورت سے ایک انگریزی ڈاکٹر جس کا نام گیبرئیل باؤٹن تھا شاہجہاں کی لڑکی جہاں آراء کے علاج کے لیے آگرے بلایا گیا۔ اس نے اپنی قابلیت سے علاج میں کامیابی حاصل کی اور اپنے اثر اور رسوخ سے بادشاہ سے فرمان حاصل کرلیا کہ کمپنی کے مال پر بنگال میں شاہی محصول معاف کردیا جائے۔ اس کی یہ درخواست منظور ہوئی اور شاہی فرمان جاری کردیا گیا کہ کمپنی کو محصول سے مستثنیٰ کردیا جائے۔ اس وقت بنگال میں شہزادہ شاہ شجاع صوبہ دار تھا۔ ڈاکٹر باؤٹن جب شاہی فرمان بنگال لے گیا تو شاہ شجاع سے مل کر اس کا فوراً نفاذ کرادیا بشرطیکہ کمپنی پیشکش کے طور پر تین ہزار

روپے سالانہ بنگال کے صوبہ دار کو ادا کیا کرے۔ اس زمانے میں کمپنی ریشم شکر اور شورے کی تجارت وسیع پیمانے پر کرتی تھی۔ شورے کی خاص طور پر انگلستان میں بہت مانگ تھی۔ اس واسطے کہ وہ بارود بنانے میں کام آتا تھا۔ کمپنی سالانہ تین ہزار روپے یکمشت شاہ شجاع کو ادا کرنے لگی۔ اس رقم کے علاوہ اس کو کوئی محصول نہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔

اورنگ زیب کے برسر اقتدار ہونے کے بعد پہلے میر جملہ اور پھر شائستہ خاں بنگال کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ان دونوں نے انگریزی کمپنی کے مال پر قیمت کے لحاظ سے محصول عاید کر دیے۔ شائستہ خاں نے اس فرمان کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا جو کمپنی نے شاہجہاں سے حاصل کیا تھا اور کہا کہ اس کا نفاذ ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ بنگال میں جن اشیا کی تجارت کمپنی کرتی تھی ان کی مانگ بڑھتی گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہگلی کی کوٹھی کی اہمیت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ۱۶۸۱ء میں کمپنی کی مجلس نظما کے حکم سے ہگلی میں ایک گورنر مقرر ہوا اور بنگال کی کوٹھیوں کو مدراس کی ماتحتی سے نکال کر ان کی جدید تنظیم عمل میں لائی گئی۔ لیکن جب کمپنی نے قلعہ بندی کرنے کی کوشش کی تو شائستہ خاں نے مخالفت کی اور اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ محصولوں کی بابت بھی کمپنی کے حکام اور صوبہ دار میں اختلاف بڑھتا گیا۔ اب تک کمپنی نے ہندوستان میں سر ٹامس رو کے مقرر کیے ہوئے اصول پر عمل کیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے سلطنت مغلیہ سے بگاڑ نہ کیا جائے بلکہ دوستانہ تعلقات اور موافقت سے کام نکالنے کی کوشش کی جائے۔ اس زمانے میں سر جوشیا چائلڈ کمپنی کی مجلس نظما کا صدر تھا۔ وہ ہندوستان میں قلعہ بند تجارت اور ملک گیری کی حکمت عملی کا حامی تھا اور چاہتا تھا کہ کمپنی اتنی قوت حاصل کرے کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ مغلیہ سلطنت کا بھی مقابلہ کر سکے۔ ۱۶۸۴ء کے بعد سے مجلس نظما کی خط و کتابت میں بار بار اس کا ذکر ملتا ہے کہ تجارتی نفع کے ساتھ کمپنی کے کارکنوں کو چاہیے کہ گرد و نواح کے علاقوں پر تصرف حاصل کر کے مالگزاری اور محاصل سے اپنی آمدنی میں اضافہ کریں تاکہ بڑھتے ہوئے اخراجات کی پابجائی ہو سکے۔

سر جوشیا چائلڈ کے منشا کے مطابق مدراس میں محاصل کی آمدنی بڑھانے کے لیے ایک بلدیہ قائم کیا گیا۔ مجلس نظما نے مدراس کونسل کو اس ضمن میں جو ہدایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "نظمائے کمپنی خاص طور پر مدراس کونسل سے توقع رکھتے ہیں کہ سول اور فوجی قوت کی ایسی ہئیت سیاسیہ وجود میں لانی چاہیے اور محاصل و مالگزاری کی آمدنی کو اس قدر بڑھالینا چاہیے کہ آئندہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں انگریزی قلمرو (ڈومینین) کی مضبوط بنیادیں قائم ہو جائیں[1]۔"

سر جوشیا چائلڈ اور اس کے ہم خیال ارکان مجلس نظما چاہتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی کوٹھیوں کی تنظیم انھیں اصول پر عمل میں لائی جائے جن اصول پر ولندیزوں نے جزائر شرق الہند میں اپنی کوٹھیاں قائم کی تھیں جو بعد میں ان کے مقبوضات کے مرکز بن گئیں۔ چنانچہ اس زمانے میں مجلس نظما کی خط و کتابت دیکھنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کمپنی کے ارباب کار کو بار بار ولندیزی نمونے کی تقلید کی دعوت دی گئی۔ ۱۶۸۹ء میں مجلس نظما نے بمبئی کی کونسل کو اس جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی:۔

"ہمیں جس قدر فکر اپنی تجارت کو ترقی دینے کی ہے اسی قدر اس کی بھی فکر ہے کہ ہمارے محاصل کی آمدنی (ریونیوز) میں اضافہ ہو۔ ہماری طرح اس کی فکر آپ لوگوں کو بھی ہونی چاہیے اس طور پر ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ ہندوستان میں اپنی قوت کو برقرار رکھ سکیں۔ چاہے ہماری تجارت بیسیوں قسم کے حوادث کا شکار ہی کیوں نہ ہوتی رہے۔ اس طرح ہم ہندوستان میں ایک قوم بن سکیں گے۔ بغیر اس کے ہماری حیثیت اس ملک میں خواہ مخواہ کی مداخلت کرنے والوں سے زیادہ نہ ہوگی جنھیں ہز مجسٹی کے منشور شاہی نے ایک جگہ جمع کر دیا ہو اور ہم صرف اس وقت وہاں تجارت کر سکیں جب تک دوسری قوت کی مرضی ہو۔ انھیں حالات کے سبب سے دانشمند ولندیزوں کے یہاں آپ یہ دیکھیں گے کہ جہاں

[1] Letters to Fort St. George; dated 12 December; 1687. (India office Records).

دس پیراگراف حکومت، سول اور فوجی حکمت عملی، جنگ اور محاصل و آمدنی میں اضافے کی تدابیر کے متعلق ہوتے ہیں تو صرف ایک پیراگراف تجارت کے متعلق ملتا ہے۔ واضح رہے کہ محاصل و آمدنی میں اضافہ اصل مقصد ہے جس پر تمام دوسرے امور کا انحصار ہے۔ ان محاصل کے بغیر ولندیزی قوت باوجود مسالے کے جزیروں اور جاپان پر تصرف رکھنے اور مرچ کی پوری تجارت اپنے قابو میں کر لینے کے معرض خطر میں پڑ جاتی ہے"[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دروبست میں سر جوشیا چائلڈ کا بے حد اثر تھا۔ اس سے پہلے مجلس نظما کا کوئی اور صدر اتنا بااثر نہیں ہوا تھا۔ حکومت میں بھی اس کو رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ کمپنی کی نئی استعماری حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت انگلستان سے مدد لی گئی۔ جیمس دوم کمپنی کا حصہ دار ہونے کی حیثیت سے اس کے معاملات میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ نظمائے کمپنی نے بالآخر یہ ٹھان لی کہ سلطنت مغلیہ سے قوت آزمائی کرنی چاہیے۔ شائستہ خاں نے بنگال کے محصولوں کے معاملے میں جو سختی برتی تھی اور کمپنی کے مال کو ملکی محاصل سے مستثنیٰ کرنے سے جو انکار کیا تھا اس سے کمپنی کے منافع پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ پھر مغربی ساحل پر جنجیرہ کے سدی نے جو مغل حکومت کا عہدہ دار تھا مرہٹوں کے خلاف کئی سال جنگ جاری رکھی جس سے انگریزی تجارت بری طرح متاثر ہوئی، اس واسطے کہ بمبئی کے بالکل ہی قریب اس نے اپنے بحری مرکز بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں کپتان نکلسن کی سرکردگی میں دس مسلح جنگی جہازوں کا بیڑا انگلستان سے روانہ کیا گیا جن میں سے بعض پر دس اور بعض پر ستر توپیں تھیں اور

[1] Dispatch of the Court of Directors to our Generall of India and our President and Council of India residing at Bombay, dated 11 September 1689, (India office Records) Quoted by Hunter in "A History of British India", Vol, 11, P.274.

۶۰۰ انگریزی سپاہ ساتھ تھی۔ مدراس میں ۴۰۰ سپاہ اور شامل ہونے والی تھی۔ کپتان نکلسن کو حکم دیا گیا تھا کہ چاٹگانگ کے بندرگاہ پر قبضہ کر لو تاکہ وہاں سے انگریزی جہاز خلیج بنگال کے شمال مشرقی ساحل کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیں مغل سلطنت کے خلاف اعلان جنگ کر کے بحری آمد و رفت کو بالکل بند کر دیا جائے تاکہ بنگال کے محاصل متاثر ہوں۔ چاٹگانگ کو مرکز بنا کر انگریزی فوجیں خشکی کے راستے سے آگے بڑھ کر ڈھاکے پر قبضہ کر لیں۔ اور صوبہ دار کو مجبور کیا جائے کہ وہ انگریزوں کے شرائط کو تسلیم کرے[1] ۱۶۸۶ء میں جب کپتان نکلسن ہگلی پہنچا تاکہ وہاں سے کمپنی کے ملازموں کو اپنے ساتھ چاٹگانگ لے جائے تو صوبہ دار بنگال نے پہلے ہی سے ہگلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے انگریزی جہاز ۲۷ میل جنوب میں سوتانتی کے گاؤں میں لنگر انداز ہوئے جہاں موجودہ کلکتہ آباد ہے پھر یہاں سے شارناک جو ہگلی کی کوٹھی کا صدر تھا مع اپنے ساتھیوں کے ۷۰ میل جنوب میں ہجلی کے مقام پر پناہ گزیں ہوا۔ یہاں سخت ملیریا تھا کمپنی کے ملازموں میں سے ۲۰۰ ملیریا کے نذر ہو گئے اور چالیس عہدہ داروں میں سے صرف پانچ بچے۔ اس پر مصیبت یہ کہ صوبہ دار کی فوج پیچھا کرتی ہوئی ہجلی پہنچ گئی۔ مجبوراً شارناک اور اس کے ساتھیوں نے سمندر کی راہ سے فرار ہو کر مدراس میں پناہ لی۔ دوسرے سال کپتان نکلسن کی مہم کی ناکامی کے بعد کپتان ہیڈ کو کمک دے کر انگلستان سے روانہ کیا گیا تاکہ چاٹگانگ میں انگریزی مرکز قائم کرے لیکن یہ مہم بھی ناکام رہی۔ کپتان ہیڈ نے جب بنگال میں کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھی تو ۱۶۸۹ء میں مدراس چلا آیا اور بنگال سے ایسٹ انڈیا کمپنی ہاتھ دھو بیٹھی۔ شاہی حکم کے بموجب انگریزوں کی دوسری کوٹھیاں جو پٹنہ۔ قاسم بازار مسولی پٹم اور ویزاگاپٹم میں واقع تھیں ضبط کر لی گئیں اور کمپنی کے ملازم گرفتار کر لیے گئے۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر سورت کی کوٹھی ضبط کر لی گئی جنجیرہ کے

---

[1] Bruce's Annals, II; P.561; Hedge's Diary: II ,P.[illegible]
ed. by Sir Henry Yule.

سدی نے بمبئی کے ارد گرد کے انگریزی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور سورت کے گورنر سر جان چائلڈ[1] کو بمبئی کے قلعے میں محصور کر دیا۔ بمبئی میں انگریزی جہازوں کی آمدورفت بند ہو گئی اور انگریزوں کی مغربی ساحل کی تجارت کا خاتمہ ہو گیا۔ سر جان چائلڈ نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی درخواست کی۔ اس زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر دکن کی مہم میں مشغول تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نے ہگلی کے واقعے کو اتنی اہمیت نہیں دی ہوگی جتنی کہ انگریز مورخ دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بنگال کے اس نامعلوم اور غیر مشہور مقام کا نقشہ صوبہ دار بنگال سے طلب کیا تاکہ اس کی جغرافی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے[2]۔ بالآخر سر جان چائلڈ نے ۱۶۹۰ء میں سورت کونسل کے دو ارکان ولڈن اور نووازو کو بطور وکیل اورنگ زیب کی خدمت میں روانہ کیا جنھوں نے انتہائی عجز و ندامت کے ساتھ کمپنی کی جانب سے معذرت پیش کی اور ایک لاکھ پچاس ہزار روپے جرمانہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر کمپنی کا قصور معاف کر دیا گیا اور اس کو سلطنت مغلیہ میں تجارت کی اجازت دے دی گئی بشرطیکہ وہ متعلقہ صوبہ داروں کی اطاعت کرے اور ملکی محاصل کو باضابطہ ادا کیا کرے۔ اس اجازت نامے کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ بمبئی کا گورنر سر جان چائلڈ کمپنی کی ملازمت سے برطرف کر دیا جائے اس واسطے کہ اس کے حکم سے حاجیوں کے جہازوں کو نقصان پہنچایا گیا تھا اور "آئندہ ایسے شرمناک طرز عمل سے احتراز کیا جائے[3]" لیکن اسی اثناء میں سر جان چائلڈ کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے اجازت نامہ کی اس شرط پر عمل کی نوبت نہ آئی۔ اس اجازت نامہ کی ایک نقل صوبہ دار بنگال کو روانہ کر دی گئی اور انگریزوں کی کوٹھیاں انھیں

---

[1] سر جان چائلڈ اور سر جوشیا چائلڈ علحدہ علحدہ اشخاص ہیں۔ نام کی مشابہت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دونوں قرابت دار ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔

[2] Hedge's Diary; II P.63,64.

[3] Bruce's Annals; II; P. 639; 640.

واپس کردی گئیں۔ چارناک ہگلی کی کوٹھی پر واپس آیا۔ اس اثنا میں شایستہ خاں کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ابراہیم خاں بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوا جو امن پسند شخص تھا۔ بہت بوڑھا ہونے کے سبب سے اس میں قوتِ عمل موجود نہ تھی۔ وہ ہر چیز کو چاہتا تھا کہ جیسی چل رہی ہے ویسی ہی چلتی رہے۔ اس نے انگریزی کمپنی سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور اس کے کاروبار میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔

کمپنی اور سلطنتِ مغلیہ میں صلح ہو جانے کے بعد چارناک مدراس سے ہگلی واپس آ گیا۔ سنہ ۱۶۹۰ء میں مدراس سے واپسی پر اس نے سوتانتی کے گاؤں میں جہاں اب کلکتہ آباد ہے ابراہیم خاں صوبہ دار بنگال سے ایک کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ پانچ سال بعد اس کوٹھی کے ارد گرد چار دیواری کی اجازت بھی مل گئی اور اس کا نام فورٹ سینٹ ولیم رکھا گیا۔ چند سال ہی میں فورٹ ولیم کی تجارتی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ بنگال اور بہار کے زرخیز علاقوں کی تجارت سے کمپنی خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ چنانچہ اس کی اہمیت کے مدنظر سنہ ۱۷۰۰ء میں فورٹ ولیم کو مدراس کی ماتحتی سے نکال کر علٰحدہ پریسیڈنسی قائم کر دی گئی۔ سنہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات پر ملک میں جو عام ابتری اور بدامنی پھیلی اس سے فائدہ اٹھا کر فورٹ ولیم کے استحکامات میں مزید اضافہ کر لیا گیا۔[1]

اب ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات کی حیثیت ایسی ہو گئی تھی کہ بجائے مقامی حکومتوں کے کمپنی دہلی کی مرکزی حکومت سے تعلقات قائم کرنا چاہتی تھی۔ مدراس کے گورنر پٹ کو یہ خیال ہوا تھا کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جانشینی کے جھگڑے کے سلسلے میں جب بہادر شاہ اول دکن آیا تھا تو اس کی خدمت میں اپنا ایلچی روانہ کرے لیکن چونکہ وہ فوراً ہی شمالی ہند واپس چلا گیا۔ اس لیے اس خیال کو حکومت مدراس عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ لیکن کمپنی نے سنہ ۱۷۱۵ء میں

[1] Wilson's Early Annals of the English in Bengal, Vol. I. P. 282.

مختلف پریسیڈنسیوں کے استصواب کے بعد جان سرمن کی سرکردگی میں فرخ سیر کی
خدمت میں دہلی سفارت روانہ کی۔ بادشاہ کے لیے جو تحفے بھیجے گئے ان کی قیمت
۳۰ ہزار پونڈ بتائی جاتی ہے۔ سرمن کے ساتھ ولیم ہملٹن[1] بھی تھا جو بہت اچھا ڈاکٹر تھا
اس نے فرخ سیر کا علاج کیا جس سے اس کو بہت فائدہ ہوا۔ بادشاہ نے
خوش ہو کر کمپنی کو تین فرامین عطا کیے۔ ایک صوبہ دار دکن کے نام، دوسرا
صوبہ دار گجرات کے نام اور تیسرا صوبہ دار بنگال کے نام۔ جنوبی ہند میں انگریزوں کو
جو تجارتی مراعات حاصل تھیں ان کی توثیق کی گئی اور کمپنی کے مال کو محصولوں سے
مستثنیٰ کر دیا گیا سوائے اس پٹے کے لگان کے جو کمپنی مدراس اور اس پاس کے
علاقوں کا ادا کیا کرتی تھی۔ مدراس کے قریب اور چند گاؤں بھی کمپنی کو پٹے پر
لینے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح وزیگاپٹم کے قریب کی زمین خریدنے کی کمپنی کو
اجازت دے دی گئی۔ گجرات میں کمپنی کو مال کی قیمت پر دو فی صدی چنگی کے
علاوہ دس ہزار روپے سالانہ سرکاری خزانے کو ادا کرنے پر دوسرے
محصولات سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ بمبئی میں کمپنی جو سکے ڈھالتی تھی انھیں سلطنتِ مغلیہ
میں چلانے کی اجازت دے دی گئی۔ بنگال میں شاہ شجاع کی صوبہ داری میں
تین ہزار روپے سالانہ کی رقم کا جو تعین کیا گیا تھا اس کو برقرار رکھا گیا۔ اس
رقم کو ادا کر کے کمپنی اور دوسرے تمام محصولوں سے مستثنیٰ تصور کی جائے گی۔
فورٹ ولیم کے آس پاس کی زمینوں کو پٹے پر لینے کا کمپنی کو حق حاصل ہو گیا
جہاں کمپنی اپنی بستیاں بسا سکتی تھی۔ سرمن کی سفارت کو کمپنی کی تاریخ میں خاص
اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ شاہی فرامین کی بدولت کمپنی کی قانونی حیثیت
اور اس کے حقوق و مراعات کا باضابطہ استقرار عمل میں آیا۔

بنگال کے صوبہ دار نواب مرشد قلی خاں (جعفر خاں) نے باوجود بادشاہ
فرخ سیر کے فرمان کے فورٹ ولیم کے قریب کے اڑتیس گاؤں کمپنی کو

۱۔ C. R. Wilson's Early Annals of The English in Bengal, II, p. I lvii

بیٹے پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن کمپنی نے دوسرے لوگوں کو بیچ میں ڈال کر جیلے حوالے سے یہ زمینیں حاصل کر لیں۔ لیکن یہ زمینیں باقاعدہ ۱۷۵۷ء میں کمپنی کی ملکیت میں آئیں جبکہ کلائیو نے ان کے متعلق سراج الدولہ سے معاہدہ کیا۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم (کلکتہ) نے بیحد ترقی کی۔ پچاس سال کے عرصے میں اس کی آبادی پندرہ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ہوگئی تھی۔ بنگال۔ بہار اور اڑیسہ پر آئے دن مرہٹوں کے حملوں سے جو اندرونی خلفشار پیدا ہوا اس کی وجہ سے بہت سے لوگ فورٹ ولیم میں آکر آباد ہو گئے کہ یہ مقابلۃً محفوظ جگہ تھی۔ پھر تجارت کی گرم بازاری سے یہاں دولت اُبل پڑی ۱۷۴۲ء میں جب علی وردی خاں بنگال کا نواب ہوا تو اس نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کی کوشش کی اور انھیں ہر قسم کی مراعات عطا کیں۔ مرہٹوں کے حملوں کے باعث نواب نے انگریزوں کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو فورٹ ولیم کے گرد خندق کھودلیں جسے "مرہٹہ ڈیچ" (مرہٹوں کی خندق) کہتے ہیں۔

سترھویں صدی کے آخر میں کمپنی کو عود شاہی (رسٹوریشن) کے بعد اپنے ہندوستانی مقبوضات میں فوج رکھنے، عدالت کا انتظام کرنے، قلعے بنانے اور سکے ڈھالنے کے حقوق حاصل ہو گئے تھے۔ انگلستان کے بادشاہوں نے خاص کر چارلس دوم اور جیمس دوم نے کمپنی کی بڑی فراخ دلی سے مدد کی۔ ولندیزوں کے مقابلے کے لیے جب کبھی کمپنی کو شاہی فوج یا بیڑے کی ضرورت ہوئی تو اعانت سے دریغ نہیں کیا گیا۔ لیکن سر جوشیا چائلڈ کی جارحانہ حکمتِ عملی کے باعث کمپنی کو سلطنتِ مغلیہ سے جو لڑائی مول لینی پڑی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی مالی حالت خراب ہو گئی اور انگلستان میں پہلے سے جو اس کے مخالف موجود تھے انھیں اس کی مخالفت کرنے کا اور موقع مل گیا۔ انگریز سرمایہ داروں کی ایک جماعت جو کمپنی کی نفع اندوزی سے خود محروم تھی چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے کاروبار سے فائدہ حاصل کر سکے۔ پھر خود سر جوشیا چائلڈ صدر مجلس نظما کا رویّہ ایسا مطلق العنانہ تھا جس کی وجہ سے بھی کمپنی کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔

خاص گروہوں کا آزاد خیال طبقہ کمپنی کے تجارتی اجارے کا سخت مخالف تھا اور اس کے مخصوص حقوق کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ہنو ور خاندان کے برسراقتدار ہونے پر وھگوں کا زور انگلستان کی سیاست میں بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ ۱۶۹۱ء میں پارلیمنٹ نے مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کے لیے ایک نئی کمپنی قائم کرنے کی اجازت دے دی جس کے زیادہ تر سرپرست وھگ پارٹی کے ارکان تھے۔ لیکن سر جوشیا چائلڈ نے باوجود نئی کمپنی کے قائم ہو جانے کے پرانی کمپنی کے لیے براہِ راست بادشاہ سے منشور حاصل کر لیا۔ اس پر پارلیمنٹ میں بادشاہ کے اس حق پر اعتراض کیا گیا کہ بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے کوئی اجارہ نہیں قائم کیا جا سکتا ۱۶۹۴ء میں پارلیمنٹ نے صاف صاف ہدایت کر دی کہ انگلستان کے سب باشندوں کو مساوی طور پر ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کا حق حاصل ہے جب تک کہ پارلیمنٹ میں منظور شدہ قانون کے ذریعے اس کی ممانعت نہ کر دی گئی ہو۔[1] نئی کمپنی کا نام اسکاٹش ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا لیکن پرانی کمپنی کے سرمایہ داروں نے یہ بڑی ہوشیاری کی کہ نئی کمپنی کا سرمایہ جب جمع ہونے لگا تو اس کے ایک چوتھائی حصے خود خرید لیے۔ غرضکہ دونوں کمپنیوں کا ہندوستان سے کاروبار ہونے لگا اور مقابلے میں دونوں ہی کا نقصان ہوا دونوں کے ملازموں میں ہندوستان میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ اگر دلندیزی تجارت اس وقت ہندوستان میں کمزور نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً انگریزوں کو بڑا زبردست نقصان اٹھانا پڑتا۔ بالآخر ۱۷۰۲ء میں پارلیمنٹ میں ایک مسودۂ قانون منظور ہوا جس کی رو سے دونوں کمپنیاں ضم کر دی گئیں اور متحدہ کمپنی کا نام یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا۔ دونوں کمپنیوں کے اتحاد سے انگریزی تجارت ہندوستان میں سنبھل گئی اور سلطنت مغلیہ سے جنگ اور دونوں کمپنیوں کے آپس کے اختلافات کے باعث جو تجارتی پستی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سر جوشیا چائلڈ کی ملک گیری کی حکمتِ عملی میں انگریزوں کو

---

[1] The Cambridge History of India Vol. V. p. 97

جو ناکامی ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ کچھ عرصہ کے لیے کمپنی نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے قطعاً احتراز کیا جب تک کہ اس کے نئے حریف فرانسیسیوں نے اس کو ایسا کرنے پر مجبور نہ کر دیا۔

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی

ہندوستان سے تجارت کرنے کی جانب بہ مقابلہ دوسری یورپین اقوام کے فرانسیسی بہت بعد میں متوجہ ہوئے۔ ان کے تاجروں کو ولندیزوں اور انگریزوں کی دولت پر جو انھوں نے مشرقی ملکوں سے تجارت کر کے حاصل کی تھی رشک آتا تھا۔ لیکن وہ مشرقی ملکوں سے تجارت کرنے کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوئے جب تک کہ ان کے بادشاہ لوئی چہاردہم اور اس کے وزیر کولبیر نے ذاتی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کولبیر کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اس کی مجلس نظما کیس ارکان پر مشتمل تھی جس میں بارہ ۱۲ پیرس کے سرمایہ داروں میں سے تھے اور نو صوبجاتی مرکزوں کی طرف سے۔ اس کمپنی کو ہندوستان اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کا پچاس سال کا ٹھیکا حکومت فرانس نے عطا کیا۔ لوئی چہاردہم نے وعدہ کیا کہ کمپنی کی تجارت کی حفاظت کے لیے اگر جنگی جہازوں کی ضرورت ہوگی تو مہیا کیے جائیں گے۔ کمپنی کو صلح اور جنگ کرنے کے اختیارات بھی دیے گئے۔ فرانسیسی کمپنی کی پہلی کوٹھی ۱۶۶۸ء میں سورت میں قائم ہوئی۔ مغل حکومت نے اس کو وہی مراعات دیں جو ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے لیے منظور کی گئی تھیں۔ فرانسیسی کمپنی کی اگرچہ حکومت فرانس نے بڑی حوصلہ افزائی کی لیکن پبلک نے اس کا سرمایہ جمع کرنے میں کسی قسم کی گرمجوشی کا ثبوت نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہالینڈ اور انگلستان کی کمپنیاں وہاں کے معاشی حالات کا فطری نتیجہ تھیں اس طرح فرانس کی کمپنی کی جڑیں ملک کی معاشی زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ نہ تھیں۔ انگلستان اور ہالینڈ میں پبلک ایسی کمپنیوں کی اجارہ داری کے اس لیے خلاف تھی کہ اس کو براہِ راست مشرقی ملکوں کی تجارت سے نفع اندوزی کا موقع نہیں ملتا تھا۔ لیکن فرانس میں پبلک کو اس قسم کا کوئی احساس نہ تھا جس سے پتا چلتا ہے کہ بیرونی تجارت کی ضرورت اس ملک کے لیے اتنی

ہند یہ بھی تجنی کہ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کے لیے تھی۔ فرانسیسی کمپنی نے شروع میں میڈاگاسکر میں اپنا بہت کچھ سرمایہ کھپا دیا اور اس کی قوت بہت کچھ وہاں فضول صرف ہوگئی۔ لوئی چہاردہم اور کولبیر کی خوشنودی کے لیے بہت سوں نے کمپنی میں حصے خرید لیے تھے لیکن بعد میں اکثر حصہ داروں نے باوجود سرمایے کی ابتدائی قسطیں ادا کرنے کے باقی قسطیں ادا نہیں کیں اور حکومت فرانس کو کمپنی کا کاروبار چلانے کے لیے بہت کافی سرمایہ لگانا پڑا۔

سنہ ۱۶۷۴ء میں مدراس سے ۸۵ میل جنوب میں فرانسوا مارتین نے بیجاپور کے مقامی حاکم شیر خاں لودھی سے زمین خریدی اور پانڈی چری کی بنا ڈالی۔ بعد میں اس کے گرد قلعہ بندی کر دی گئی۔ اس زمانے میں ولندیزوں اور فرانسیسیوں میں یورپ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی دونوں قوموں کے نمائندے ایک دوسرے کی تجارت کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔ سنہ ۱۶۹۳ء میں ولندیزوں نے بحری حملہ کر کے پانڈی چری پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سنہ ۱۶۹۷ء میں صلح نامۂ رزوک کی رو سے پانڈی چری فرانسیسیوں کو واپس دے دیا گیا۔ مارتین اب ہندوستان میں فرانسیسی کوٹھیوں کا ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) مقرر کر دیا گیا۔ اس نے پانڈی چری کی ترقی کے اسباب فراہم کیے اور یہ شہر ہندوستان میں فرانسیسیوں کا صدر مقام بن گیا۔ چندر نگر اور ماہی کی کوٹھیاں اس کے ماتحت کر دی گئیں۔ اگرچہ پانڈی چری کو اس زمانے میں خوب ترقی ہوئی اور وہ بڑا بارونق شہر بن گیا لیکن فرانسیسی تجارت کے دوسرے مراکز زوال کی حالت میں تھے۔ ہگلی پر چندر نگر، فورٹ ولیم کے مقابلے میں بہت کم درجے پر تھا۔ سورت اور مسولی پٹم میں فرانسیسیوں کی جو کوٹھیاں تھیں ان میں بھی کچھ ایسا زیادہ کاروبار نہیں ہو رہا تھا۔ لوئی چہاردہم نے کمپنی کو جو پچاس سال کا اجارہ دیا تھا وہ اب ختم ہو رہا تھا۔ کمپنی کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ سنہ ۱۷۲۰ء میں کمپنی کی نئی تنظیم عمل میں آئی اور لے نوار کو فرانس کے ہندوستانی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے فرانسیسی ساکھ کو سنبھالنے کی بہت کچھ کوشش کی اور اس کی مساعی سے کمپنی کی تجارت کو اچھا خاصہ فروغ ہوا۔ پانڈی چری کی آبادی بہت بڑھ گئی۔ اس کے جانشین دیوما نے بھی اپنے پیش رو کی طرح فرانسیسی ساکھ کو

بڑھانے اور فرانسیسی کمپنی کی تجارت کو ترقی دینے کی حتی المقدور کوشش کی۔ اس نے فرانسیسی کمپنی کے تعلقات دیسی والیان ملک کے ساتھ قائم کیے تاکہ سیاسی اثر سے تجارت کو فروغ ہو۔ خاص کر نواب کرناٹک سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ پہلی مرتبہ فرانسیسیوں نے سنہ ۱۷۳۹ء میں تنجور کی راج گدی کے جھگڑے میں حصہ لیا اور طرفین میں سے ایک کی مدد کے عوض میں کاری کال پر قبضہ حاصل کیا جو ساحل کارومنڈل پر کول رون دریا کے دہانے پر واقع ہے اور جغرافی لحاظ سے باموقع تجارتی مقام تھا[1]۔ پھر سنہ ۱۷۴۱ء میں جب کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اول دہلی میں تشریف رکھتے تھے رگھوجی بھونسلا نے کرناٹک پر حملہ کر دیا اور خوب ہی لوٹ مار مچائی۔ نواب دوست علی نے مقابلہ کیا۔ لیکن وہ جنگ میں کام آیا۔ اس کا بیٹا صفدر علی نواب ہوا۔ اس نے اپنی والدہ اور خاندان کے دوسرے افراد کو مع خزائن و جواہرات وغیرہ کے فرانسیسی گورنر دیوما کی پناہ میں پانڈی چری بھیج دیا۔ رگھوجی بھونسلا نے دیوما کو دھمکی دی کہ وہ نواب سے کوئی سروکار نہ رکھے اور اس کو جو چوتھ ادا کرنا قبول کرے۔ سابق نواب کے داماد چندا صاحب کو مرہٹوں نے گرفتار کر لیا تھا اس کے بیوی بچوں نے بھی پانڈی چری میں آکر پناہ لی سابق نواب کے وزیر میر اسد کے ذریعے سے مرہٹوں نے نواب صفدر علی سے معاہدہ کر لیا جس کی رو سے نواب نے ایک کروڑ روپیہ بہ اقساط مرہٹوں کو دینے کا وعدہ کیا۔ اب رگھوجی پانڈی چری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دیوما کو متعدد خطوط لکھے اور کارومنڈل ساحل کی تمام بندرگاہوں پر ۶۰ لاکھ بقایا محاصل کا مطالبہ پیش کیا اور نواب کرناٹک کے خزانے اور جواہرات بھی واپس طلب کیے دیوما نے اس عرصے میں خوب تیاری کر لی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بات فرانسیسی قوم کی شرافت کے خلاف ہے کہ جن غریب الوطن مستورات اور بچوں نے ان کے ہاں پناہ لی ہے انھیں کسی دوسرے کے حوالے کر دیں یا ان کی ملکیت پر کسی طرح کی

---

[1] Guyon, Historiesdes Indes Orientales, Vol.III, P. 21; Memoire particuliere sur l'acquisition de Karikal.

آنچ آنے دیں[1]۔ دیوما نے رگھوجی کی دھمکیوں کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

"ہمارے وطن فرانس میں نہ تو سونا پیدا ہوتا ہے اور نہ چاندی ہم سامان خریدنے کے لیے اپنے ساتھ جو سونا چاندی لاتے ہیں وہ ہمیں دوسرے ملکوں کی تجارت سے ملتا ہے۔ ہمارے ملک میں صرف لوہا اور سپاہی پیدا ہوتے ہیں اور ہم اول الذکر کو ان کے خلاف استعمال کرنا بھی جانتے ہیں جو ہمیں غیر منصفانہ طور پر پریشان کریں[2]" اس جواب کا رگھوجی بھونسلا پر معلوم ہوتا ہے خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کو ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر پانڈی چری پر حملہ کرے۔ اس کے بعد وہ کرناٹک سے واپس چلا گیا۔ دیوما کے اس شریفانہ سلوک سے رئیس کرناٹک کا خاندان فرانسیسیوں کا مرہون منت ہو گیا اور اس کے ساتھ ان کی بہادری اور جراءت کی سارے جنوبی ہند اور دکن میں شہرت ہو گئی۔ جب اس واقعے کی اطلاع دہلی پہنچی تو نواب نظام الملک آصف جاہ اول نے جو اس زمانے میں دہلی میں وکیل مطلق کی حیثیت سے تشریف فرما تھے دیوما کو شاہی دربار کی طرف سے خلعت روانہ کیا اور اپنے خط میں اس کی بہادری اور شرافت کی تعریف کی[3]۔

فرانسیسیوں کے اسی بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر انگریزوں کو رشک پیدا ہوا اور وہ ان کا توڑ کرنے لگے۔ دونوں قوموں میں رقابت بڑھنے لگی۔ جہاں تک تجارتی کاروبار کا تعلق تھا فرانسیسی کمپنی انگریزی کمپنی کے مقابلے میں بہت ہیٹی تھی لیکن دیوما اور اس کے قابل اور حوصلہ مند جانشین دیوپلے کی سیاست نے انگریزوں کو بھڑکا دیا اور بالآخر دونوں قوموں میں جنوبی ہند میں سخت کشمکش شروع ہو گئی۔ ولندیزوں نے

1. Malleson, The rise of The French Powers in India p. 88.

2. Martineau, Dupleix et I'Inde Francaise, Vol. II p. 22.

3. Correspondance du Conseil Superieur de Pondichery, Vol. III, p. 242, Gnyon. Histoire de Indes Orientales, Vol. III, p, 322-33

اب اپنی تمام تر توجہ جزائر شرق الہند کی تجارت کی طرف کردی تھی ہندوستان میں اٹھارھویں صدی کے وسط میں انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کے مدمقابل بن گئے اور دونوں ملک کی عام سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر ملک گیری کے خواب دیکھنے لگے۔

ڈنمارک۔ آسٹریا۔ سویڈن اور فلنڈرس والوں کی کمپنیاں

ہندوستان میں تجارت کرنے کے لیے انگلستان، ہالینڈ اور فرانس کے علاوہ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی تجارتی کمپنیاں قائم کی گئی تھیں جن کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

انگریزی اور ولندیزی تجارت کے فروغ کو دیکھ کر ڈنمارک میں سنہ ۱۶۱۶ء میں ایک کمپنی قائم کی گئی جس نے مسولی پٹم میں اپنا تجارتی کارخانہ قائم کیا اور بعد میں بنگال میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ بنگال میں سیرام پور کی کوٹھی کچھ دن پھلی پھولی۔ نکوبار اور مالابار میں بھی ڈینش کمپنی کی شاخیں تھیں۔ ڈینش کمپنی ہندوستان سے جو مال لے جاتی تھی وہ چھپے چوری انگریز تاجر اس سے خرید کر انگلستان کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ خاص طور پر یہ کمپنی چین سے جو چائے لاتی تھی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لائی ہوئی چائے کے مقابلے میں لندن میں بہت سستی بکتی تھی۔ اس چھپے چوری کی تجارت سے انگریزی کمپنی کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں جب ڈنمارک اور انگلستان میں جنگ چھڑ گئی تو سیرام پور اور ٹرنکبار کی کوٹھیوں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا لیکن صلح نامہ ہو جانے کے بعد یہ دونوں کوٹھیاں ڈینش کمپنی کو واپس کر دی گئیں۔ لیکن اس کے بعد سے ڈینش کمپنی کی مالی حالت سقیم ہوتی گئی اور اس کی مشرقی تجارت تقریباً ختم ہو گئی۔ سنہ ۱۸۴۵ء میں سیرام پور، ٹرنکبار اور بالاسور کی کوٹھیوں اور متعلقہ زمینوں کو ڈینش کمپنی نے ساڑھے بارہ لاکھ روپیے کے عوض میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

سنہ ۱۷۳۱ء میں آسٹریا میں آسٹرین ایسٹ انڈیا کمپنی اور سنہ ۱۷۷۵ء میں سویڈن میں

سویڈش ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی۔ لیکن دونوں چند سال کاروبار کرنے کے بعد دیوالیہ ہوکر ختم ہوگئیں۔

سنہ ۱۷۲۳ء میں فلنڈرس کے تاجروں نے آسٹنڈ کمپنی قائم کی۔ جرمن شہنشاہ نے انگلستان اور ہالینڈ کی حکومتوں کے احتجاج کرنے کے باوجود آسٹنڈ کمپنی کو مشرقی ممالک میں تجارت کرنے کی اجازت بذریعہ منشور عطا کردی۔ اس کمپنی نے بہت جلد اپنے کاروبار کو ترقی دی۔ چونکہ آسٹنڈ انگلستان کے ساحل کے بالکل قریب واقع ہے اس لیے اس کمپنی کا مال چوری چھپے لیکن کافی وسیع پیمانے پر انگلستان پہنچتا رہتا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نرخوں کے مقابلے میں سستا فروخت ہوتا تھا۔ خود لندن کے بعض تاجروں نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کے خلاف تھے آسٹنڈ کمپنی کے کاروبار کو چمکانے میں حتی المقدور امداد کی۔ آسٹنڈ کمپنی کا چوری چھپے سے اس قدر مال انگلستان پہنچنے لگا کہ بالآخر پارلیمنٹ کو اس کی روک تھام کے لیے متعدد قوانین وضع کرنے پڑے اور ان تاجروں اور سرمایہ داروں کو سخت سزاؤں کی دھمکی دی گئی جو آسٹنڈ کمپنی کے مال کو انگلستان میں فروخت کریں گے۔ لیکن باوجود ان قوانین کے آسٹنڈ کمپنی کا مال انگلستان آتا رہا اور بکتا رہا۔ کئی سال تک آسٹنڈ کمپنی کے مسئلے نے یورپین سیاست میں خاصی نمایاں حیثیت حاصل کرلی اس واسطے کہ اس کی پشت پناہی پر جرمن شہنشاہ کا منشور موجود تھا۔

آسٹنڈ کمپنی کے کاروبار کو ترقی اس وجہ سے اور بھی ہوئی کہ ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے بعض تجربے کار عہدہ داروں نے جو اپنی کمپنیوں سے غیر مطمئن تھے اس کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ یہ لوگ مشرقی ملکوں کے تجارتی حالات سے خوب واقف تھے اور اپنے تجربے سے آسٹنڈ کمپنی کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ آسٹنڈ کمپنی نے ہگلی پر بانکی بازار میں اور مدراس کے قریب کولاتج تک میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کیے۔ ہر سال اس کمپنی کے تجارتی جہازوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا جو یورپ سے مال لاتے اور واپسی پر ہندوستان کا مال یورپ لے جاتے اور بعض اوقات ہندوستان اور جزائر شرق الہند کے درمیان کاروبار

کرتے تھے۔ بالآخر ولندیزوں اور انگریزوں نے مجبور ہوکر آسٹنڈ کمپنی کے جہازوں پر سمندر میں دھاوے کرنا اور ان کا مال و اسباب لوٹنا شروع کر دیا۔ بانکی بازار کی کوٹھی پر مقامی مغل فوجدار کو ملا کر انگریزوں اور ولندیزوں نے حملہ کر دیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ کولانک کی کوٹھی خود بخود بیٹھ گئی۔ اس طرح چند سال کے کاروبار کے بعد آسٹنڈ کمپنی کا خاتمہ ہو گیا اس واسطے کہ اس کی حمایت پر کوئی جنگی بیڑا موجود نہ تھا جو اس کے تجارتی جہازوں کی حفاظت کر سکتا۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں ولندیزوں کی ہندوستانی تجارت بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ اب ان کی تجارت کا یہاں وہ زور شور باقی نہ رہا جو سترھویں صدی میں تھا۔ اصل میں ہالینڈ کی طاقت ایسی زبردست نہ تھی اور نہ اس کے وسائل اتنے وسیع تھے کہ جزائر شرق الہند اور ہندوستان دونوں جگہ کاروبار کی سرگرمی باقی رکھی جا سکتی۔ ان کے مقابلے پر انگریز اور فرانسیسی تھے جنھیں اس زمانے میں بہت وسیع سیاسی وسائل حاصل تھے اور ان دونوں ملکوں کی یورپ میں خاص حیثیت تھی۔ چنانچہ ولندیزوں نے بڑی دانشمندی سے اپنے تمام تر وسائل کو جزائر شرق الہند میں محدود کر دیا، اور وہاں اس قدر استحکام حاصل کر لیا کہ یورپ کی دوسری اقوام مشکل ہی سے وہاں ان کی بنیادوں کو ہلا سکتی تھیں۔ اب ہندوستان میں انگریز اور فرانسیسی باقی رہ گئے۔ ان دونوں قوموں نے تجارت کے ساتھ ہندوستان میں ملک گیری کے منصوبے باندھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کئی سال کے تصادم کے بعد انگریزوں نے اپنے فرانسیسی حریفوں پر غلبہ پا کر ہندوستان میں سیاسی تفوق حاصل کیا۔

دوسرا باب

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش

اور

انگریزوں کی کامیابی

جس زمانے میں نواب نظام الملک آصف جاہ اول بادشاہ محمد شاہ کی دعوت پر دہلی میں تشریف رکھتے تھے تو کرناٹک میں بڑی سخت بدانتظامی پھیل گئی اور بعض حالات ایسے پیش آئے جن کا اثر تاریخ ہند میں بہت دور رس ثابت ہوا۔ کرناٹک کے نواب صفدر علی میں نظم و نسق کی صلاحیت نہ تھی۔ ترچناپلی پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں آہستہ آہستہ وہ پورے کرناٹک کو اپنے زیر نگیں نہ لے آئیں۔ پھر نواب صفدر علی کے خلاف خود اس کے خاندان والے سازشیں کر رہے تھے جس کے باعث حکومت کی ساکھ اور بھی گر گئی تھی۔ نواب صفدر علی کے

چچازاد بھائی مرتضیٰ علی نے ساز باز کر کے اس کو زہر دلوادیا اور خود کرناٹک کی نوابی کا دعوے دار بنا۔ لیکن فوج نے اس کے خلاف بغاوت کردی اور ۱۷۴۲ء میں نواب صفدر علی کے نوعمر لڑکے کو، جس کا نام سعید محمد خاں تھا، کرناٹک کا نواب تسلیم کیا۔ سعید محمد خاں نے سینٹ فورٹ جارج کے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور انھیں ان کے حسب منشا سینٹ فورٹ جارج کے قریب پانچ گاؤں بطور انعام عطا کیے اور انھیں اپنی ٹکسال قائم کرنے اور ارکاٹ کا روپیہ بنانے کی اجازت بھی دے دی[1]۔

جب نواب نظام الملک دہلی سے دکن واپس ہوئے تو کرناٹک کی انتظامی ابتری کو دور کرنے کی غرض سے ۱۷۴۳ء میں دورے پر تشریف لے گئے تاکہ تمام حالات بچشم خود ملاحظہ فرمائیں۔ انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہر فوجدار اپنے آپ کو نواب کہنے لگا ہے۔ نواب نظام الملک نے حکم دے دیا کہ آیندہ سے کرناٹک میں صرف ایک نواب ہوگا جو صوبہ دار دکن کا نائب ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر کسی نے نواب ہونے کا دعویٰ کیا تو اس کو سزا دی جائے گی[2]۔ نواب نظام الملک نے اپنے ایک سردار خواجہ عبد اللہ خاں کو کرناٹک کا انتظام سپرد کیا لیکن اس کے ناگہانی انتقال کے باعث اپنے ایک دوسرے افسر انور الدین خاں گوپاموی کو اس کی جگہ مقرر کر کے اس کو نواب صفدر علی کے لڑکے سعید محمد خاں کا نگران مقرر کیا[3]۔ کرناٹک کے انتظامات درست کرنے کے بعد نواب نظام الملک آصف جاہ اول اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں بعد سعید محمد خاں کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو انور الدین خاں کو کرناٹک کا نواب مقرر کر دیا گیا اور اس طرح والا جاہی خاندان کی بنا پڑی۔

---

1. Love, Vestiges of Old Madras, II, p. 284. ؎۱

2. Orme, The Military Transactions of The British Nation in Indostan, I, p. 51. ؎۲

3 Ibid, p. 51. ؎۳

جب نواب نظام الملک کرناٹک کے دورے پر تشریف لے گئے تھے تو انگریز اور فرانسیسی ان کی خوشنودی کے لیے ساعی رہے۔ دونوں طرف سے سفارتیں اور تحفے تحائف بھیجے گئے۔ انگریزی سفارت کے سرگروہ مسٹر آئیری کو فورٹ سینٹ جارج کے صدر نے ہدایت کی تھی کہ "اگر ہماری تجارت اور مراعات کے متعلق کوئی سوال دریافت کیا جائے تو جس قدر بھی تمھارا جواب گول مول اور مبہم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ ہماری تجارت کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنا بہت روپیہ اس ملک میں لگاتے ہیں اور ہم اس رقم کے علاوہ اس ملک سے باہر نہیں لے جاتے جو ہم اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اگر ہمیں ان علاقوں میں تجارت کے مواقع حاصل ہو جائیں تو اس سے بھی کم رقم ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ہمیں (کرناٹک میں) جو تجارتی مراعات ملی ہیں وہ ذوالفقار خاں اور دوسرے حاکموں نے عطا کی ہیں جن کی توثیق مغل شہنشاہ فرخ سیر نے کی تھی۔ اب ہمیں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے جن مزید مراعات کی ضرورت ہے ان کے لیے ہم جناب والا کے لطف و کرم کے امید وار ہیں[1]۔"

لیکن باوجود اس سفارت اور ان تحفے تحائف کے جو سینٹ فورٹ جارج سے نواب نظام الملک آصف جاہ اول کی خدمت میں بھیجے گئے انگریزوں کو کوئی خاص مراعات حاصل نہ ہو سکیں۔ اور سعید محمد خاں نے سینٹ فورٹ جارج میں ٹکسال قائم کرنے اور ارکاٹ کا روپیہ بنانے کی جو اجازت دے دی تھی اس کی توثیق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن انگریزوں نے چوری چھپے سے سکہ سازی جاری رکھی[2]۔ جس وقت سے گورنر ڈیوما نے رگھوجی بھونسلا کی دھمکیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا اس وقت سے نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے دل میں فرانسیسی قوم کی عزت پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے اسی وجہ سے فرانسیسیوں کو بعض ایسی مراعات دی تھیں جن سے انگریزوں کو محروم

1. Diary and Consulation Book, 1743.
(Records of Fort St. George).
2. Ibid.

رکھا گیا تھا۔ چنانچہ انھیں ٹکسال قائم کرنے اور سکہ سازی کرنے کی اجازت[1] بذریعۂ پروانہ عطا کر دی تھی اور ان کا روپیہ بنگال تک چلتا تھا۔ لیکن نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ کا رجحان اور ہمدردی زیادہ تر انگریزوں کی جانب تھی جس کے سبب سے آئندہ نہایت اہم تاریخی واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے نمایندے صوبہ دار دکن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس واسطے اور بھی کوشاں تھے کہ یورپ سے خبریں پہنچ رہی تھیں کہ آسٹریا کی جانشینی کی جنگ کے سلسلے میں انگریزی اور فرانسیسی حکومتیں بھی ایک دوسرے سے الجھنے والی ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۷۴۴ء کے آخر میں ان دونوں قوموں کے درمیان اعلان جنگ ہو گیا۔ چونکہ اس زمانے میں ساحل کارومنڈل پر فرانسیسیوں کی بحری قوت بہت کم تھی اس واسطے فرانسیسی گورنر ڈیوپلے نے کوشش کی کہ باوجود یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ جانے کے ہندوستان میں دونوں قوموں میں صلح و امن برقرار رہے۔ وہ جانتا تھا کہ انگلستان سے کموڈور بارنٹ کی سرکردگی میں جنگی بیڑا ہندوستان کے لیے روانہ ہو چکا ہے تاکہ فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ انگریز اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح قائم رہی تو اس سے فائدہ فرانسیسیوں کو ہوگا جو بحری قوت میں کمزور ہیں جب ڈیوپلے کی یہ تدبیر نہ چلی تو اس نے نواب انور الدین خاں سے درخواست کی کہ وہ اپنے کسی علاقے میں انگریزوں کو اس کی اجازت نہ دیں کہ وہ فرانسیسیوں پر حملہ کریں چنانچہ نواب انور الدین خاں نے مدراس کے گورنر مسٹر مورس کو لکھا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ میں سلطنت مغلیہ کی غیر جانبداری کسی طرح سے متاثر نہیں ہونی چاہیے۔ جب یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو اگر انگریزوں نے نواب کرناٹک کے

---

1. Martineau, Lettres et Conventions, p 106—109. لہ

(Pondichery Archives)

کسی علاقے میں فرانسیسیوں کو نقصان پہنچایا تو وہ ذمہ دار ٹھہریں گے اور اس طرح سے اگر فرانسیسی انگریزوں کو نواب کرناٹک کے کسی علاقے میں نقصان پہنچائیں گے تو ان سے باز پرس کی جائے گی۔ یہ دراصل ڈیوپلے کی تدبیر کی کامیابی تھی۔ ظاہر ہے کہ گورنر مدراس نواب کرناٹک کی مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا۔ اور خاص کر ایسے وقت میں جبکہ اس کی قوم جنگ میں مبتلا تھی۔ غرض کہ اس طرح ڈیوپلے عارضی طور پر انگریزوں کے حملے سے بچ گیا۔ کموڈور بارنٹ کی سربراہی میں جو بیڑا انگلستان سے روانہ ہوا تھا وہ ۱۷۴۵ء میں ساحلِ کارومنڈل پر پہنچ گیا اور پانڈی چری پر حملے کی تیاری شروع ہو گئی لیکن گورنر مدراس نے نواب انورالدین خاں کے خطرے کے سبب سے پانڈی چری پر حملہ ملتوی کرا دیا۔ بارنٹ اپنا بیڑا آبنائے ملاکا کی طرف لے گیا تاکہ وہاں فرانسیسی تجارتی جہازوں کو راستے میں گرفتار کرے اور لوٹے۔ غرض کہ اب سمندر کی طرف سے بھی فرانسیسیوں کو کوئی خطرہ نہ رہا۔

اسی اثنا میں ڈیوپلے نے ماریشس کے گورنر لابوردونے سے خط و کتابت کی اور بحری امداد طلب کی۔ لابوردونے جون ۱۷۴۶ء میں اپنے جنگی بیڑے کو لے کر ساحلِ کارومنڈل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب بارنٹ کو لابوردونے کے روانہ ہونے کی خبر پہنچی تو وہ فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں لنگر انداز ہو گیا اور وہیں تھوڑے دنوں بیمار رہ کر مر گیا۔ پے ٹن اس کا جانشین مقرر ہوا۔ اس نے لابوردونے کو لنکا کے قریب روکنے کی کوشش کی لیکن لابوردونے کے بیڑے نے پے ٹن کے انگریزی بیڑے کو مار بھگایا۔ لابوردونے نے سیدھا مدراس کا رخ کیا۔ مدراس تک اس کی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ مدراس کے گورنر مورس نے نواب انورالدین خاں سے امداد طلب کی لیکن نواب نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ لابوردونے کا بیڑا ۱۴ ستمبر ۱۷۴۶ء مدراس کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور مدراس پر گولہ باری شروع کر دی۔

چند روز تک گولہ باری کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر مدراس کے گورنر نے اپنے ایلچی بھیجے اور صلح کی درخواست کی۔ ان ایلچیوں نے ایک مشروط معاہدہ کر لیا اور ۱۰ ستمبر ۱۷۴۶ء مدراس کو لابوردونے کے حوالے کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے

تمام انگریزوں نے بلامقابلہ اپنے آپ کو فرانسیسیوں کے سپرد کردیا۔ لابوردونے نے معاہدے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ شہر مدراس کو زرِ رستگاری وصول کرکے انگریزی حکومت کو واپس کردے گا۔ مدراس میں جس قدر سامانِ جنگ ملا اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا۔

جب نواب انورالدین خاں کو انگریزوں سے اطلاع ملی کہ مدراس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا ہے تو اس نے ڈوپلے سے جواب طلب کیا کہ یہ کیا بات ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ میرے کہنے پر انگریزی بیڑے نے پانڈی چری پر گولہ باری نہیں کی لیکن جب فرانسیسیوں کو موقع ملا تو انھوں نے مدراس پر گولہ باری کرکے قبضہ کرلیا۔ ڈوپلے نے اس کے جواب میں اپنے ایجنٹ کو جو ارکاٹ میں رہتا تھا لکھا کہ مدراس انگریزوں سے چھین کر نواب کرناٹک کو واپس کردیا جائے گا۔ لیکن نواب انورالدین خاں ڈوپلے کی اس چال بازی کو بھانپ گیا اور فرانسیسیوں کے خلاف اپنے بڑے بیٹے محفوظ خاں کی سرکردگی میں دس ہزار کا لشکر روانہ کردیا۔ نواب کرناٹک کی فوج نے مدراس کو گھیر کر سامانِ رسد بند کردیا۔ فرانسیسیوں نے محفوظ خاں سے گفت وشنید کرنے کے لیے دو ایلچی بھیجے جنھیں گرفتار کرلیا گیا۔ چنانچہ پارادی کے تحت تھوڑی سی فرانسیسی فوج نے نواب کے لشکر پر اچانک حملہ کردیا اور سینٹ تھومے کی طرف ہٹا دیا۔ اسی اثنا میں پانڈی چری سے مزید کمک آگئی اور پارادی کی فوج میں شامل ہوگئی۔ دریائے ادیار کے کنارے پر محفوظ خاں سے جم کر مقابلہ ہوا اور فرانسیسی فوج کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ دراصل پہلی کامیابی تھی جو اہلِ یورپ کو کسی ہندوستانی والیٔ ملک کے مقابلے میں حاصل ہوئی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اہلِ یورپ اپنے جدید سائنٹفک طریقِ جنگ کے باعث تھوڑی سی تعداد سے اہلِ ہند کے بڑے سے بڑے لشکر کو نیچا دکھا سکتے ہیں جو جنگ کرنے کے فرسودہ اصول پر عمل پیرا تھا۔

لابوردونے اور ڈوپلے میں مدراس کے انتظام کے متعلق سخت اختلاف پیدا ہوگیا۔ لابوردونے چاہتا تھا کہ زرِ رستگاری وصول کرکے شہرِ مدراس انگریزوں کو واپس دے دے۔ لیکن ڈوپلے اس کے خلاف تھا۔ وہ مدراس پر

مستقل قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوپلے نے بہ حیثیت گورنر لابوردونے کو اپنی رائے کا پابند کرانے کی کوشش کی لیکن اس نے ڈیوپلے کی ایک نہ سنی اور کہلا بھیجا کہ میں سرزمینِ ہند میں بھی گورنرِ پانڈی چری کا ماتحت نہیں ہوں۔ چنانچہ اس نے گورنرِ مدراس سے گفت و شنید کر کے چار لاکھ چالیس ہزار روپے (گیارہ لاکھ پگوڈا) کے عوض مدراس کو واپس کر دیا۔ اس رقم کی قسط وار ادائگی کا انتظام یورپین ہنڈیوں کے ذریعے کیا جاتا طے ہوا[1]۔ اس ضمن میں ڈیوپلے اور لابوردونے میں جو خط و کتابت ہوئی اس میں بہت تلخی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس تو تو میں میں کے متعلق ڈیوپلے کے سکرٹری انندا رنگا پلے نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ "یورپین لوگ جو ہمیشہ اتحاد و اتفاق سے کام کیا کرتے تھے اب بظاہر ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح ہوتے جاتے ہیں"[2] — ڈیوپلے نے پانڈی چری سے اپنی کونسل کے بعض ارکان کو مدراس بھیجا تاکہ وہ شہر کے نظم و نسق کا جائزہ لے لیں لیکن لابوردونے نے ان کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈیوپلے برابر اس پر اصرار کرتا رہا کہ مدراس کے مستقبل کے متعلق کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک پانڈی چری کا گورنر اور اس کی کونسل قطعی رائے قائم نہ کر لے۔ لابوردونے کا کہنا تھا کہ فرانس کے وزیر بحریہ نے اس کو جو اختیارات دیئے ہیں ان کی نسبت فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا اعلیٰ سے اعلےٰ عہدہ دار بھی دخل دینے کا مجاز نہیں ہے۔ پھر اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ وزیر بحریہ نے اس کو انگریزی بندرگاہوں پر حملہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی اجازت دی ہے نہ کہ مستقل طور پر قبضہ کرنے کی۔ غرض کہ اس قانونی بحثا بحثی میں نہ صرف ناخوشگوار صورت حالات پیدا ہو گئی بلکہ فرانسیسی مفاد و مقاصد کو بہت نقصان پہنچا۔

لابوردونے مدراس کو انگریزی گورنر کے حوالے کر کے ماریشس واپس چلا گیا۔ اس کے واپس جاتے ہی ڈیوپلے نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا

---

[1] Malleson, History of the French in India, P. 158.

[2] The Private Diary of Ananda Ranga Pillai, 11, P. 395.

جو گورنر مدراس اور لابورڈونے کے درمیان ہوا تھا اور مدراس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور جتنے انگریز وہاں موجود تھے انھیں گرفتار کر کے پانڈی چری بھیج دیا۔ اس کے بعد ڈوپلے نے سینٹ فورٹ ڈیوڈ پر چار مرتبہ پے در پے حملے کیے لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لارنس نے نہایت قابلیت اور بہادری سے فرانسیسیوں کا مقابلہ کیا اور ان کی ایک نہ چلنے دی۔ نواب انورالدین خاں نے بھی جو اب فرانسیسیوں سے سخت ناراض تھے لارنس کی مدد کے لیے سینٹ فورٹ ڈیوڈ فوج بھیج دی۔ اسی اثنا میں انگریزوں کا جنگی بیڑا اڈمیرل باسکوون کی سرکردگی میں جولائی ۱۷۴۸ء میں ساحل کارومنڈل پر پہنچ گیا اور پانڈی چری کی ناکہ بندی کر دی۔ دو مہینے تک فرانسیسیوں نے بڑی بہادری سے پانڈی چری کی مدافعت کی اور باسکوون نے جب خشکی پر فوج اتارنے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کی تو انھوں نے مدافعتی حملے کر کے پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس موقع پر مشہور فرانسیسی انجنیر پاراوی نے بڑی ہوشیاری اور جرات کا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ حملہ کرتے ہوئے اس کے زخم لگا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ پاراوی کے مرنے کے بعد پانڈی چری کی مدافعت کا سارا بار خود ڈوپلے پر پڑ گیا جیسا کہ خود اس نے کہا ہے "ریاضی اور قلعوں کی تعمیر کے متعلق میں نے ابتدائی عمر میں جو علم حاصل کیا تھا اور جس کی نسبت میرے والد ہمیشہ مجھے تاکید کیا کرتے تھے اس موقع پر میرے کام آیا۔"[1] غرضکہ باسکوون کو نو مہینے کی ناکہ بندی کے بعد بارش کا موسم شروع ہو جانے کے باعث پانڈی چری کی فتح سے دست بردار ہونا پڑا جو ڈوپلے کی زبردست کامیابی تھی۔ باسکوون، فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں بارش کے موسم کے ختم ہونے کا انتظار کرتا ہوا کئی مہینے بیکار پڑا رہا۔ ڈوپلے کا دستور تھا کہ اپنی کامیابیوں کو ہندوستانی والیان ملک کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرواتا تھا تاکہ انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسی قوم کی عزت ان کے دلوں میں قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی جبکہ باسکوون کا زبردست بیڑا ناکام ہوا تو اس نے اس کی اطلاع ارکاٹ، حیدرآباد اور دہلی کو بھجوا دی۔[2]

۱۔ Memoire pour Dupleix.

۲۔ Malleson, History of the French India, P. 227.

جب یورپ میں فرانس اور انگلستان میں صلح ہوگئی اور ۱۷۴۸ء میں صلح نامۂ ایکس لاشاپل پر دستخط ہوگئے تو ہندوستان میں بھی دونوں قوموں کی لڑائی ختم ہوگئی۔ ۱۷۴۹ء میں اس صلح نامے کی نقلیں انگریزی اور فرانسیسی کمپنی کے گورنروں کو ہندوستان پہنچیں۔ اس صلح نامے کی رو سے مدراس انگریزوں کو اور لوئس برگ شمالی امریکہ میں فرانس کو واپس دے دیے گئے، اور دونوں طرف سے سب قیدی رہا کر دیے گئے۔ باسکوواں انگلستان واپس چلا گیا۔ آسٹریا کی جانشینی کی لڑائی کے خاتمے پر ہندوستان میں فرانسیسیوں کا ایک خاص وقار قائم ہوگیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آئندہ حیثیت کا دار و مدار اُن حالات کے تابع تھا جو یورپ میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ فرانس یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں میں روز بروز زیادہ اُلجھتا گیا جس کے باعث وہ اپنی نوآبادیات اور مشرقی مقبوضات کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکا۔

۱۷۴۸ء جنوبی ہند اور دکن کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال حضرت نظام الملک آصف جاہ اول کا انتقال ہوا۔ آنندرنگاپلے[1] کی پیشین گوئی بالکل صحیح نکلی کہ نواب نظام الملک آصف جاہ اول اگر نہ رہے تو دکن اور جنوبی ہند سخت بدنظمی اور خلفشار میں مبتلا ہو جائے گا۔ نواب مغفرت مآب کی شخصیت اور اقبال کی بدولت بہت سے فتنے دبے ہوئے تھے۔ جب وہ نہ رہے تو سوتے ہوئے فتنے جاگ اٹھے اور بدنظمی کی بجھی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں جنھوں نے آئندہ کئی سال تک دکن اور جنوبی ہند کے خرمن امن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اگلے سال نواب انورالدین خاں والی کرناٹک جنگ امبور میں مارے گئے۔ چنانچہ دونوں جگہ جانشینی کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے جن میں اہل یورپ کو براہ راست دخل دینے کا موقع مل گیا۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے سب سے بڑے صاحبزادے غازی الدین خاں فیروز جنگ دہلی میں امیر الامرا کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں نظام الملک کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ نے دکن کی صوبہ داری کا اعلان کر دیا۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے نواسے مظفر جنگ (ہدایت محی الدین خاں) جو

۱۔ *Diary of Ananda Ranga Pillai*

بیجاپور اور ادھونی کے حاکم تھے صوبہ داری کے مدعی ہوئے دونوں دعوے داروں نے مغل بادشاہ کی سندیں اپنی اپنی تائید میں پیش کیں۔ بعض فرانسیسی مورخوں نے مظفر جنگ کی سند کے اصلی ہونے کے متعلق مفصل بحث کی ہے[1]۔ لیکن ہمعصر مورخوں یا اس زمانے کی دستاویزوں سے ان کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ مظفر جنگ نے دیوپلے کی امداد طلب کی تاکہ خود کو دکن کا صوبہ دار اور چندا صاحب کو کرناٹک کا نواب بنوانے میں فرانسیسی قوم کے وسائل کو استعمال کیا جا سکے۔ فرانسیسیوں کی دیکھا دیکھی انگریزوں نے بھی اپنے آپ کو نئے سیاسی حالات سے بے تعلق رکھنا پسند نہ کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۷۵۰ء میں مدراس کونسل نے فیصلہ کیا کہ ناصر جنگ سے خط و کتابت کی جائے۔ ناصر جنگ نے انگریزوں کو مراعات کی امید دلائی اور انھیں لکھا کہ پانڈی چیری کو گھیر کر رسد بند کرنے کی کوشش کی جائے[2]۔

چونکہ صوبہ دار دکن اصولی طور پر کرناٹک کا بھی حکمران تھا اس لیے ضرور تھا کہ کرناٹک میں اپنے مفاد کی نگہداشت کے لیے انگریز اور فرانسیسی دونوں دکن کی صوبہ داری کے معاملے میں دلچسپی لیں۔ انھوں نے اس موقع پر اپنے مفاد کو ترقی دینے کے لیے سیاست و تدبر کے سارے وسائل استعمال کیے۔ جنوبی ہند اور دکن کے حکمرانوں نے پچھلے دنوں اہل یورپ کی جنگی قابلیت اور جدید سائنٹفک طریق جنگ کے مظاہرے دیکھے تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اب ان کی کوشش یہ تھی کہ یورپین ماہروں کو اپنی ملازمت میں لیں اور انھیں اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنائیں لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب یورپین لوگ ان کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے آلۂ کار بنیں گے تو ملک کی عام سیاست میں ان کی مداخلت لازمی ہوگی۔ سیاست ہمیشہ قوت و تدبیر کے تابع ہوتی ہے۔ قوت و تدبیر سے جو اپنی مرضی کو موثر بنا سکتا ہے وہی حقیقت میں سیاست کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ گزشتہ

---

[1] *Martineau, Dupleixed' Inde Francaise, III, P.83*

[2] *Martineau, La politique de Dupleix d' apres sa letter a Saunders.*

تجربے سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ سمندر پر جو حکومت رکھتا ہے اس کے لیے خشکی پر اقتدار قائم کرنا ایسا کچھ دشوار نہیں خصوصاً ایسی ابتری اور افراتفری کے زمانے میں جو ۱۷۴۸ء اور ۱۷۴۹ء میں جنوبی ہند اور دکن میں پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلی جنگ کے بعد انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کے پاس کافی دیسی سپاہ جمع ہو گئی تھی جس کو یورپین طرز کی قواعد پریڈ اور طریق جنگ سکھایا گیا تھا اور جس کی تنخواہ کا بار دونوں کمپنیوں پر پڑ رہا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے سوچا کہ اگر ہندوستانی والیانِ ملک کے آپس کے جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے اس سپاہ کو استعمال کیا گیا تو اس کی تنخواہ کا بار ان پر ڈالا جا سکتا ہے باوجود صلح نامہ ہو جانے کے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ایک دوسرے پر مطلق اعتماد نہیں تھا۔ دونوں قوموں کو اندیشہ تھا کہ دکن اور کرناٹک میں جو خلفشار پیدا ہوا ہے اس سے دوسرا فائدہ اٹھائے گا۔ ان حالات میں بھلا ان کے لیے کیسے ممکن تھا کہ مقامی حالات سے بے تعلق رہ کر صرف اپنی تجارت کو ترقی دینے کی تدابیر اختیار کریں۔ خود تجارت سیاست کے تابع ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر عرصے تک کرناٹک اور دکن میں بدامنی رہتی تو دونوں قوموں کی تجارتی نفع اندازی کو سخت ٹھیس لگتی۔ چنانچہ انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کی یہ خواہش بالکل قدرتی تھی کہ جن علاقوں میں ان کی تجارت ہے وہاں امن و امان قائم رہے اور ایسے حکمران کے ذریعے سے قائم رہے جو ان کے قابو کا ہو تاکہ انھیں مراعات حاصل ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان حالات میں ڈوپلے جیسے منچلے شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں فرانسیسی سلطنت کی داغ بیل ڈالے تو یہ کچھ ایسا اوچھا خیال نہ تھا۔ مٹھی بھر آدمیوں سے نواب انورالدین خاں کی زبردست فوج کو شکست دے کر اس قسم کا خیال پیدا ہونا اس کے لیے قدرتی امر تھا۔ لیکن اس نے اپنے حریف انگریزوں کے وسائل کا غلط اندازہ لگایا جس کے باعث اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

نواب نظام الملک آصف جاہ اول نے انورالدین خاں کو جب کرناٹک کا نواب مقرر کیا تو کرناٹک کے سابق نواب کے خاندان کی طرف سے تھوڑی بہت

مخالفت ہوئی تھی لیکن انورالدین خاں نے اپنی قابلیت اور حسن انتظام سے بہت سے مخالفوں کو رام کر لیا تھا۔ پھر نواب نظام الملک کا اقبال ایسا تھا کہ ان کے کسی انتظام کو درہم برہم کرنا آسان نہ تھا۔ ان کی آنکھیں بچھتے ہی کرناٹک میں انورالدین خاں کی نوابی خطرے میں پڑ گئی۔ کرناٹک کے سابق حکمراں خاندان میں تو کوئی شخص ایسا اولوالعزم نہیں تھا جو انورالدین خاں کے مقابلے پر آتا۔ لیکن اس خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک شخص جس کا نام حسین دوست خاں اور عرف چندا صاحب تھا انورالدین خاں کے خلاف کرناٹک کی نوابی کا دعوے دار بنا۔ چندا صاحب نواب صفدر علی کا بہنوئی تھا۔ مرہٹوں نے جب ۱۷۴۱ء میں ترچناپلی پر حملہ کیا تو چندا صاحب نے ان کا جان توڑ مقابلہ کیا اور گرفتار ہوا۔ مرہٹے اس کو پکڑ کر ستارہ لے گئے اور آٹھ سال تک اس کو قید رکھا اس واسطے کہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر چندا صاحب کو رہا کر دیا گیا تو وہ کرناٹک میں مرہٹوں کے قدم نہ جمنے دے گا۔ چندا صاحب نے قید کے زمانے میں دوپلے سے خفیہ طور پر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کو انگریزوں کے مقابلے میں کرناٹک میں مراعات کا وعدہ کیا۔ چنانچہ دوپلے کی متواتر کئی سال کی کوشش سے مرہٹوں نے ۱۷۴۸ء میں چندا صاحب کو سات لاکھ روپے کے معاوضے میں رہا کر دیا۔ چندا صاحب نے رہا ہونے کے بعد ادھر ادھر سے کچھ قرض لے کر تھوڑی سی فوج جمع کر لی اور مظفر جنگ کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اس نے مظفر جنگ کو دکن کا صوبہ دار مان لیا بشرطیکہ وہ اسے کرناٹک کا نواب تسلیم کر لیں۔ دونوں نے اپنے تئیں ایک دوسرے کے مقاصد سے وابستہ کر لیا اور یہ طے ہوا کہ پہلے کرناٹک کے معاملے کا فیصلہ ہو جائے اور انورالدین خاں کو وہاں کی نوابی سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرانسیسی مدد لے کر دکن کی طرف توجہ کی جائے گی۔ اگرچہ نظری طور پر کرناٹک، دکن کے ماتحت تھا اور وہاں کے نوابوں کا تقرر صوبہ دار دکن کرتا تھا لیکن دکن میں نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد جو ابتری پھیلی اس کے

باعث کرناٹک کی نوابی کا مسئلہ بجائے دکن کے خود کرناٹک میں طے ہوتا تھا۔ چندا صاحب نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کرناٹک کی نوابی کا فیصلہ اب صوبہ دار دکن پر اتنا منحصر نہیں جتنا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں پر جنھوں نے اس زمانے میں کرناٹک میں اپنے قدم اچھی طرح سے جما لیے تھے۔ چندا صاحب اور مظفر جنگ نے بیجاپور اور رادھونی کے قرب و جوار میں زبردست لشکر جمع کر لیا اور ڈیوپلے سے امداد طلب کی۔ چندا صاحب کا بیٹا رضا صاحب ڈیوپلے کے پاس اپنے باپ کی طرف سے ایلچی بن کر آیا اور درخواست کی کہ جتنی مدد ہو سکے فوراً بھیجی جائے۔ چندا صاحب کو فوجی مدد اور مالی مدد دونوں کی ضرورت تھی۔ چندا صاحب نے رضا صاحب کے ہاتھ ڈیوپلے کو ایک پروانہ بھی بھیجا جس میں صراحت سے مذکور تھا کہ ارکاٹ کے ہونے والے نواب نے ولینور اور اس کے آس پاس کے چالیس گاؤں فرانسیسی کمپنی کو بطور انعام عطا کر دیے جن پر فرانسیسی کمپنی کو دائمی حقوق حاصل رہیں گے۔ چنانچہ اس پروانے کے پہنچنے کے بعد ڈیوپلے نے اپنی کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ کونسل نے فیصلہ کیا کہ "چندا صاحب کی شکر گزاری کے لیے گورنر (ڈیوپلے) کو مجاز کیا جاتا ہے کہ وہ ہر مناسب طریقے پر جو ہمارے بس میں ہے اس وقت تک اس کی مدد کرے جب تک وہ اطمینان سے مسند نشین نہ ہو جائے اور اپنی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ لے لے"[1] چنانچہ ڈیوپلے نے رضا صاحب کے ساتھ فرانسیسی فوج اور اس کے ضروری اخراجات کی پابجائی کے لیے چندا صاحب کے حساب میں ۹۷ ہزار چھ سو اکاون روپے روانہ کیے۔ ارکاٹ سے ۵۰ میل کے فاصلے پر فرانسیسی فوج چندا صاحب اور مظفر جنگ سے جا کر مل گئی اور امبور کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا جہاں انورالدین خاں پہلے سے بارہ ہزار سوار

---

[1] Martineau. Dupleix et l'Inde Francaise, III, P.86

چھ ہزار پیدل، دو سو میں ہاتھی اور ۲۶ تو پوں سے آراستہ چنداصاحب اور مظفر جنگ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ امبور کا قلعہ کرناٹک میں اپنے محل وقوع کے لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ یہ ایک پہاڑ پر واقع تھا اس پہاڑ اور قریب کی جھیل کے درمیان جو درہ ہے اس پر اگر کوئی فوج قبضہ کرلے تو کرناٹک کی سب راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی۔ اس درے پر نواب انوارالدین خاں نے اپنی توپیں آراستہ کر رکھی تھیں اور درے اور جھیل کے درمیان جو راستہ باقی رہ گیا تھا اس کو زیرآب کر دیا گیا تھا تاکہ فوج اس پر سے نہ گزر سکے[1]۔ فرانسیسی کمانڈان موسیو دوتی نے نواب انورالدین خاں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ دوتی کے تحت موسیو بسی بھی اس لڑائی میں شریک تھا جس نے بعد میں دکن میں قوت اور شہرت حاصل کی۔ نواب انورالدین خاں نے مظفر جنگ سے گفت وشنید شروع کی اور جنگ سے باز رہنے کی درخواست کی[2] لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نواب انوالدین خاں نے باوجود بڑھاپے کے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا اور شہید ہوا۔ اس کا بڑا بیٹا محفوظ خاں گرفتار ہوا اور چھوٹے بیٹے محمد علی نے بھاگ کر ترچناپلی کے قلعے میں پناہ لی۔ اس لڑائی میں چنداصاحب اور مظفر جنگ کو بہت سامان جنگ ہاتھ آیا۔ فرانسیسی افسروں اور سپاہ کو انعام واکرام سے نہال کر دیا گیا۔ امبور کی فتح کے بعد مظفر جنگ اور چنداصاحب ارکاٹ روانہ ہوئے۔ ارکاٹ بلا کسی مزاحمت کے قبضہ ہوگیا۔ یہاں مظفر جنگ نے صوبہ دار دکن کے تمام ظاہری فرائض انجام دینے شروع کر دیے اور چنداصاحب کے نواب کرناٹک ہونے کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا[3]۔ چند روز فتح کے جشن منانے کے بعد مظفر جنگ اور چنداصاحب پانڈی چری روانہ ہوگئے تاکہ دوپلے سے ملاقات کریں۔ پہلے چنداصاحب اور

---

[1] Orme, Military transaction of the British Nation in Indestan, I, P. 127.

[2] برہان توزک والاجاہی۔ حصۂ اول قلمی کتب خانۂ آصفیہ نمبر ۲۸۲

[3] Orme, Ibid, P. 129.

دو روز بعد مظفر جنگ پانڈی چری پہنچے۔ ڈیوپلے نے اپنے دونوں مہمانوں کا بڑا شاندار استقبال کیا۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مظفر جنگ نے ولیا نلور کے انعام کی توثیق کر دی اور اس کے ساتھ باہور کے ۳۶ گاؤں کے انعام کا اور اضافہ کر دیا۔ شہر مسولی پٹم (مچھلی بندر) اور جزیرہ ڈیوی بھی فرانسیسیوں کے تصرف میں دے دیا جن کی آمدنی ۴ لاکھ روپے سالانہ تھی[1]۔ ڈیوپلے نے مظفر جنگ اور چندا صاحب سے وعدہ کیا کہ ان کی ہر ممکن طور پر امداد کرے گا۔ اس نے ان کے ساتھ ۸۰۰ فرانسیسی سپاہ، ۲۴ افسر، ۳۰۰۰ دیسی فوج اور توپ خانہ کر دیا تاکہ وہ محمد علی کو ترچناپلی سے بے دخل کر دیں پیشتر اس کے کہ ناصر جنگ دکن سے کرناٹک پہنچ جائیں۔ لیکن مظفر جنگ اور چندا صاحب نے تنجور کے محاصرے پر بہت وقت صرف کر دیا۔ چندا صاحب پہلے تنجور کے راجا سے نبٹنا چاہتا تھا جس نے ۱۷۴۱ء میں مرہٹوں کو کرناٹک پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چندا صاحب کو ترچناپلی اور مدورا کی حکومت سے محروم ہونا پڑا اور آٹھ سال قید میں بسر کرنے پڑے۔ راجا تنجور نے جب چندا صاحب کے کرناٹک پہنچنے کی خبر سنی تو جھٹ سے اس نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا اور دیو کوٹہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی والیان ملک کے معاملات میں فرانسیسیوں کی دخل اندازی انھیں پسند نہ تھی لیکن چونکہ تنجور کے راجا سے انھوں نے خود معاملہ کیا تھا اس واسطے وہ کس منھ سے ڈیوپلے کے معاملات پر زبان کھولتے۔ پھر شروع میں انگریز حسب معمول کھلم کھلا مظفر جنگ اور چندا صاحب سے بگاڑ کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ گورنر مدراس نے مظفر جنگ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا اور چندا صاحب کو امبور کی کامیابی پر ایک طرف تو مبارکباد کا خط اور دوسری طرف محمد علی کو اس کے والد کے مارے جانے پر تعزیت نامہ روانہ کیا۔ لیکن جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کو کرناٹک میں خاص حقوق

[1]۔ Martineau, Ibid 111, P. 98.

دیے ہیں تو وہ اپنے متعلق متردد ہوئے۔ مظفر جنگ نے ڈوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب میں جو اپنا نائب مقرر کیا تھا اس کا یہ مطلب تھا کہ فرانسیسی من مانے طور پر انگریزی تجارت کو ختم کرنے کی تدابیر اختیار کر سکتے تھے۔ اور ان کے کرناٹک کے مقبوضات کی تجارتی اور سیاسی اہمیت کو گھٹا سکتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اس وقت خاموشی اختیار کی گئی تو فرانسیسی دکن اور کرناٹک میں پوری طرح حاوی ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب انھوں نے محمد علی کی مدد کرنی شروع کی اور اپنے مفاد کو اس کے مقاصد سے وابستہ کر لیا۔[1] ۱۷۴۹ء میں مدراس کونسل نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کو چاہیے کہ اپنی بہترین فوج کپتان کوپ کے تحت محمد علی کی امداد کے لیے فوراً ترچناپلی روانہ کر دیں تاکہ مظفر جنگ، چندا صاحب اور ان کے حامی فرانسیسیوں کا مقابلہ ممکن ہو سکے۔[2] محمد علی نے سینٹ فورٹ ڈیوڈ کے قریب انگریزوں کو دو گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ انگریزی فوج کے سہارے محمد علی ترچناپلی کے قلعے میں مع اپنے خاندان اور خزائن کے جو اس کے باپ نواب انورالدین خاں نے چھوڑے تھے قلعہ بند ہو کر مظفر جنگ اور چندا صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن مظفر جنگ اور چندا صاحب نے باوجود ڈوپلے کی تاکید کے تنجور کے محاصرے میں بہت وقت ضائع کر دیا۔ ڈوپلے اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جب تک ترچناپلی فتح نہ ہوگا اس وقت تک چندا صاحب کی کرناٹک کی نوابی معرض خطر میں رہے گی راجۂ تنجور نے چندا صاحب سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر کے کئی مہینے اور ضائع کرا دیے۔ چندا صاحب نے اس سے چار کروڑ روپے کا مطالبہ کیا تھا لیکن راجا ادائگی پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے محمد علی سے کمک طلب کی۔ محمد علی نے تھوڑی بہت مدد کی اور ناصر جنگ کے حملے سے کرناٹک کے حالات کے بدلنے کی امید دلائی۔ بالآخر چندا صاحب کے ساتھ موسیو ڈیوکین کی سرکردگی میں

---

[1] Country Correspondence, 1749.

[2] Fort St. David Consultations, October, 2, 1749.

جو فرانسیسی فوج تھی وہ پچھلے کئی ماہ کی بیکاری اور بدانتظامی سے بیزار ہوگئی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پانڈی چری واپس نہ چلی جائے۔ بالآخر فرانسیسی فوج کی مدد سے چندا صاحب نے تنجور کے قلعے کی سخت گولا باری کی اور راجا کو مجبور کیا کہ وہ جلد معاملات طے کرے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے چندا صاحب کو ۷۰ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا اور اس کو کرناٹک کا نواب تسلیم کر لیا جس کو آئندہ وہ پابندی سے محاصل کی رقم ادا کیا کرے گا۔ راجا نے فرانسیسی فوج کو دو لاکھ روپے نقد ادا کیے اور فرانسیسیوں کو کاریکال کے قریب ۸۱ گاؤں بطور معافی عطا کیے۔ چندا صاحب سے یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ ۷۰ لاکھ کی رقم بااقساط ادا کی جائے گی۔ ادھر چندا صاحب راجۂ تنجور سے معاملات طے کر رہا تھا اور ادھر ڈوپلے کو ناصر جنگ کے اورنگ آباد سے روانہ ہونے کی خبریں مل رہی تھیں جن کے سبب سے وہ سخت پریشان تھا۔ اس نے چندا صاحب کو پے در پے خطوط لکھے کہ تنجور کے قضیے کو جلد سے جلد ختم کر کے ترچناپلی پر چڑھائی کر دو۔ لیکن ان تمام معاملات میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ ناصر جنگ اپنے زبردست لشکر سمیت کرناٹک میں داخل ہو گئے۔ ڈوپلے نے فوراً مظفر جنگ اور چندا صاحب کو لکھا کہ جلد تنجور کے قلعے پر قبضے کی کوشش کی جائے تاکہ بعد میں وہ ناصر جنگ کے مقابلے میں کام آ سکے۔ لیکن مظفر جنگ اور چندا صاحب ناصر جنگ کے قریب پہنچ جانے کی خبر سے ایسے بدحواس ہوئے کہ مع فوج کے پانڈی چری روانہ ہو گئے۔

اس عرصے میں انگریز اور نواب محمد علی خاں ناصر جنگ کو لکھتے رہے کہ کرناٹک پر یہی وقت حملے کا ہے تاکہ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے اپنا اقتدار تسلیم کرانے سے پیشتر ہی ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا جائے۔ ورنہ اگر ایک مرتبہ چندا صاحب نے کرناٹک کے تمام فوجداروں اور زمینداروں سے اپنی حیثیت منوالی تو اس کو بے دخل کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ محمد علی نے بھی اصرار سے ناصر جنگ کو فوراً کرناٹک کی طرف توجہ کرنے کے لیے لکھا۔ چنانچہ ناصر جنگ نے جنوری ۱۷۵۰ء میں کرشنا کو پار کیا اور کرناٹک کے تمام فوجداروں اور زمینداروں کو مطلع کر دیا کہ وہ اپنی اپنی مقامی فوج کو

تیار رکھیں اور راستے میں ان سے آکر مل جائیں۔ مراری راؤ اور دوسرے مرہٹہ سردار بھی ناصر جنگ کی کرناٹک کی مہم میں ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ مراری راؤ نے چدمبرم کے قریب مظفر جنگ کی فرانسیسی فوج کو آلیا جب کہ وہ تنجور سے پانڈی چری واپس ہو رہی تھی لیکن فرانسیسیوں کے پاس زبردست توپ خانہ تھا ان کے گولہ اندازوں نے مرہٹوں کو پاس پھٹکنے نہ دیا۔ چندا صاحب پہلے پانڈی چری پہنچے۔ ڈوپلے نے اس کو ۵۰ ہزار پونڈ کی رقم کمپنی کے خزانے سے قرض دی اور تازہ دم دو ہزار فرانسیسی فوج موسیو دوتی کی سرکردگی میں اسکے ساتھ دے کر ولیانور روانہ کر دیا جہاں مظفر جنگ کی فوج پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔

کرناٹک پہنچ کر ناصر جنگ نے محمد علی کو مشورے کے لیے ترچناپلی سے بلا بھیجا اور انگریزوں کو کمک کے لیے لکھا۔ کرناٹک کے ان فوجداروں کو جو اب تک ان سے آکر نہیں ملے تھے ہدایت کی گئی کہ جنجی کے پاس آکر سب جمع ہو جائیں۔ ناصر جنگ کی کل فوج کی تعداد ۳ لاکھ تک پہنچ گئی تھی جس میں سے نصف سوار تھے اور نصف پیدل، ۸۰۰ توپیں تھیں اور تیرہ سو ہاتھی[1]۔ انگریزوں نے صرف ۶۰۰ آدمیوں کی کمک بھیجی جو ونڈالور کے مقام پر ناصر جنگ سے مل گئی یہاں لارنس ڈالٹن کی سفارت ناصر جنگ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ضروریات اور مفاد کے متعلق اپنے معروضات پیش کیے جن کی نسبت کوئی قطعی جواب ناصر جنگ کی جانب سے نہیں دیا گیا۔ لارنس نے ناصر جنگ کو مشورہ دیا کہ پانڈی چری پر چڑھائی کر دی جائے لیکن ناصر جنگ اور ان کے مشیروں کی رائے ہوئی کہ مقابلے کے لیے ولیانور کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ یہاں مظفر جنگ اور چندا صاحب مع فرانسیسی فوج ماہ اپریل سنہ ۱۷۵۰ء ناصر جنگ کے مقابلے پر آئے۔ دونوں طرف سے گولا اندازی ہوئی فرانسیسی فوج میں کچھ ایسی بد دلی پھیلی ہوئی تھی کہ اس کے پیر اکھڑ گئے۔ ناصر جنگ کی فوج نے پانڈی چری تک فرانسیسیوں کا پیچھا کیا۔ اس ہڑبونگ میں فرانسیسی

[1] Orme, Ibid, Vol. 1, P. 138.

منظفر جنگ کو پیچھے چھوڑ گئے جنھیں ناصر جنگ کی فوج نے گرفتار کرلیا۔ منظفر جنگ نے ناصر جنگ کی اطاعت قبول کرلی اور وفاداری کے عہد و پیمان پر ان کی جاں بخشی کی گئی۔
اس موقع پر فرانسیسی فوج میں بددلی کا اصلی سبب یہ تھا کہ تجوڑ سے جو فرانسیسی افسر اور سپاہ پانڈی چری آئی تھی وہ خوب انعام و اکرام سے لدی پھندی آئی تھی۔ دلوپلے نے ان کی بجائے دوسری سپاہ اور دوسرے افسر موسیو دوتی کی سرکردگی میں ناصر جنگ کے مقابلے کے لیے روانہ کیے۔ انھیں دیوپلے سے شکایت تھی کہ جان دینے کے لیے ہم لوگوں کو بھیجا گیا اور انعام و اکرام کے لیے دوسروں کو بھیجا گیا۔ چنانچہ جس وقت ناصر جنگ سے مقابلہ ہوا تو ۱۳ افسروں نے اپنے کمیشن واپس کر دیے۔ عین معرکے کے وقت جب موسیو دوتی نے دیکھا کہ فرانسیسی فوج کا دل لڑائی میں نہیں ہے تو اس نے پانڈی چری واپس جانے کا حکم دے دیا۔ منظفر جنگ اور چندا صاحب کو اگرچہ فرانسیسی افسروں اور سپاہ کی بددلی کا علم تھا لیکن انھیں یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ انھیں اس طرح بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلتی بنے گی۔ انھوں نے دوتی کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا کہ باقی جو فوج ہے اس سے ناصر جنگ کا مقابلہ کرے لیکن اس کی ہمت نہ بندھی اور اس نے راتوں رات پیچھے ہٹ کر پانڈی چری میں پناہ لینے کا تہیہ کر لیا۔[له]

ناصر جنگ نے ونڈالور کے مقام پر جب پڑاؤ ڈالا تھا تو اس وقت سے ان کے اور منظفر جنگ کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دونوں طرف سے ایلچی آنے جانے لگے تھے۔ ناصر جنگ نے وعدہ کیا کہ بیجا پور اور ادھونی میں منظفر جنگ کے جو حقوق ہیں وہ ان پر بحال کر دیے جائیں گے اور ان کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیا جائے گا۔ لیکن منظفر جنگ کو اپنے فرانسیسی حمایتیوں پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ مصالحت کی کوئی کوشش بارآور نہ ہو سکی۔ لیکن عین معرکے کے وقت فرانسیسی فوج کے پانڈی چری چلے جانے پر انھوں نے اپنے تئیں ناصر جنگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چندا صاحب کی طرح اگر وہ چاہتے تو فرانسیسی فوج کے ساتھ

له - Orme, Ibid.1, P 140; Wlik's Historical Sketches of the South of India 1; P.263

بچ نکلتے اور پانڈی چری چلے جاتے۔ لیکن غالباً ناصر جنگ کے زبردست لشکر اور ان کی تیاریوں کو دیکھ کر وہ مرعوب ہو گئے، اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ فرانسیسی ناصر جنگ کو شکست نہیں دے سکیں گے۔

ناصر جنگ کے مقابلے سے اس طرح راتوں رات فرار ہو جانے سے فرانسیسیوں اور خاص طور پر ڈیوپلے کی بہت سبکی ہوئی۔ لیکن ڈیوپلے کا مزاج کچھ اس قسم کا تھا کہ جس قدر سخت پریشانیوں کا اس کو سامنا کرنا پڑتا تھا اسی قدر اس کی سیاست کاری اور تدبر کے جوہر نکھرتے تھے۔ اس نے فوراً ناصر جنگ سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر دیا اور انھیں لکھا کہ میں نے فرانسیسی سپاہ کو واپس بلا لیا ہے تاکہ ہمارے اور آپ کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے اور کرناٹک کے متعلق کوئی قطعی تصفیہ کرنے میں سہولت ہو۔ خود ناصر جنگ کے دربار میں بعض ایسے امرا موجود تھے جو چاہتے تھے کہ فرانسیسیوں سے سمجھوتہ ہو جائے اور مظفر جنگ کو ان کی سابق خدمت پر بحال کر دیا جائے۔ ان لوگوں کی کوشش سے ناصر جنگ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ فرانسیسی سفارت کو شرف باریابی بخشیں۔ چنانچہ آنری دے لارش اور موسیو ڈیوتو سے پانڈی چری سے ناصر جنگ کے لشکر میں گفت و شنید کے لیے آئے۔ موسیو ڈیوتو سے فارسی زبان پر پوری قدرت رکھتا تھا اور اچھی طرح گفتگو کر سکتا تھا۔ جب نواب نظام الملک آصف جاہ اول ۱۷۴۳ء میں کرناٹک تشریف لے گئے تو وہ فرانسیسی سفارت کا بہ حیثیت ترجمان رکن تھا۔ سفارت نے مظفر جنگ کے لیے ادھونی اور رخیندا صاحب کے لیے ارکاٹ کی نوابی کا مطالبہ کیا۔ فرانسیسی سفارت نے ناصر جنگ سے گفت و شنید کے دوران میں کڑپہ، کرنول اور ساونور کے نوابوں سے خاص تعلقات پیدا کر لیے اور ناصر جنگ کے دربار میں جو مختلف پارٹیاں تھیں ان کے اثر کا صحیح اندازہ کر لیا۔ یہ تینوں نواب ناصر جنگ کے سلوک سے مطمئن نہیں تھے۔ اس گفت و شنید کے ذریعے ڈیوپلے نے ناصر جنگ کے لشکر میں اک گونہ اطمینان کی کیفیت پیدا کر دی اور

Lettres edifiantes et curieuses (ed, Aime-Martin) Vol. 11, P. 735. - لے

اس کے ساتھ حملے کی تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ لاتوش کی سرکردگی میں رات کے وقت ایک دم سے فرانسیسیوں نے ناصر جنگ کے لشکر پر حملہ بول دیا۔ یہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ ناصر جنگ کے تمام لشکر میں حیرانی اور سراسیمگی پھیل گئی۔ ناصر جنگ پیچھے ہٹ کر ارکاٹ میں خیمہ زن ہو گئے تاکہ موسم گرما وہاں گزاریں۔ مگر یہ فرانسیسیوں کے اس حملے سے کوئی اہم نتیجہ نہ نکلا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ان کی سپاہ نے اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کر لیا۔

اب تک انگریزوں نے ناصر جنگ کو جو امداد بھیجی تھی وہ اتنی کم تھی کہ اس کا ناصر جنگ پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوا۔ پھر انگریز اس تھوڑی سی مدد کے بہانے کرناٹک میں جو خاص مراعات ناصر جنگ سے چاہتے تھے وہ بھی انھیں حاصل نہ ہو سکیں۔ لارنس نے ہر چند کوشش کی کہ محمد علی نے مدراس اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے قریب جو علاقے انگریزوں کو عطا کیے ہیں ان کی توثیق ناصر جنگ سے حاصل کریں لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ناصر جنگ کے دیوان صمصام الدولہ شاہ نواز خاں نے ان کی اس کوشش کو بار آور نہیں ہونے دیا۔ اور کہا کہ یہ درخواست اس وقت منظور ہوگی جب کہ انگریزی فوج ناصر جنگ کے ساتھ ارکاٹ میں اس وقت تک رہے جب تک کہ کرناٹک کی نوابی کا کوئی قطعی تصفیہ نہ ہو جائے۔ لارنس یہ بھی چاہتا تھا کہ ناصر جنگ مدراس کونسل کے ریزیڈنٹ کو خلعت و خطاب سے سرفراز کریں جس طرح مظفر جنگ نے ڈیو پلے کو دریائے کرشنا کے جنوب میں اپنا نائب مقرر کرتے وقت صفدر جنگ کا خطاب دیا تھا۔ اور اس عزت افزائی کے ضمن میں کرناٹک میں کچھ اور علاقے عطا کیے جائیں تاکہ اہل ہند کی نظروں میں انگریزی قوم کے وقار میں اضافہ ہو اور ناصر جنگ کو مدد دینے کے سلسلے میں جو فوجی خرچہ ہوا اس کی پابجائی ہو سکے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ناصر جنگ کی خدمت میں جو تحفے تحائف پیش کیے گئے ان کی قیمت سات ہزار پونڈ (تقریباً ۱۸ ہزار پگوڈا) بتائی جاتی ہے۔[1]

شاہ نواز خاں کی خلل اندازی کی وجہ سے لارنس کی کوششیں جب ناکام رہیں

[1] Fort St. David Consultations, March 3, 1750.

اور اس کو ناصر جنگ سے کوئی خاص توقع باقی نہیں رہی تو اس نے انگریزی فوج کو فورٹ سینٹ ڈیوڈ واپس جانے کا حکم دے دیا۔ لارنس کا بیان ہے کہ ناصر جنگ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انگریزی فوج کا خرچہ برداشت کریں گے۔ لیکن چونکہ ناصر جنگ نے ایسا کرنے کی بجائے حیلے حوالے شروع کر دیے اس لیے کوئی ضرورت نہیں کہ انگریزی فوج انکی مدد کے لیے ان کے ساتھ رہے[1]۔ اس ضمن میں یہ عجیب بات ہے کہ انگریز سمجھتے تھے کہ ناصر جنگ کے دیوان شاہ نواز خاں ان کی مخالفت کر رہے ہیں اور فرانسیسی یہ خیال کرتے تھے کہ وہ انگریزوں کے حامی ہیں[2]۔

ارکاٹ پہنچ کر ناصر جنگ نے اپنا وقت عیش و عشرت میں ضائع کیا حالانکہ چندا صاحب اور فرانسیسی برابر اپنی تیاریوں اور جوڑ توڑ میں مشغول رہے۔ ناصر جنگ کے حکم کے بموجب فرانسیسیوں کی مسولی پٹم اور ینام کی کوٹھیاں ضبط کر لی گئیں اور ان کے ملازموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈیو پلے نے لاتور کے تحت پانڈیچری سے دو سو سپاہ روانہ کی جس نے مسولی پٹم پر پھر قبضہ کر لیا۔ ڈیو پلے نے مظفر جنگ کی عطا کے بموجب چدم برم۔ تروتی۔ ولیانلور اور باھور پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان مقامات پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے سے محمد علی کو پریشانی شروع ہوئی کہ کہیں اسی طرح آہستہ آہستہ فرانسیسیوں اور چندا صاحب کا قبضہ و تصرف مختلف مقامات پر قائم ہو گیا تو بعد میں انھیں بے دخل کرنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ انگریزوں نے بے تعلقی کا جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ ان کے مفاد کے خلاف تھا اور اس میں ان کا سخت نقصان تھا کہ وہ فوری فائدے کو دیکھیں اور دور اندیشی سے کام نہ لیں محمد علی نے بڑی کوشش سے انگریزوں کو آمادہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کے خلاف اس کی مدد کریں۔ اس نے انگریزی فوج کے سب اخراجات برداشت کرنے کا

[1] Lawrence's Narrative of the War on the Coast of Coromandal, P. 10, (ed. by Cambridge)

[2] *Memoire pour le Sieur Dupleix, P. 55, Fort St. David Consultations, April 24, 1750.*

وعدہ کیا۔ چنانچہ کپتان کوپ کے تحت ... ۶ گورے اور ایک توپ خانہ محمد علی کی مدد کیلیے فورٹ سینٹ ڈیوڈ سے بھیجے گئے۔ اس کے مقابلے کے لیے فرانسیسی افسر لاتوش تھا جس کے ساتھ ... ۵ گورا فوج تھی۔ دونوں فوجوں میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن کوئی فیصلہ کن لڑائی کی نوبت نہیں آنے پائی۔ کپتان کوپ نے جب محمد علی سے اپنی فوج کی تنخواہ طلب کی تو اس سے ادا نہ ہو سکی۔ اس پر میجر لارنس محمد علی سے بہت ناراض ہوا اور کپتان کوپ کو انگریزی فوج سمیت فورٹ سینٹ ڈیوڈ واپس بلا لیا۔ انگریزی فوج کے واپس جاتے ہی دوپلے نے ترنی وادی کے قریب فوج جمع کر کے محمد علی پر پے در پے حملے کیے اور اس کی ساری توپیں چھین لیں۔ اب دوپلے نے بسی اور دتی کو مزید فوج دے کر جنجی کی طرف روانہ کیا جہاں محمد علی کی بارہ ہزار فوج قلعہ بند ہو گئی تھی۔ فرانسیسی فوج نے بسی کی سرکردگی میں جنجی کے قلعے کو راتوں رات سیڑھیوں سے چڑھ کر فتح کر لیا۔ یہ قلعہ جنوبی ہند کا نہایت ہی مستحکم اور ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کامیابی سے انگریزوں اور ناصر جنگ کو تشویش پیدا ہوئی۔ ناصر جنگ نے سوچا کہ اب معاملات کی یکسوئی ہو جانی چاہیے۔ یا تو فرانسیسیوں سے صلح کر لی جائے یا انھیں نیچا دکھایا جائے۔ ناصر جنگ کا لشکر ارکاٹ کے جنوب میں جنجی کے موجیے کی طرف بڑھنے لگا تا کہ اس کو تسخیر کیا جائے۔ راستے میں بارش سخت ہوئی۔ دریا چڑھ گئے۔ فوج کے لیے کھانے پینے کا سامان پہلے ہی سے کم تھا۔ اس طوفانی بارش میں کہیں سے فوج کے لیے مزید رسد فراہم کرنا ممکن نہ تھا۔ جنجی کے قریب جہاں ناصر جنگ کی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا وہاں بارش کے سبب سے دو مہینے یوں ہی بیکار پڑی رہی۔ اس عرصے میں دربار کے بعض امرا کے اثر سے دونوں جانب سے ایلچیوں کی آمد و رفت پھر شروع ہو گئی۔ ان دو مہینوں میں دوپلے نے ناصر جنگ کے بعض امرا اور مرہٹوں کو توڑ لیا۔ خاص طور پر کڑپہ کرنول اور ساونور کے نوابوں سے دوپلے نے خفیہ طور پر خوب تعلقات بڑھا لیے۔ ان سے دوپلے نے یہ طے کر لیا کہ اگر ناصر جنگ فرانسیسیوں کی شرطوں کو تسلیم کرنے سے انکار کریں اور جنگ کی نوبت آئے تو وہ عین معرکے میں فرانسیسیوں سے مل جائیں۔ اس تمام کارروائی کی تفصیلات طے ہو گئیں یہاں تک کہ ایک فرانسیسی سفید

جھنڈا بھی نوابوں کو خفیہ طور پر پہنچا دیا گیا جسے وہ لڑائی میں ناصر جنگ سے الگ ہو کر ایک ہاتھی پر بلند کر دیں[1]۔ ان نوابوں نے مظفر جنگ سے ساز باز کر لیا جو ناصر جنگ کے لشکر کے ساتھ قید میں تھا۔ اور اس سے یہ طے کر لیا کہ ناصر جنگ کا خزانہ نصف نصف نوابوں اور اس کے درمیان تقسیم کر لیا جائے گا۔ رام داس پنڈت اور صف شکن خان میر آتش بھی اس سازش میں شریک تھے۔

فرانسیسیوں اور ناصر جنگ کی فوجیں تقریباً دو مہینے ایک دوسرے کے قریب پڑی رہیں۔ جب موسم ذرا بہتر ہوا تو اقدام اور فیصلے کا وقت آ پہنچا۔ ناصر جنگ نے بالآخر ایلچیوں سے ڈوپلے کو کہلا بھیجا کہ اب وہ اس کی تمام شرطیں ماننے کو تیار ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ مظفر جنگ کو رہا کر دیں گے، مسولی پٹم فرانسیسیوں کے حوالے کر دیں گے اور چندا صاحب کو نواب ارکاٹ تسلیم کر لیں گے[2]۔ ناصر جنگ کا ایلچی ڈوپلے کے پاس ابھی پہنچا ہی تھا کہ لاتوش نے ۱۶ دسمبر ۱۷۵۰ء کی صبح تڑکے ناصر جنگ کے لشکر پر ہلہ بول دیا۔ کڑپہ، کرنول اور ساونور کے نوابوں کی فوج کھڑی تماشا دیکھتی رہی اور جب ناصر جنگ کی فوج میں سراسیمگی پھیلی تو انھوں نے فرانسیسی جھنڈا بلند کر دیا۔ بقول سرو آزاد[3] جب ناصر جنگ کا ہاتھی ہمت خاں نواب کرنول کے ہاتھی کے پاس تھا تو ناصر جنگ نے عماری سے بلند ہو کر اپنی سپاہ کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمت خاں اور اس کے ساتھیوں نے اس وقت کئی فیر کیے جو ناصر جنگ کے سینے پر پڑے۔ ناصر جنگ کے شہید ہونے کی خبر سے جو رسالہ دار اور بخشی اب تک

---

[1] Cultru, Dupleix, ses idees, sa politique et sa chute, p. 251.

[2] Martineau, Dupleix et l'Inde Francaise, III. p. 142, 143.

[3] سرو آزاد صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۹۔ یہی واقعات کم و بیش دوسری ہمعصر کتب مثلاً خزانۂ عامرہ مآثر الامرا اور تاریخ راحت افزا میں ملتے ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے مصنف میر غلام علی آزاد بلگرامی، شاہ نواز خاں صمصام الدولہ اور محمد علی الحسینی برہان تمام واقعات کے عینی شاہد تھے۔

مقابلہ کر رہے تھے، ان کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ مظفر جنگ کی صوبہ داری کا اعلان کر دیا گیا۔ یہاں سے مظفر جنگ سیدھے پانڈی چری روانہ ہوئے جہاں بڑے تزک و احتشام سے ان کا استقبال کیا گیا۔ بڑی دھوم دھام سے مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی کئی روز تک عیش و نشاط کی محفلیں گرم رہیں۔ مظفر جنگ نے فرانسیسی افسروں اور سپاہ کو خوب دل کھول کر انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ جب مظفر جنگ پانڈی چری میں داخل ہوئے تو ناصر جنگ کا سارا خزانہ ان کے ساتھ تھا۔ اٹھارہ صندوق جواہرات کے اور ایک کروڑ روپیہ نقد تھا۔ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کے اعلیٰ افسروں سے لے کر ادنیٰ سپاہیوں تک کو اتنا دیا جتنا ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ڈیوپلے کو دریائے کرشنا سے لے کر راس کماری تک کے تمام علاقے کا نائب مقرر کیا گیا اور چندا صاحب کو بھی اس کے تحت ارکاٹ کا نواب تسلیم کیا گیا۔ ڈیوپلے کو ہفت ہزاری منصب اور ماہی مراتب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کی بیوی کو جہاں آرا بیگم کا خطاب ملا۔ ڈیوپلے کو اس موقع پر جو خلعت دیا گیا تھا اس کو زیب تن کر کے وہ مغل امرا کی صورت بنا کر مظفر جنگ کے دربار میں حاضر ہوتا اور سر جھکا کر مجرا بجا لاتا تھا۔ پانڈی چری کی ٹکسال میں جو فرانسیسی روپیہ بنایا جاتا تھا اس کا رواج سارے کرناٹک میں منظور کیا گیا۔ فرانسیسی کمپنی کو اس موقع پر ساڑھے تین لاکھ روپے سالانہ آمدنی کا علاقہ کرناٹک میں عطا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کے لیے یہ تمام انتظام سخت نقصان رساں تھے اس واسطے کہ جن علاقوں میں ان کی تجارت تھی ان میں سے بعض فرانسیسیوں کے تحت آ گئے تھے۔ اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ چاروں طرف سے فرانسیسی علاقوں سے گھر گیا تھا۔ فورٹ سینٹ ڈیوڈ کی کپڑے کی تجارت کا دار و مدار ان کپڑا بننے والوں پر تھا جو فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے نواح میں ہر طرف آباد تھے۔ ان علاقوں کے فرانسیسیوں کے تحت آ جانے کا یہ مطلب تھا کہ فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے انگریزوں کی کپڑے کی تجارت ختم ہو جائے گی۔ غرضکہ ان حالات میں یہاں اب انھیں وہ مراعات اور سہولتیں حاصل نہیں رہیں گی جو پہلے حاصل تھیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ دریائے کرشنا کے جنوب میں تمام علاقوں کی مالگزاری ڈیوپلے کے توسط سے صوبہ دارِ دکن کو ادا کی جائے گی۔ یہ بات کٹرپ

کرنول اور ساونور کے نوابوں کو بہت ناگوار گزری۔ اس واسطے کہ وہ تو اس امید میں تھے کہ نئے انتظام کے تحت ان کی حیثیت کچھ بلند ہو جائے گی۔ لیکن ان کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ پھر ان کے ساتھ دیوپلے اور مظفر جنگ نے جو وعدے کیے تھے وہ بھی پورے نہیں کیے گئے۔

دیوپلے سے عہد و پیمان پکا کرنے کے بعد مظفر جنگ پانڈی چری سے دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ تین سو فرانسیسی گورا فوج اور دس ہزار قواعد داں دیسی فوج بھی اور ڈیڑھ سو توپیں تھیں۔ موسیو بسی کو دیوپلے نے اس فوج کا اعلیٰ افسر اور مظفر جنگ کا مشیر مقرر کیا جس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ملے یا اس نے حاصل کر لیے۔ مظفر جنگ نے موسیو بسی کو سیف الدولہ عمدۃ الملک کا خطاب ہفت ہزاری منصب مع علم و نقارہ اور ماہی مراتب عطا کیا۔ دیوپلے نے اس موقع پر مظفر جنگ کو راستے کے خرچ کے لیے ایک کروڑ روپیہ قرض دے کر اس کے بدلے میں قیمتی جواہرات کے صندوق اپنے پاس رکھ لیے۔ موسیو بسی کو تین لاکھ روپے بطور انعام دیے گئے، اور جو فرانسیسی سپاہ اس کے ساتھ مظفر جنگ کی حفاظت کے لیے روانہ کی گئی تھی۔ اس کے ہر سپاہی کو تین مہینے کی تنخواہ پیشگی اور حیثیت کے موافق انعام و اکرام بھی دیا گیا[1] یہ بھی طے ہوا تھا کہ بسی مظفر جنگ کے ہمراہ حیدر آباد تک جائے اور وہاں سے مسولی پٹم چلا جائے۔

دیوپلے نے کرڈپہ، کرنول اور ساونور کے نوابوں کے ساتھ ساز باز کیا تھا تو ان سے وعدہ کیا تھا کہ ناصر جنگ کی دولت میں سے انھیں بھی حصہ ملے گا۔ لیکن مظفر جنگ کی صوبہ داری کے اعلان کے بعد ان نوابوں کو دیوپلے نے کچھ بھی نہیں دیا۔ اس پر ظاہر ہے کہ وہ بہت برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ سب کچھ تو ہم نے کیا لیکن فائدہ دوسروں نے اٹھایا۔ مظفر جنگ کی وعدہ خلافی سے خاص طور پر وہ بہت ناراض تھے اور انتقام لینے کی فکر میں تھے۔ دیوپلے کی

---

[1] Cultru, Dupleix. ses idees, sa politique et ▪ chute, p. 261.

یہ غلطی تھی کہ وہ سمجھا کہ باوجود غیر مطمئن ہونے کے وہ کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے لیکن انھوں نے مظفر جنگ سے اپنا بدلہ لے لیا۔ مظفر جنگ جب نواب کرڑپہ کے علاقے میں داخل ہوئے تو ان کے خلاف بھی اس نے اسی طرح سازش کی جس طرح ان کے ماموں ناصر جنگ کے خلاف کی تھی۔ مظفر جنگ پر اچانک حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا گیا۔ اس سے سارے لشکر میں ہل چل پڑ گئی۔ مظفر جنگ کی بیوی نے اپنے نوعمر فرزند کو فرانسیسیوں کے سپرد کر دیا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اسے باپ کا جانشین بنا دیا جائے۔ لیکن بسی نے سوچا کہ اگر اس کو جانشین بنا دیا گیا تو بڑی سخت سازشیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس نے نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل کے تیسرے بڑے بیٹے آصف الدولہ صلابت جنگ کو شاہ نواز خاں کے مشورے سے مسند نشین کر دیا۔ فوج کو بھی یہ انتظام پسند آیا۔ ڈوپلے کو جب اس تمام واقعے کی اطلاع ہوئی تو اس نے بسی کے اس انتظام کی تعریف کی اور توقع ظاہر کی کہ نیا صوبہ دار ان تمام مراعات کی توثیق کر دے گا جو مظفر جنگ نے منظور کیے تھے۔ صلابت جنگ نے مسند نشین ہونے کے بعد راجا رام داس کو جسے مظفر جنگ نے راجا رگھوناتھ داس کا خطاب دیا تھا اپنا دیوان مقرر کیا راجا رگھوناتھ داس فرانسیسیوں کا خاص شخص تھا جس پر بسی کو بہت زیادہ اعتماد تھا۔ اس نے بھی اپنے سرپرست فرانسیسی افسروں کی خوشنودی کی پوری کوشش کی۔ موسیو بسی نے صلابت جنگ کے ساتھ دریائے کرشنا کو پار کیا تو مرہٹوں کو لڑائی کے لیے تیار پایا جو صلابت جنگ کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے بسی اگر چاہتا تو مرہٹوں سے لڑ کر انھیں نیچا دکھاتا لیکن پیشتر اس کے کہ دکن میں فرانسیسی اثر و رسوخ مستحکم ہو جائے لڑائی میں خواہ مخواہ پڑنے سے فرانسیسی قوم کو کوئی خاص فائدہ نہ تھا ان حالات میں صلابت جنگ نے بسی سے خواہش ظاہر کی کہ ابھی تھوڑے دنوں وہ اور اس کی حفاظت کیلئے دکن میں رہے۔ صلابت جنگ محسوس کرتے تھے کہ فرانسیسی امداد کے بغیر وہ اپنے دربار کی سازشوں اور مرہٹوں کے آئے دن کے نرغوں سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ پھر انھیں اپنے سب سے بڑے بھائی

غازی الدین فیروز جنگ کا بھی ڈر لگا ہوا تھا جو اگرچہ اس وقت دہلی میں تھے لیکن اس کا قوی امکان تھا کہ وہ دکن کی طرف رُخ کرنے کا ارادہ کر لیں۔

چند ہفتے حیدرآباد میں مقام کرنے کے بعد صلابت جنگ فرانسیسی فوج سمیت اورنگ آباد روانہ ہوئے اور ۱۸ ر جون ۱۷۵۱ء کو وہاں پہنچے۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے انتقال کے بعد تین سال سے دکن کی صوبہ داری کا مسئلہ معرضِ بحث میں پڑا ہوا تھا۔ اس موقع پر دور دور سے لوگ اورنگ آباد میں جمع ہو گئے تھے تاکہ نئے صوبہ دار سے اظہارِ اطاعت و وفاداری کریں اور دارالسلطنت کے جشن و جلوس میں شرکت کریں۔ مسند نشینی کی جب تمام رسوم پوری ہو چکیں تو بسی نے بھی صلابت جنگ سے خواہش ظاہر کی کہ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سولی ٹپم جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش کبھی منظور نہ ہو گی۔ اس طرح دراصل وہ صلابت جنگ کے دربار میں اپنی وقعت اور اہمیت کو بڑھانا چاہتا تھا اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوا۔ صلابت جنگ کی اس بے بسی کے احساس نے اس کو امورِ مملکت میں با اختیار بنا دیا اور فرانسیسی قوم کا اثر کئی سال تک کے لئے دکن کی سیاست میں مستحکم ہو گیا۔

مظفر جنگ نے جب ڈوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب میں اپنا نائب مقرر کیا تھا تو اس کے اختیارات کی پوری طرح وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ نہ اس بات کا تعین کیا گیا تھا کہ وہ دربارِ دکن کو کیا ادا کرے گا اور نہ یہ طے ہوا تھا کہ دربارِ دکن سے اس کو کیا ملے گا۔ اب جب کہ صلابت جنگ بخیر و عافیت اورنگ آباد پہنچ گئے اور موسیو بسی نے ان کے دربار میں اپنا رنگ جما لیا تو ڈوپلے نے پانڈی چری سے اس کو لکھا کہ جنوبی ہند اور دکن میں فرانسیسی فوج رکھنے کے جو اخراجات عاید ہوتے ہیں ان کی بابجائی کے سلسلے ایک لاکھ روپے ماہوار دربارِ دکن سے ملنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس نے کرشنا کے جنوب میں مالگزاری وصول کرنے کے لیے اپنے نائب مختلف علاقوں میں مقرر کر دیے تھے جو اس کے احکام کا نفاذ عمل میں

لاتے تھے۔ بسی کی کوشش سے صلابت جنگ نے بہ ذریعہ فرمان ڈیوپلے کو
صراحت کے ساتھ ارکاٹ، ترچناپلی اور مدورا کی مالگزاری وصول کرنے
کے حقوق عطا کیے۔ چنانچہ ڈیوپلے نے اپنی کمپنی کو اس کی نسبت اس طرح
لکھا تھا۔ "ان تمام واقعات میں سب سے اہم واقعہ آپ کو یہ ملے گا کہ
ترچناپلی، ارکاٹ اور مدورا میں ہمیں مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل
ہوگیا ہے۔ مجھے ان مراعات کی توقع نہ تھی لیکن یہ سب کچھ موسیو بسی کی
جد وجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کی بدولت ارکاٹ میں فرانسیسی اقتدار بتامہٖ قائم
ہو جائے گا اور فرانس کے شاہی خزانے کو ہمیں سالانہ جو رقم ادا کرنی چاہیے
اس کا تعین عمل میں آجائے گا۔ یہ مراعات فرانسیسی قوم کے لیے نہایت اہم
ہیں اور ضرورت ہے کہ ان کی نسبت غور و خوض کیا جائے۔ ان کی بدولت
یہ ہوگا کہ فرانسیسی کمپنی ہندوستان میں تجارت کے لیے جو سرمایہ بھیجا کرتی ہے
اس کی ضرورت آئندہ باقی نہ رہے گی۔"[۲]

سنہ ۱۷۵۲ء کے شروع میں بالاجی راؤ نے دکن پر حملہ کر دیا۔ بسی اور راس کی
فرانسیسی فوج نے اس کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ بالاجی راؤ نے ایک لاکھ
کا معاوضہ لے کر صلح کر لی۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب صلابت جنگ کے بڑے
بھائی غازی الدین خاں فیروز جنگ نے دکن پر چڑھائی کی تو بالاجی راؤ اور رگھوجی
بھونسلا نے اس کی امداد کا وعدہ کیا۔ بسی کو اس سے پریشانی ہوئی اور اس نے
ارادہ کیا کہ صلابت جنگ کو ساتھ لے کر مسولی پٹم چلا جائے۔ لیکن اسی اثنا میں
اس کو ڈیوپلے کا خط مل گیا جس سے اس کو معلوم ہوا کہ پانڈی چری سے کمک
روانہ کر دی گئی ہے۔ ڈیوپلے نے بسی کو یہ بھی لکھا کہ اگر کوئی اور صورت کارگر
نہ ہو تو غازی الدین خاں فیروز جنگ سے گفت و شنید کر کے صلابت جنگ کو

۱؎ Cultru, p: 268, 269.

۲؎ Archines de Colonies, Dupleix to the Company, quoted by Dodwell, Dupleix and Clive, p. 87.

کم سے کم اس کا نائب ہی تسلیم کرالینا۔ بشرطیکہ غازی الدین خاں ان سب مراعات کی توثیق کرنے پر آمادہ ہوں جو فرانسیسی قوم کو جنوبی ہند میں اس عرصے میں حاصل ہوگئی ہیں[1]۔ بسی صلابت جنگ کو ساتھ لے کر بیدر چلا گیا اور حالات کا انتظار کرنے لگا۔ غازی الدین خاں سے گفت وشنید کی نوبت نہیں آئی اس واسطے کہ ان کو اورنگ آباد میں زہر دے دیا گیا اور صلابت جنگ کے اقتدار کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ لیکن بسی کو راگھوجی بھونسلا سے ابھی نبٹنا باقی تھا جو اپنی فوج سمیت غازی الدین خاں کی مدد کو دکن کا رخ کر چکا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ غازی الدین خاں نے اس کی فوج کے اخراجات کی بابجائی کے لیے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرنا چاہیے۔ اس نے بسی کے پاس اپنے وکیل روانہ کیے۔ بالآخر اس شرط پر مصالحت ہوگئی کہ راگھوجی بھونسلا کو برار میں جاگیر عطا کردی جائے۔ غازی الدین خاں نے ۶۰ لاکھ روپے نقد کا جو وعدہ کیا تھا اس کا پورا کرنا صلابت جنگ کے لیے ناممکن تھا۔ چنانچہ اس مطالبے سے راگھوجی بھونسلا دست بردار ہوگیا۔

بسی اپنے مزاج کی ناسازی کے باعث کچھ عرصے کے لیے مسولی پٹم چلا گیا اور گوپلی اس کی جگہ صلابت جنگ کے دربار میں افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ بسی نے اس قدر دولت جمع کرلی تھی کہ اب وہ اطمینان سے فرانس جاکر اپنی زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن ڈیوپلے نے اس کو ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس واسطے کہ اس کی نظر میں اور کوئی فرانسیسی افسر اس وقت ہندوستان میں ایسا موجود نہ تھا جو دکن میں فرانسیسی اثر و رسوخ کو برقرار رکھ سکتا۔ بسی کی غیر موجودگی میں صلابت جنگ کے دربار میں فرانسیسیوں کے اثر کے خلاف سازش شروع ہوگئی۔ امرا اور عہدہ داروں کی ایک جماعت فرانسیسی اثر کو بری نظر سے دیکھتی تھی۔ سید لشکر خاں نے فرانسیسی سپاہ کو پریشان کرنے کے لیے تنخواہیں دلوانے میں

[1] Hamont: Dupleix d'apres sa correspondence inedite. p. 227.

چار ماہ کی تاخیر کرادی تاکہ ان میں بے چینی اور بد دلی پیدا ہو جائے۔ جب بسی کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو وہ دکن واپس آیا اور دیسی ساہوکاروں سے قرض لے کر اپنی سپاہ کی تنخواہیں دلوائیں۔ اب بسی نے سوچا کہ جب تک فوجی اخراجات کی بابجائی کے لیے مستقل علاقے حاصل نہ کر لیے جائیں جو فرانسیسیوں کے تصرف میں رہیں اس وقت تک یہی بد انتظامی جاری رہے گی۔ چنانچہ اس نے صلابت جنگ سے سیکاکول، ایلور، راجمندری اور گنٹور کی سرکاروں کا مطالبہ کیا جن کی مجموعی آمدنی ۲۱ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ صلابت جنگ نے اس مطالبہ کو منظور کر لیا اور شمالی سرکاروں پر فرانسیسی تصرف و اقتدار قایم ہو گیا۔ یہ چاروں سرکارین بسی کو شخصی طور پر عطا کی گئی تھیں نہ کہ فرانسیسی کمپنی کو لیکن بسی نے انھیں کمپنی سے متعلق کر کے انکی آمدنی حاصل کرنیکا کمپنی کو مجاز کر دیا۔ یہ دکن میں فرانسیسی اثر کی ترقی کا انتہائی نقطہ تھا۔ بسی کے خلاف نظام علی خاں اور شاہ نواز خاں نے جو ترکیبیں کی ان کا اس نے بڑی کامیابی سے کاٹ کیا اور صلابت جنگ پر پہلے سے بھی زیادہ اثر قائم کر لیا۔ لیکن عنقریب کرناٹک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اسکی بدولت فرانسیسی زیادہ عرصے تک دکن میں اپنا اثر و رسوخ قایم نہ رکھ سکے۔

انگریز اب زیادہ عرصہ تک اہل فرانس کی ترقی کو غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

تیسرا باب

جنوبی ہند اور دکن میں فرانسیسیوں کے

مقابلے میں انگریزوں کی کامیابی

اب انگریزوں کے دل میں اپنے مستقبل کی طرف سے دغدغہ پیدا ہوا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دکن کی صوبہ داری کے لیے فرانسیسیوں نے اپنے امیدوار کو کامیاب کرا کے خود نہایت اہم مراعات حاصل کرلی ہیں جن سے انگریزی مفاد کو براہ راست ٹھیس لگنا لازمی ہے۔ اب اگر کرناٹک میں چندا صاحب کی نوابی مضبوط بنیادوں پر قایم ہوگئی تو جنوبی ہند میں بھی ان کی تجارت ختم ہو جائے گی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دریائے کرشنا کے جنوب میں ڈیوپلے کو صلابت جنگ نے اپنا نائب مقرر کر دیا ہے۔ بالآخر مدراس کونسل کے نئے صدر مسٹر سانڈرس نے ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے جو انگریزوں کے لیے آئے دن پیدا ہو رہے تھے محمد علی کو تاکید کر دی کہ وہ ڈیوپلے کے جنوبی ہند کے انتظامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ اس نے

محمد علی کو کافی مدد دینے اور انگریزی کمپنی کو اس کے مفاد سے وابستہ کرنے کا وعدہ کیا۔ سانڈرس نہایت قابل، معاملہ فہم اور دور اندیش شخص تھا۔ اس نے خیال کیا کہ کرناٹک میں انگریزوں کے رہے سہے اثر کو برقرار رکھنے کی صرف یہ صورت ہے کہ محمد علی کو ترچناپلی میں اتنی کمک بھیجدی جائے کہ وہ چندا صاحب اور اس کے فرانسیسی حامیوں کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ فروری ۱۷۵۱ء میں انگریزی فوج ترچناپلی پہنچ گئی۔ بیشتر اس کے کہ چندا صاحب وہاں پہنچے جیسا کہ سانڈرس کا خیال تھا چندا صاحب نے ارکاٹ سے روانہ ہو کر ۱۲ ہزار سوار اور ۵ ہزار پیدل سے ترچناپلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی مدد کے لیے فرانسیسی فوج دوتینی کی سرکردگی میں موجود تھی۔ ترچناپلی کے آس پاس کے تمام علاقوں پر جو محمد علی کے تحت تھے چندا صاحب نے قبضہ کر لیا اور محمد علی کی آمدنی کے کل ذریعوں کو ختم کر دیا۔ محمد علی اور انگریزی فوج ترچناپلی میں بری طرح سے گھری پڑی تھی۔ نوجوان کلائیو نے سانڈرس کو ایک تدبیر سجھائی تاکہ ترچناپلی کے محاصرے کی طرف سے چندا صاحب کی توجہ کچھ ہٹ جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ترچناپلی کے محاصرے میں چندا صاحب اور اس کے فرانسیسی حامیوں کو حسب دلخواہ کامیابی ہو گئی تو انگریزوں کی کرناٹک میں کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ کلائیو کی تجویز یہ تھی کہ فورٹ سینٹ ڈیوڈ میں انگریزوں کی جتنی سپاہ موجود تھی اس سے ارکاٹ پر پیشقدمی کر دی جائے۔ اس فوج کے آٹھ افسروں میں سے چھ ایسے تھے جنھوں نے اب تک کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے ساتھ صرف تین توپیں تھیں۔ اس ساز و سامان کے ساتھ کلائیو نے ۲۶ اگست ۱۷۵۱ء کو مدراس سے کوچ کیا اور ۳۱ دسمبر ۱۷۵۱ء ارکاٹ کے قریب دس میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالدیا۔ راستے میں اپنے نوسکھ سپاہیوں کو قواعد پریڈ بھی سکھاتا گیا تاکہ معرکہ میں کام آئے۔ ارکاٹ کے قلعے میں اگرچہ فوج کی تعداد کافی تھی لیکن اس کی کیفیت بے قاعدہ فوج کی سی تھی۔ کلائیو کے وہاں پہنچنے سے قلعے میں ایسی بدحواسی پیدا ہوئی کہ فوج قلعہ چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئی۔ یہ حال دیکھکر کلائیو نے بلا کسی مزاحمت کے ارکاٹ کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور قلعہ بند ہو کر اپنی چھوٹی سی فوج کی حفاظت کی تدابیر میں

مشغول ہوگیا۔ اس کا اصلی مقصد تو حاصل ہوگیا۔ ارکاٹ کے فتح ہوجانے کی خبر جب چندا صاحب کو ہوئی تو اس نے وہی کیا جو کلائیو کے پیش نظر تھا۔ اس نے ترچناپلی کا محاصرہ کرنے والی فوج میں سے چار ہزار سپاہ اپنے بیٹے رضا صاحب کے تحت ارکاٹ روانہ کردی۔ کلائیو کو ارکاٹ کے قلعہ میں کافی سامان جنگ و رسد مل گیا تھا۔ اس کو پورا بھروسہ تھا کہ چندا صاحب کی فوج اس کو قلعے سے بے دخل نہیں کر سکے گی۔ رضا صاحب نے ارکاٹ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ کئی دن تک دونوں طرف سے گولہ باری جاری رہی۔ اس اثنا میں سانڈرسن نے کلائیو کو مزید کمک روانہ کردی۔ مراری راؤ حاکم گوٹی نے بھی جسے اب انگریزوں نے محمد علی کی مدد پر آمادہ کرلیا تھا کلائیو کو وقت پر مدد بھیجدی۔ اس کمک کو دیکھکر رضا صاحب بہت گھبرا گیا۔ اور پریشانی کے عالم میں قلعہ ارکاٹ کا محاصرہ اٹھالینے کا حکم دے دیا۔ کلائیو کی اس حیرت انگیز کامیابی نے کرناٹک کی سیاست کا پانسہ پلٹ دیا۔

کلائیو نے ارکاٹ کے قلعے میں اپنے ایک افسر کرک پیٹرک کو چھوڑا اور خود فورٹ سینٹ ڈیوڈ روانہ ہوگیا تاکہ وہاں پہنچکر ترچناپلی کی مہم کی کوئی تدبیر کرے۔ اب لارنس بھی انگلستان سے واپس آچکا تھا۔ سانڈرسن نے کلائیو کو لارنس کی سرکردگی میں ترچناپلی کی محاصرہ کرنے والی فوج پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ ڈیوپلے کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے لاءؔ کو جو ترچناپلی کا محاصرہ کرنے والی فرانسیسی فوج کا اعلیٰ افسر تھا لکھا کہ لارنس اور کلائیو کے تحت سانڈرسن نے جو کمک روانہ کی ہے اس سے راستہ ہی میں مقابلہ کیا جائے پیشتر اس کے کہ وہ ترچناپلی پہنچے۔ اس غرض کے لیے ڈیوپلے نے پانڈیچری سے تازہ دم سپاہ کی کمک بھیج دی۔ چنانچہ لاء اور چندا صاحب نے ترچناپلی سے ۲۰ میل آگے توپ خانہ اور سپاہ روانہ کردی۔ لیکن لارنس اور کلائیو راستہ کترا کر دوسرے راستے سے مع اپنے سازوسامان کے ترچناپلی سے دس میل پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ دریائے کولیرون اور کاویری کے درمیان واقع تھی جو جزیرہ سیرنگم کہلاتا تھا۔ یہاں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف سے توپ خانوں نے آگ برسانی شروع کردی۔ لارنس نے کلائیو کو اس ڈویژن کا کمانڈر مقرر کردیا جو پانڈیچری کی طرف سے آنے والی

فرانسیسی فوج کو راستے میں روکنے کے لیئے روانہ کی گئی تھی۔ کلائیو نے اپنے رسل ورسایل کو لارنس کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے فرانسیسیوں کی فوج کا مقابلہ کیا جو دوتنی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی۔ اس موقع پر بھی کلائیو نے اسی طرح جوانمردی اور اولوالعزمی سے کام لیا جس طرح اس نے ارکاٹ میں کام لیا تھا۔ اس نے لا کے راستے کو گھیر لیا تاکہ دوتنی کے ساتھ جو فوج آرہی تھی وہ اس سے نہ مل سکے۔ دوتنی کی فوج نے جب آگے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اس نے بڑھنے نہ دیا اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح لا نے جب دوتنی کی فوج سے ملنے کی کوشش کی تو بیچ میں کلائیو اور اس کی سپاہ کو پایا۔ کلائیو کی اس تدبیر جنگ سے لا بیحد پریشان ہوا اور مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دئے۔ چندا صاحب کے متعلق لا نے راجا تنجور سے یہ طے کر لیا کہ وہ اس کو کاریکال حفاظت سے پہنچا دینے کا ذمہ لیتا ہے۔ اس وقت راجا تنجور انگریزوں کے ساتھ تھا۔ اس نے لا کو یقین دلایا کہ اگر فوراً چندا صاحب کو اسکے حوالے کر دیا گیا تو وہ اس کو اس طور پر کاریکال بھجوا دے گا کہ انگریزوں کو خبر تک نہ ہوگی۔ چنانچہ لا نے اس کی بات پر اعتبار کر کے چندا صاحب کو راجا کے حوالے کر دیا اور اس نے اس کو پرانی دشمنی کے بدلے میں قتل کرا دیا۔ غرضکہ اس طرح انگریزی فوج نے اپنے دوست اور حلیف محمد علی کو ترچناپلی کے محاصرے سے نکالا اور محمد علی کی نوابی کا اعلان کر دیا۔

باوجود اس سخت ناکامی کے جو ترچناپلی کے محاصرے میں ڈیوپلے کو اٹھانی پڑی وہ اپنے منصوبوں سے باز نہ آیا۔ جون ۱۷۵۲ء میں کرناٹک کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ محمد علی کی نوابی عام طور پر تسلیم کر لی گئی تھی اور انگریزوں نے اپنے حریف فرانسیسیوں کو کلائیو کی حوصلہ مندی کی اور تدبر کی بدولت نیچا دکھا دیا تھا۔ لیکن ڈیوپلے اپنے جوڑ توڑ اور ساز باز میں برابر مصروف رہا۔ اس نے مراری راؤ حاکم گوٹی کو نہ معلوم کیا سبز باغ دکھا کر اپنا طرفدار کر لیا اور چندا صاحب کے بیٹے رضا صاحب کو محمد علی کے مقابلہ میں کرناٹک کی نوابی کے لیے پیش کر دیا۔ ڈیوپلے نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ چونکہ صوبہ دار دکن نے اس کو دریائے کرشنا

کے جنوب کے تمام علاقوں کا نواب مقرر کیا ہے اس لیے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ کرناٹک کا انتظام اپنے صوابدید کے مطابق طے کرے۔ سیاسی جوڑ توڑ کے علاوہ اس نے اپنی فوجی تیاری بھی بڑے زور شور سے جاری رکھی تاکہ کوئی مناسب موقع آنے پر پھر انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ وہ جس موقع کی تاک میں تھا وہ بہت جلد آپہنچا۔ انگریزوں کو اپنی کامیابی پر کچھ ایسا بھروسہ سا ہو گیا کہ انھوں نے ترچناپلی میں بہت کم فوج رکھی۔ چنانچہ اس کی اطلاع پاتے ہی ڈوپلے نے مراری راؤ کی مدد سے سنہ ۱۷۵۳ء کے شروع میں دوبارہ ترچناپلی کا محاصرہ کرلیا۔ اس دفعہ فرانسیسی فوج کا کمانڈر مین ویل تھا جس کے ساتھ ڈوپلے نے بہت کافی جنگی ساز و سامان کر دیا تھا۔ راستے میں فرانسیسیوں نے کڈلور کے قریب تروادی کے مقام پر محمد علی کی فوج کو پسپا کر دیا جس کے سبب سے ان کی ہمت بڑھ گئی۔ ترچناپلی پر مین ویل نے بڑی بے جگری سے نومبر سنہ ۱۷۵۳ء میں حملہ کیا اور قلعے کی بیرونی فصیل توڑ دی۔ قلعہ کے اندر لارنس تھوڑی سی انگریزی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے باوجود فصیل میں رخنہ پڑ جانے کے فرانسیسیوں کو اندر نہیں گھسنے دیا۔ مین ویل نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن لارنس کی قابل رہبری میں حصاری فوج نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اب ڈوپلے کو باوجود اپنی حوصلہ مندی کے احساس ہوا کہ انگریزوں کو نیچا دکھانا آسان نہیں۔ چنانچہ ترچناپلی کا محاصرہ جاری رکھتے ہوئے اسنے گورنر مدراس سانڈرس سے گفت و شنید شروع کر دی اور مصالحت کے لیے آمادگی کا اظہار کیا۔ ادھر فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظماء ڈوپلے کی ناکامیوں کے باعث اس کے خلاف ہو گئی تھی اور اس کی حکمت عملی کو ہندوستان میں فرانسیسی تجارت کے زوال کا اصلی سبب قرار دیا تھا۔ گفت و شنید کے لیے دونوں طرف سے کمشنر مقرر کیے گئے اور ولندیزی مقبوضہ سدرس میں جنوری سنہ ۱۷۵۴ء میں دونوں طرف سے کمشنر جمع ہو گئے۔ لیکن چونکہ خیالات و تصورات میں بنیادی اختلاف تھا اس واسطے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہ تھا۔ انگریزوں کا اصرار تھا کہ گفت و شنید شروع کرنے سے قبل یہ بات

اصولاً مان لی جائے کہ محمد علی کرناٹک کا جایز نواب ہے اور فرانسیسیوں کا اصرار تھا کہ اصولاً یہ تسلیم کیا جائے کہ صلابت جنگ دکن کی صوبہ دار ہیں اور انھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کرناٹک میں اپنی صوابدید سے جو چاہیں سیاسی انتظام کریں۔ اس ضمن میں ان سندوں کو پیش کیا گیا جو صلابت جنگ نے فرانسیسیوں کو عطا کی تھیں اور جن میں دیوپلے کو دریاے کرشنا کے جنوب کا نواب تسلیم کرلیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ گفتگو کے لیے جو ابتدائی شرطیں پیش کی گئیں وہ طرفین کے لئے قابل قبول نہ تھیں۔

غرض کہ سدرس کی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ادھر ترچناپلی میں نہ تو محمد علی اور انگریزوں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ باہر نکل کر فرانسیسیوں کا مقابلہ کریں اور انھیں مار بھگائیں اور نہ فرانسیسیوں میں اتنی سکت تھی کہ وہ دھاواکر کے قلعہ پر قبضہ کر سکیں۔ ان حالات میں فرانس سے پانڈیچری یہ اطلاع پہنچی کہ کمپنی نے اپنے ایک ناظم موسیو گودیو کو روانہ کر دیا ہے تاکہ وہ ہندوستان پہنچ کر انگریزوں سے فوراً مصالحت کرلے اور فرانسیسی کمپنی کے تجارتی زوال و پستی کے متعلق تحقیقات کرے۔ گودیو کو سربمہر ایک حکمنامہ دیا گیا تھا جس میں سندرج تھا کہ اگر دیوپلے اس کی اطاعت سے انکار کرے تو اس کو گرفتار کر کے فرانس واپس بھیج دیا جائے۔ گودیو اگست ۱۷۵۴ء میں پانڈیچری پہنچا۔ اس کے حکم سے مین ویل کو ترچناپلی کا محاصرہ اٹھالینا پڑا۔ دیوپلے کو فرانس واپس کردیا گیا۔ کمپنی اس کی مقروض تھی لیکن گودیو نے اس قرض کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ دیوپلے کو صرف فرانس جانے کے لیے سفر خرچ دیا گیا۔ دلداور کی دس ہزار پونڈ سالانہ کی شخصی آمدنی کو گودیو نے دیوپلے کے لیے تسلیم کیا۔ دیوپلے کا کمپنی پر جو قرض واجب الادا تھا اسے بے باق تصور کیا گیا۔ لیکن کمپنی کو اختیار دیا گیا کہ وہ اس پورے معاملے پر غور کر کے آخری تصفیہ کردے اور اگر مناسب سمجھے تو دیوپلے کو کچھ دے دلا دے۔

اس زمانے میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح تھی۔

اس لیے دونوں ملکوں کی تجارتی کمپنیاں چاہتی تھیں کہ ان کے کارندے ہندوستان میں امن و صلح سے رہیں۔ گودیو کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان پہنچنے کے بعد فوراً انگریزوں سے مصالحت کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان پہنچتے ہی گورنر مدراس سانڈرس سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر دیا اور جنوری ۱۷۵۵ء میں معاہدہ پانڈی چری پر دستخط ہوئے جس کی رو سے دونوں قوموں کے نمائندوں نے اقرار کیا کہ آئندہ وہ ہندوستانی والیان ملک کے آپس کے جھگڑوں میں دخل نہ دیں گے اور اگر والیان ملک کی طرف سے انہیں خطاب یا عہدے دیے جائیں گے تو وہ قبول نہیں کریں گے۔ لیکن بسی نے دربار دکن میں جو حقوق حاصل کر لیے ہیں انھیں یونہی رکھا جائے گا۔ اسی طرح دیوی کوٹہ پر انگریزوں کا اور کاریکال پر فرانسیسیوں کا قبضہ حسب سابق تسلیم کیا جائے گا۔ طرفین کے دوسرے مقبوضات بھی اس معاہدے میں تسلیم کیے گئے۔ چنانچہ انگریزوں کے پاس اس وقت ایک لاکھ پونڈ سالانہ آمدنی کے اور فرانسیسیوں کے پاس آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ آمدنی کے علاقے تھے جن کی اس معاہدہ میں ضمانت کر دی گئی۔ فرانسیسیوں نے انگریزوں کو شمالی سرکار میں مسولی پٹم دینے کا وعدہ کیا اس واسطے کہ پہلے سے وہاں انگریزوں کی تجارت وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔

ڈوپلے نے بعد میں اپنی صفائی پیش کرنے کے سلسلے میں گوڈیو پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے معاہدہ پانڈی چری کے ذریعہ فرانسیسی قوم کے مفاد اور وقار کو سخت نقصان پہنچایا اور اس نے انگریزوں سے اس وقت دب کر مصالحت کی جب کہ کرناٹک کی سیاسی صورت حال فرانسیسیوں کے موافق تھی۔ مالسن کا خیال ہے کہ اگر گوڈیو نے ڈوپلے کے مشورے پر عمل کیا ہوتا اور انگریزوں سے دب کر مصالحت کرنے کے بجائے ان کے خلاف جنگ جاری رکھی ہوتی تو فرانسیسی قوم اس وقت ایسی گئی گزری حالت میں نہیں تھی کہ وہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ گوڈیو نے بڑی غلطی کی کہ ڈوپلے کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا جو اس نے کئی سال کی محنت کے بعد بنائے تھے اور جن کے روبہ عمل لانے سے

فرانسیسی قوم کی کامیابی اور ترقی لازمی تھی (۱)۔ کلنتر وجیسے محتاط مورخ کا یہی خیال ہے (۲) لیکن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعوی صحیح نہیں تھا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ فرانسیسی فوج کو کئی ماہ سے تنخواہ تک نہیں ملی تھی اور اس میں سرکشی اور نافرمانی کے جذبات پرورش پا رہے تھے جس کے مظاہرے بھی برابر ہوتے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں فرانسیسیوں کے لئے جنگ کا جاری رکھنا نفع بخش نہیں ہو سکتا تھا۔ خود گودیو کے ساتھ جو تازہ دم فوج فرانس سے بھیجی گئی تھی وہ بالکل غیر تربیت یافتہ اور ناتجربہ کار تھی جس کے متعلق ڈیوپلے نے یہ غلط رائے قایم کی کہ اگر اس کو ترچناپلی کے محاصرہ میں لگا دیا جاتا تو فرانسیسیوں کی کامیابی یقینی تھی۔ خود پانڈی چری کونسل کی کچھ بعد کی روداد سے پتا چلتا ہے کہ ڈیوپلے کے ماسوا اکثر ارکان کونسل صلح کو جنگ پر ترجیح دیتے تھے اس واسطے کہ کمپنی کا خزانہ خالی تھا۔ چنانچہ کونسل نے مجلس نظما کو اس ضمن میں جو مراسلہ لکھا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کے مقابلے میں کرناٹک میں اپنی حیثیت اتنی مضبوط کر لی ہے کہ اگر ہم ان سے صلح کرنا چاہیں گے تو وہ مشکل ہی سے آمادہ ہوں گے اس واسطے کہ صلح نہ کرنے ہی میں ان کا زیادہ فایدہ ہے (۳)۔ پھر کمپنی کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ زیادہ عرصہ تک انگریزوں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن ڈیوپلے کو اپنی کامیابی کا ایسا زعم تھا کہ وہ کسی دوسرے کی رائے کو سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ اور چونکہ اس کی شخصیت ایسی زبردست اور حاوی تھی کہ کسی کو صاف طور پر اس سے اختلاف کی جراءت بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود رائے تھا اور اسے اپنے اوپر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنی ناکامی کو محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ گودیو کی مصالحت پسندانہ حکمت عملی کے باعث فرانسیسیوں کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ

۱؎۔ *History of French in India*, p. 224.

۲؎۔ *Dupleix, ses idees, sapolitique et sa chute*, p. 335.

۳؎۔ *Memoire a consulter pour Le Sieur, Godehew.*1760, p. 85, 86

اپنی فوج کی تنظیم عمل میں لائیں اور شمالی سرکار میں ان کی جو حیثیت تسلیم کرلی گئی تھی اور وہاں کے محاصل وصول کرنے کا جو اختیار حاصل ہوگیا تھا اس سے اپنی قوت کو بڑھائیں۔ لیکن انھیں یہ مہلت زیادہ نہ ملی اس واسطے کہ جنگ ہفت سالہ شروع ہوگئی جس میں انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کے پھر حریف بن گئے۔ معاہدۂ پانڈی چری کا نفاذ دونوں کمپنیوں کی توثیق پر منحصر ٹھہرایا گیا تھا لیکن بیشتر اس کے کہ توثیق کی نوبت آتی ۱۷۵۶ء میں یورپ میں جنگ ہفت سالہ کے چھڑ جانے کے باعث ہندوستان میں بھی دونوں قوموں میں اعلان جنگ ہوگیا۔

ڈیوپلے کے فرانس روانہ ہو جانے کے بعد گودیو نے دے لرت کو پانڈی چری کا گورنر مقرر کردیا اور خود فرانس روانہ ہوگیا۔ دے لرت کو جب جنگ ہفت سالہ کے شروع ہونے کی اطلاع کئی ماہ بعد وصول ہوئی تو اس نے فرانسیسی فوج ترچنا پلی پر حملہ کرنے کے لیے بھیجدی۔ لیکن انگریزوں نے اس کو شکست دے کر پسپا کردیا۔ اس کے بعد فرانسیسیوں اور انگریزوں میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس اثنا میں حکومت فرانس نے کونت دے لالی کو ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات کی حفاظت کے لیئے وسیع اختیارات دے کر بھیج دیا۔ وہ اپریل ۱۷۵۸ء میں پانڈی چری پہنچا۔ اس زمانے میں انگریزی فوج کا بیشتر حصہ کلائیو کے تحت تھا اور کرناٹک میں فرانسیسیوں کا پلہ بھاری تھا۔ لیکن کلائیو نے بنگال میں انگریزی قوم کے لیے جو غلبہ حاصل کرلیا تھا اس سے کرناٹک کی جنگ میں بڑی مدد ملی اور بالآخر انگریزوں نے فرانسیسیوں کو وہاں بھی نیچا دکھا دیا۔

کونت دے لالی اگرچہ بہادر اور تجربہ کار افسر تھا لیکن بلا کا تند مزاج، خود رائے اور جلد باز تھا۔ اس نے شروع میں اگرچہ بعض جگہ انگریزوں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی لیکن بہت جلد اس کے ماتحت افسر اس سے بگڑ گئے

ہوئے اور پانڈیچری کونسل بھی اس کے خلاف ہو گئی۔ چنانچہ آپس کے ان اختلافات کے باعث بجائے اس کے کہ کونت دے لالی کو اپنے ہم قوموں سے مدد ملتی الٹی اس کی مخالفت ہونے لگی۔ لالی نے کڈلور، فورٹ سینٹ ڈیوڈ اور دیوی کوٹہ پر انگریزی فوجوں کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ اس کی ان ابتدائی کامیابیوں سے کرناٹک میں معلوم ہوتا تھا کہ پھر سے شاید فرانسیسیوں کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ مدراس کے گورنر پگٹ نے کلائیو سے مدد طلب کی اور اس کو شمالی سرکار پر حملہ کرنے کی دعوت دی تاکہ فرانسیسیوں کی توجہ کچھ بٹ جائے۔ لالی اپنی کامیابی کے نشہ میں سرشار مدراس پر حملہ کرنے کی فکر میں تھا۔ لیکن گورنر لے رت اور پانڈیچری کونسل اس کے منصوبہ کے خلاف تھی۔ انھوں نے اس مہم کے اخراجات کی پابجائی سے انکار کر دیا۔ پھر بیڑے کے افسر اعلیٰ موسیو ڈاکے بھی مدراس پر حملہ کرنے کے خلاف تھا اس نے لالی کو صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اس میں اس کے ساتھ تعاون عمل نہیں کروں گا۔ چنانچہ لالی نے مجبور ہو کر مدراس کے حملہ کا ارادہ فسخ کر دیا اور تنجور کی طرف پیش قدمی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث اس کو بہت جلد پانڈیچری لوٹ آنا پڑا۔

اسی اثناء میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑہ میں متعدد بحری لڑائیاں ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی لڑائی بھی فیصلہ کن نہیں ثابت ہوئی۔ فرانسیسی بیڑہ کے افسر اعلیٰ موسیو ڈاکے نے کچھ ان اختلافات کی وجہ سے جو اس کے اور لالی کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ انگریزی بیڑہ کے مقابلہ میں اس کو کامیابی کی امید بہت کم تھی ماریشس جانے کا ارادہ کر لیا۔ پانڈیچری کے گورنر لے رت اور کونت دے لالی نے اس کے اس ارادے سے اختلاف کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی اور کہا کہ میں تمہارے تحت نہیں ہوں بلکہ فرانس کی بحری وزارت کے ماتحت ہوں اس لئے مجھے حق ہے کہ اپنے صوابدید پر جو چاہوں فیصلہ کروں چنانچہ وہ ماریشس روانہ ہو گیا۔ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر انگریزی بیڑہ پوری

طرح سے حاوی ہو گیا اور سمندر کے راستے سے بنگال سے کرناٹک ہر قسم کی مدد پہنچنے میں کوئی چیز حارج نہیں رہی۔

لالی نے ایک بڑی زبردست غلطی یہ کی کہ دکن سے موسیو بسی کو اور شمالی سرکار سے موسیو موراکین کو کرناٹک بلالیا اور انھیں حکم بھیج دیا کہ اپنے ساتھ جتنی بھی فرانسیسی فوج لا سکتے ہیں فوراً لے آئیں، اس واسطے کہ کرناٹک ہی میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان آخری فیصلہ ہوگا۔ لیکن لالی یہ بھول گیا کہ انگریزوں نے کرناٹک سے کہیں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ دولت مند علاقوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ ان کی بمبئی اور فورٹ سینٹ ولیم (کلکتہ) کی کوٹھیاں مدراس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بیوپار کرتی تھیں اور ان کی سیاسی اہمیت بھی کسی طرح کرناٹک سے کم نہ تھی۔ لالی نے اگرچہ ارکاٹ پر قبضہ کر کے چندا صاحب کے لڑکے رضا صاحب کو نواب کرناٹک بنا دیا تھا لیکن وہ جس بنیاد پر اپنی تعمیر کھڑی کر رہا تھا وہ بودی تھی۔ بسی ارکاٹ میں لالی سے آکر مل گیا۔ شمالی سرکار کی فرانسیسی فوج بھی کرناٹک آگئی۔ لیکن لالی کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی اور اس کی سپاہ میں قدرتی طور پر بددلی پھیل رہی تھی۔ لالی اور بسی میں شروع ہی سے اختلافات شروع ہو گئے اور ان دونوں میں تعاونِ عمل ناممکن ہو گیا۔ لالی کو پانڈیچری کی کونسل سے جیسی مالی امداد ملنی چاہیے تھی وہ نہ ملی۔ غرضکہ لالی کے معاملات بگڑنا شروع ہوئے اور بالآخر ایسے بگڑے کہ سنبھالے نہ سنبھلے۔

شمالی سرکار میں میدان خالی دیکھ کر وزیانگرم کے راجہ انند راج نے فرانسیسی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور کلائیو کو مدد کے لئے لکھا اور اپیل کی کہ اگر اس وقت بنگال سے مدد آگئی تو سب کچھ ممکن ہے لیکن اگر تاخیر کی گئی تو بنتا ہوا کھیل بگڑ جائے گا۔ ادھر مدراس کے گورنر پگٹ نے کلائیو کو بار بار شمالی سرکار پر حملہ کرنے کے لئے لکھا۔ چنانچہ کلائیو نے باوجود فورٹ سینٹ ولیم (کلکتہ) کی کونسل کے اختلاف کے جو پلاسی کی لڑائی کے بعد جنگ کی مزید ذمہ داری اپنے اوپر لینے سے ہچکچاتی تھی کرنل فورڈ کی سرکردگی میں سمندر کے

راستے سے دسمبر ۱۷۵۸ء میں شمالی سرکار پر حملہ کرنے کے لیے فوج روانہ کردی۔ اپریل ۱۷۵۹ء میں فورڈ نے مسولی پٹم پر گولے برسائے اور اپنی فوج اتار دی۔ کندویر کے مقام پر بچی کھچی فرانسیسی فوج کو کرنل فورڈ نے شکست دی۔ فرانسیسی کمانڈر کونفلان فرار ہوگیا۔ انگریزی فوج نے ہر چند اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ فورڈ نے اس کے راہ فرار اختیار کرنے کے متعلق کلائیو کو اس طرح اپنے خط میں لکھا ہے۔ "وہ (کونفلان) ارادہ کرچکا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ ہاتھ نہیں آئے گا سوائے کسی تیز رفتار ہی گھوڑے کے۔ جس شب کورن پڑا تھا اسی شب اس نے راجمندری میں جاکر ناشتہ کیا جو مقام جنگ سے کم از کم پچاس میل فاصلہ پر ہے"۔ لیکن ہتیار ڈالنے سے قبل کونفلان نے صوبیدار دکن اصلابت جنگ کو لکھا تھا کہ راجہ وزیانگرم کے خلاف وہ کمک لے کر مسولی پٹم جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کریں۔ صلابت جنگ جب مسولی پٹم سے ۱۵ میل پر پہنچے تھے کہ انھیں کندویر میں فرانسیسی فوج کے ہتیار ڈالنے اور مسولی پٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کی اطلاع ملی اور انھوں نے کرنل فورڈ سے مصالحت کی گفت و شنید شروع کردی۔ کندویر کی فتح انگریزوں کی زبردست کامیابی تھی جس کی بدولت فرانسیسیوں کے ہاتھ سے شمالی سرکار ہمیشہ کے لیے نکل گیا اور صلابت جنگ کو ان پر جو غیر معمولی اعتماد تھا اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ صلابت جنگ نے کرنل فورڈ سے معاہدہ کرلیا۔ جس کی رو سے انھوں نے فرانسیسی فوج کو اپنے ہاں برطرف کرنے اور مسولی پٹم کا بندرگاہ اور شمالی سرکار کے علاقے جو لمبائی میں سمندر کے کنارے ۸۰ میل اور چوڑائی میں کم و بیش بتیس میل سے لے کر سو میل تھے انگریزوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کرلیا۔ اس علاقے کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپے تھی صلابت جنگ نے شمالی سرکار میں انگریزوں کے وہی حقوق تسلیم کیے جو فرانسیسیوں کو حاصل تھے (۱) جب کلائیو نے ۱۷۶۵ء میں بادشاہ شاہ عالم سے بنگال بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی حاصل کی تو شمالی

(۱) Orme, Vol I P. 336 and Vol, II P. 493

سرکار پر انگریزی قبضے کی توثیق بھی حاصل کرلی۔

اس طرح شمالی سرکار ہمیشہ کے لیے فرانسیسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا بسی کے دکن سے کرناٹک جانے سے فرانسیسی مفاد کو مطلق کوئی فایدہ نہیں پہنچا اس واسطے کہ لالی اور بسی میں شروع ہی سے اختلافات شروع ہو گئے۔ بسی چاہتا تھا کہ سیاست کاری اور تدبر سے فرانسیسی اثر کو ہندوستان میں قایم کرے۔ برخلاف اس کے لالی اندھا دھند طور پر انگریزوں سے نبرد آزما ہو کر ان کے سب مقبوضات پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا تاکہ فرانسیسی اقتدار کے لیے ہندوستان میں راستہ صاف ہو جائے۔ وہ سیاست کاری کے طریقوں کو ذلیل سمجھتا تھا جو ایک سپاہی منش آدمی کے لیے نازیبا ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ سیاست کاری کے میدان میں فرانسیسی انگریزوں کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکیں گے۔ اگر انھیں شکست دی جا سکتی ہے اور ہندوستان سے بے دخل کیا جا سکتا ہے تو صرف تلوار کے ذریعے۔ لالی اور بسی کے اصول اور ان کے مزاج ایسے مختلف تھے کہ ان میں تعاون عمل ہونا کسی صورت میں ممکن نہ تھا جس کی وجہ سے فرانسیسی مفاد کو اس ملک میں سخت نقصان پہنچا۔ لالی نے اپنے اصول عمل کا اظہار ایک خط میں کیا ہے جو اس نے بسی کو ۱۳ جون ۱۷۵۸ء کو لکھا تھا۔ "بادشاہ اور کمپنی نے مجھے ہندوستان اس واسطے بھیجا ہے کہ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک سے بیدخل کر دوں .... مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ فلاں نواب اور فلاں راجہ اپنے حق کے لیے جھگڑ رہے ہیں (۱)۔"

کرنل فورڈ نے کندور کے مقام پر فرانسیسیوں کو جو شکست دی اس سے صرف چند روز قبل لالی نے دسمبر ۱۷۵۸ء میں مدراس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ یہ محاصرہ تقریباً تین ماہ تک جاری رہا لیکن اس کو کامیابی

۱ـ Lawrenee's account of the War in India, p. 213

نہیں ہوئی۔ پانڈی چری سے رسد بالکل نہیں پہنچ رہی تھی۔ جب سپاہ میں بددلی پھیلنے لگی تو لالی نے محاصرہ اٹھالیا۔ اس نے محاصرہ اس واسطے بھی اٹھالیا کہ انگریزی بیڑہ مدراس کی محاصرہ شدہ انگریزی فوج کی مدد کو عین وقت پر پہنچ گیا۔ فرانیسی بیڑہ ماریشیس جاچکا تھا اس لیے سمندر میں انگریز پوری طرح حاوی تھے۔ انگریزی بیڑہ کے مدراس پہنچ جانے سے لالی بالکل ناامید ہوگیا اور پانڈی چری جانے کا حکم دیدیا۔ مدراس کی مدافعت لارنس اور گورنر پگٹ نے بڑی قابلیت اور خوش تدبیری سے کی۔ ادھر شمالی سرکار میں کلایو کی بروقت امداد اور کامیابی سے جو صورت حال پیدا ہوگئی وہ فرانسیسیوں کے لیے حد درجہ حوصلہ شکن تھی۔

آیندہ دو سال میں لالی نے کرناٹک میں انگریزوں سے جو لڑائیاں لڑیں ان میں پہلا سا وہ جوش اور ولولہ نہ تھا بلکہ ان کی نوعیت بڑی حد تک مدافعانہ تھی۔ اس کو خود اپنے اوپر اور اپنے وسایل پر اعتماد باقی نہیں رہا تھا جو شروع شروع میں ہندوستان کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے اس میں موجود تھا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کی مخالفت اور سپاہ کی نافرمانی سے تنگ آگیا تھا۔ فرانس سے بھی اس کو کسی قسم کی فوجی یا مالی امداد نہیں پہنچی اور نہ آئندہ اس کی توقع تھی۔ ونڈیواش کے مقام پر جنوری ۱۷۶۰ء میں سر آیر کوٹ نے لالی کو شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں بسی کو انگریزی فوج نے گرفتار کرلیا اور فرانسیسیوں کا بہت نقصان ہوا۔ اس کامیابی کے بعد سر آیر کوٹ نے چینا پیٹھ اور ارکاٹ پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ لالی پانڈی چری میں جاکر قلعہ بند ہوگیا۔ انگریزی فوج نے جنجی پر قبضہ کر کے پانڈی چری کے رسد کے تمام راستوں کو بند کردیا۔ لالی نے بڑی بہادری سے کئی مہینے تک مقابلہ کیا لیکن بالآخر جنوری ۱۷۶۱ء میں انگریزوں نے پانڈی چری فتح کرلیا اور لالی کو گرفتار کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ انگریزی حکومت نے اس سے یہ قول لے کر کہ وہ آیندہ انگریزی قوم کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گا رہا کردیا اور وہ فرانس واپس چلا گیا۔

حکومت فرانس نے اس پر غداری کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا اور اور اس کو سزائے موت دے دی گئی۔ انگریزوں نے پانڈی چری کے قلعے اور تمام مدافعتی اہمیت کے مقامات کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ شہر پانڈی چری کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ۱۷۶۳ء میں جب معاہدۂ پیرس ہوا اور جنگ ہفت سالہ ختم ہوئی تو فرانس کو اس کے جنوبی ہند کے سب مقبوضات واپس کر دیے گئے۔ لیکن شمالی سرکار پر انگریزی اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔ فرانسیسی مقبوضات کے سب قلعے مسمار کر دیئے گئے اور فوج کی تعداد مقرر کر دی گئی جو فرانسیسی حکومت ساحل کارومنڈل پر اپنے مختلف مقبوضات میں رکھ سکتی تھی۔ معاہدۂ پیرس کی وجہ سے صلابت جنگ کو دکن کا صوبہ دار اور محمد علی کو کرناٹک کا نواب تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن معاہدۂ پیرس پر دستخط ہونے سے پہلے ہی نواب نظام علی خان دکن کے دروبست کے مالک ہو چکے تھے اور صلابت جنگ کو انھوں نے نظر بند کر دیا تھا۔

دربار دکن میں فرانسیسی اثر کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے ہو گیا۔ آیندہ اہل فرانس کی طرف سے صوبہ دار دکن کے دربار میں اثر قائم کرنے کی جو کوششیں ہوئیں وہ کمزور اور بے نتیجہ رہیں۔ جنگ ہفت سالہ کے بعد ہندوستان میں فرانس کے سیاسی منصوبے تقریباً ختم ہو گئے۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی نے آیندہ ہندوستان میں سوائے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے دوسرے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ لیکن فرانسیسی کمپنی کی تجارت انگریزی کمپنی کی تجارت کے مقابلے میں ہمیشہ ہیٹی رہی۔

انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی ناکامی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ڈوپلے کو شروع شروع میں اپنے سیاسی منصوبوں میں کامیابی ہوئی اور حکومت فرانس نے اس کی فتوحات کے صلہ میں اس کو مارکوئس کا خطاب عطا کیا لیکن بعد میں اس کی سیاست کاری فرانسیسی قوم کے لیے عذاب جان بن گئی۔ باوجود شمالی سرکار پر فرانسیسی قبضہ ہو جانے کے فرانسیسیوں کی مالی

حالت بہت خراب ہوگئی تھی ۔ ان کی تجارت جو پہلے ہی سے انگریزی کمپنی کے مقابلے میں کم تھی کرناٹک کی متواتر لڑائیوں کے باعث بالکل بیٹھ گئی ۔ ایک ہمعصر مورخ کے بیان کے بموجب ۱۷۳۶ء سے ۱۷۵۶ء کے بیس سال کے عرصے میں ہندوستان سے ایک کروڑ چودہ لاکھ پچاس ہزار پونڈ کا مال فرانس گیا ۔ برخلاف اس کے اسی عرصے میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے ۴ کروڑ بارہ لاکھ پونڈ کا مال انگلستان گیا (۱)

اگرچہ ڈیوپلے کو فرانسیسی کمپنی کی مالی حالت کی خرابی کا احساس نہ تھا لیکن بسی کو اس کا اچھی طرح احساس تھا جیسا کہ اس نے ایک موقع پر کہا تھا ۔ "فتوحات اور جنگی کامیابیوں میں بھی تجارتی کمپنی اپنا حساب اور تخمینہ لگاتی رہتی ہے ۔ یہ فتوحات یقیناً ناپسندیدہ ہیں اگر ان کی بدولت اخراجات آمدنی سے زیادہ ہوجائیں اور پیداوار صرف کے برابر ہو" (۲) انگریزوں نے اس اصول پر عمل کیا جس کی نسبت بسی نے اشارہ کیا تھا ۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی حالت قابل اطمینان تھی ۔ جنگ کے زمانے میں بھی اس کی تجارت برابر جاری رہتی تھی ۔ اس کے علاوہ حکومت انگلستان آڑے وقت میں ہمیشہ کمپنی کا ساتھ اور قرض دیتی رہتی تھی ۔ ڈیوپلے مالیات کے انتظام میں کوئی خاص قابلیت نہیں رکھتا تھا اس کی فضول خرچی کے سبب سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی فوج کو ماہ بماہ تنخواہ نہیں ادا کرسکتا تھا ۔ پھر اس نے کمپنی کی مالی حالت کو نظماء سے چھپانے کی کوشش کی اور انھیں برابر یہ باور کرایا کہ فرانسیسی تجارت کی ترقی ہو رہی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پانڈیچری اور نظماء میں بے اعتمادی بڑھتی گئی جس کی بنا پر بالآخر نظماء نے گودیو کو ہندوستان بھیجا ۔ لیکن یہ اس وقت کیا گیا جب کہ حالات بہت بگڑ چکے تھے ۔ اگر جنگ ہفت سالہ فوراً نہ شروع

(1) Reports of the House of Common, Vol. IV,

(2) *Memoire pour le Sieur de Busey. p.* [illegible]

ہوجاتی تو ممکن تھا کہ فرانسیسی اپنی حالت ہندوستان میں سنبھال لیتے لیکن ان کو ایسا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ پھر انگریزوں نے جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر جو سیاسی غلبہ حاصل کرلیا تھا اس سے انھیں بڑا فائدہ پہنچا اور وہ اس قابل ہوئے کہ بنگال کے وسایل کو اپنے حریف کے خلاف کرناٹک میں استعمال کریں۔ چنانچہ کرنل فورڈ اور سر آئرکوٹ نے بنگال کے خزانوں کو فرانسیسیوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے دریغ صرف کیا اگر بنگال سے اس وقت مدد نہ پہنچ جاتی تو انگریزوں کے کرناٹک کے وسایل اتنے نہ تھے کہ ان سے وہ فرانسیسیوں کو نیچا دکھا سکتے۔ فرانسیسیوں نے اپنی تمام تر توجہ جنوبی ہند کی جانب مبذول رکھی اس لیے ان کے وسایل انگریزوں کے مقابلے میں بہت محدود رہے۔

انگریزوں کی بحری قوت بھی فرانسیسیوں کی بحری قوت کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر تھی۔ چنانچہ سمندر کے راستے سے بنگال سے کرناٹک اور شمالی سرکار کو انھوں نے مدد بھیجی اور فرانسیسی انھیں ایسا کرنے سے اس واسطے نہ روک سکے کہ ان کی بحری قوت مقابلے میں تھی ہی نہیں۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے معاملات میں بڑی حد تک آزاد تھی۔ برخلاف اس کے فرانسیسی تجارتی کمپنی کے معاملات میں حکومت کو بہت دخل حاصل تھا جس کی وجہ سے اس کی تجارت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی حکومت فرانس فرانسیسی کمپنی کے معاملات میں دخل اندازی کرتی رہتی تھی لیکن آڑے وقت میں جیسی مدد کرنی چاہیئے ویسی مدد نہیں کرتی تھی۔ ان اسباب کے علاوہ یہ سبب بھی قابل لحاظ ہے کہ انگریزی افسروں میں آپس میں اتحاد اور یک جہتی پائی جاتی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی ان میں آپس کے رشک سے اختلاف پیدا ہوجاتا تھا لیکن وہ ایک معین حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا اور ڈسپلن کی حدود کا احترام کبھی پس پشت نہ ڈالا جاتا تھا۔ مثلاً جب لارنس نے ترچناپلی کے محاصرہ والی مہم میں کلائیو کو لا کے خلاف فوج کے ایک حصہ کا

کمانڈر مقرر کر دیا تھا تو بعض پرانے افسروں کو یہ ناگوار گزرا تھا لیکن یہ معاملہ بہت جلد رفع دفع ہو گیا اور کلائیو کی قابلیت اور جرات سے مخالفوں کے منہ خود بخود بند ہو گئے۔ برخلاف اس کے فرانسیسی افسر ایک دوسرے سے بغض رکھتے تھے اور افسروں اور ماتحتوں میں جیسا چاہئے ویسا تعاون عمل موجود نہ تھا جس کی وجہ سے ان کے قومی مفاد کو سخت نقصان پہنچا۔ پھر ان سب سے بڑھ کر انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی قوم کو اپنے ہم قوموں سے جو ہندوستان میں اس کی سیادت قایم کرنا چاہتے تھے کوئی حقیقی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ ان کے مقاصد کو شبہہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ فرانس اس زمانے میں اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ وہاں ایک زبردست انقلاب کا مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا جس نے نہ صرف اہل فرانس بلکہ اہل یورپ کی زندگی کے ہر شعبے کی کایا پلٹ دی۔ اس کے برخلاف انگریزی حکومت اور انگریزی قوم کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقاصد سے ہمدردی تھی اور وہ اس کے کارناموں کو اپنی قومی زندگی کے لیے قابل فخر تصور کرتی تھی۔ پھر فرانسیسی حکومت عرصے سے یورپ کی اندرونی جنگوں کی لپیٹ میں آتی رہی جس کے باعث اس کو انگریزی حکومت کی طرح اس کا موقع نہیں ملا کہ نو آبادکاری کے منصوبوں کو بروئے کار لائے اور سمندر پار اپنی سلطنت کی توسیع کرے غرض کہ ان سب اسباب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں فرانسیسی انگریزوں کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ کی یہ ایک بوالعجبی ہے کہ ہندوستان کی سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر یوروپین اقتدار قایم کرنے اور اپنی حکومت کے ڈول ڈالنے کا منصوبہ ایک فرانسیسی (ڈوپلے) نے سوچا اور اسے ایک انگریز (کلائیو) نے عملی جامہ پہنایا۔

چوتھا باب

بنگال میں انگریزی حکومت کا قیام

سلطنت مغلیہ کی کمزوری کے زمانے میں علی وردی خاں نے جو بہار کا عامل تھا، بنگال پر قبضہ و تصرف حاصل کر لیا تھا۔ اس نے ۱۷۴۱ء سے ۱۷۵۶ء تک بنگال پر عدل و اعتدال کے ساتھ حکومت کی اور رعایا کے مختلف طبقوں کا اپنی حکمت عملی اور خوش انتظامی سے اعتماد حاصل کیا۔ اس زمانے میں بنگال پر مرہٹوں کے حملے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ علی وردی خاں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا لیکن بعد میں مجبور ہو کر اس نے اوڑیسہ ان کے حوالہ کر دیا اور بنگال کی آمدنی پر بھی چوتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے انگریزوں، فرانسیسیوں اور ڈچ لوگوں سے جن کی تجارتی کوٹھیاں بنگال میں عرصے سے قایم تھیں، دوستانہ تعلقات قایم کئے تاکہ ان کی تجارت ملک کی مرفہ الحالی کو بڑھائے۔ وہ چاہتا تھا کہ جہاں تک ہو سکے یوروپین اقوام سے کسی طرح بگاڑ نہ ہو۔ جب اس کے بعض مشیروں نے اس سے کہا کہ یوروپین تاجروں کو بنگال سے نکال باہر

کرنا چاہیے ۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ خشکی پر جب آگ لگتی ہے تو اس کو بجھانا دشوار ہوتا ہے لیکن اگر سمندر میں آگ لگ گئے تو اسے کیسے بجھایا جا سکتا ہے ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس کے اس جواب سے اس بے بسی کا اظہار ہوتا ہے جو دیسی والیان ملک یوروپین فاتحوں کے مقابلے میں اس وقت محسوس کرنے لگے تھے اس واسطے کہ اہل مغرب کے سائینٹفک طریق فکر و عمل کے سامنے وہ ہار مان چکے تھے ۔

علی وردی خاں کا جب ۱۷۵۶ء میں انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا نواسہ سراج الدولہ تخت و تاج کا مالک ہوا ۔ سراج الدولہ کو شروع ہی سے انگریزوں سے حد درجہ نفرت تھی اس لیے کہ اس کو شبہہ تھا کہ وہ اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو جس کا علی وردی خاں کے خاندان سے تعلق تھا، بنگال کا نواب بنانا چاہتے تھے ۔ اس کے علاوہ کلکتہ (فورٹ ولیم) کے گورنر نے ایک شخص مسمی کشن داس کو پناہ دی تھی جو ڈھاکہ کا رہنے والا اور سراج الدولہ کے سخت مخالفوں میں سے تھا اور سیٹھ ساہوکاروں پر اس کا بڑا اثر تھا ۔ سراج الدولہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے فورٹ ولیم کے گورنر کو لکھا کہ کشن داس کو اس کے حوالہ کر دیا جائے لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا اس واسطے کہ کشن داس اور دوسرے سیٹھ ساہوکاروں سے تجارت کے سلسلے میں انگریزوں کے پہلے سے تعلقات چلے آتے تھے ۔ جو شخص سراج الدولہ کا خط لے کر گیا تھا اس کے ساتھ کلکتہ میں نازیبا برتاؤ کیا گیا ۔ پھر سراج الدولہ کو یہ بھی شکایت تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بغیر محصول ادا کرنے کے تجارت کا جو حق دیا گیا تھا اسے بیجا استعمال کیا جا رہا تھا اور کمپنی کے ملازم اپنی نجی تجارت میں محصول سے بچنے کے لیے کمپنی کی دستک یا اجازت نامہ کو بلا تکلف استعمال کرتے رہتے ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نواب کی حکومت کمپنی کے ملازموں سے جو تجارت کرتے تھے محصول نہیں وصول کر سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ سراج الدولہ کو عام احساس تھا کہ جس طرح کرناٹک اور دکن میں اہل

یورپ حاوی ہو گئے ہیں اسی طرح بنگال کا بھی حشر ہو گا اگر ابھی سے ان کی قوت کو توڑا نہ گیا۔ اور چونکہ بنگال میں انگریز دوسرے اہل یورپ کے مقابلے میں قوی تھے اس لیے ضرورت تھی کہ انھیں نیچا دکھایا جائے سراج الدولہ کو انگریزوں کا بڑھتا ہوا اثر ناگوار تھا۔ اسی اثناء میں سراج الدولہ کو اطلاع ملی کہ فورٹ ولیم کی فصیلیں درست کی جارہی ہیں اور قلعہ میں مزید تعمیر کا کام بھی جاری ہے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ تعمیر کا کام فوراً بند کر دیا جائے اس لیے کہ انگریزوں کو اپنے مقبوضات کی قلعہ بندی کا حق حاصل نہیں۔ فورٹ ولیم کے گورنر نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ استحکامات اس خطرہ کی بناء پر کیے جارہے ہیں کہ کہیں عنقریب یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی نہ چھڑ جائے۔ چنانچہ انگلستان سے حال میں آئے ہوئے تمام خطوط میں اس خطرہ کا اظہار کیا گیا ہے اور ابھی سے تیاری کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور چونکہ پچھلی جنگ میں فرانسیسیوں نے مدراس پر قبضہ کر لیا تھا جو سلطنت مغلیہ کی حدود میں تھا اور جہاں انگریزوں کو توقع تھی کہ فرانسیسی سلطنت مغلیہ کی غیر جانبداری کا خیال رکھیں گے، اسی طرح ممکن ہے کہ اب لڑائی چھڑ جانے کی صورت میں چندر نگر کی فرانسیسی فوج فورٹ ولیم پر قابض ہو جائے۔ چنانچہ اس خطرہ کے مد نظر دریا کے رخ پر توپیں مستحکم طور پر جمائی جارہی ہیں۔[1]

اس جواب پر سراج الدولہ بہت برافروختہ ہوا اور قاسم بازار کی انگریزی کوٹھی پر قبضہ کر لیا جو اس کے مستقر مرشد آباد کے قریب واقع تھی۔ یہاں سے اس نے ۵۰ ہزار فوج کا رخ فورٹ ولیم کی طرف پھیر دیا۔ اس وقت فورٹ ولیم میں ۲۶۴ باقاعدہ گورا سپاہ تھی۔ اس کے علاوہ ۲۵۰ باقی دوسری فوج تھی جو شہریوں میں سے بھرتی کی گئی تھی جن میں

---

[1] Orme: History of the Military Transactions of the British Nation in Indostan, Vol. II, p. 56.

سے ۱۴۰ یورپین تھے ۔ قلعہ کی عام حالت کمزور تھی اور توپیں بے استعمالی کی وجہ سے بری حالت میں تھیں ۔ کرناٹک میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی جنگ کی وجہ سے بنگال کو کچھ عرصہ قبل جو انگریزی سپاہ بھیجی جانے والی تھی وہ سب کی سب کرناٹک میں روک لی گئی تھی ۔ اس کے بعد جب جنگ ختم ہو چکی تو بھی اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی کہ بنگال میں اس کی اہمیت کے مدّنظر انگریزی سپاہ کی تعداد بڑھائی جائے ۔ چنانچہ سراج الدولہ کے حملہ کے وقت فورٹ ولیم میں جو فوج تھی وہ بالکل ناکافی تھی ڈریک نے جو اس وقت فورٹ ولیم کا گورنر تھا پہلے تو پوری کوشش کی کہ کسی طرح سے آئی بلا ٹل جائے چنانچہ اس نے کئی روز سراج الدولہ سے گفت وشنید کرنے میں صرف کیے اور اس کو یقین دلانا چاہا کہ اس کے احکام کی تعمیل کی جائے گی ۔ اور اسی دوران میں مدراس اور بمبئی کی کوٹھیوں کو خطوط بھیجے کہ فوراً امداد روانہ کرو ۔ سراج الدولہ سمجھ گیا کہ کمک کے انتظار میں گفت وشنید کو طوالت دینے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ چنانچہ اس نے کلکتہ (فورٹ ولیم) کا محاصرہ کر لیا ۔ ڈریک اور دوسرے انگریز جہازوں کے ذریعے سے جو قلعہ کے قریب دریائے ہگلی میں لنگر انداز تھے بھاگ نکلے ۔ جو باقی بچے انھوں نے ہالول کی سرکردگی میں مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں گرفتار کر لیا گیا ۔

قاسم بازار پر سراج الدولہ کے قبضے کی خبر پہلی مرتبہ ۱۴ر جولائی ۱۷۵۶ء کو مدراس پہنچی ۔ چنانچہ ۲۰ جولائی کو کلپٹرک کی ماتحتی میں سمندر کے راستے سے ۲۳۰ سپاہ کمک کے لیے روانہ کی گئی جو ۲ اگست ۱۷۵۶ء کو فلٹا پہنچی جہاں ڈریک اور دوسرے کلکتہ سے بھاگے ہوئے انگریز پناہ گزین تھے ۔ لیکن جب فورٹ ولیم پر سراج الدولہ کے قبضہ کی اطلاع پہنچی تو مدراس کے انگریزوں کو بڑی تشویش پیدا ہو گئی ۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کس کی سرکردگی میں فوج بھیجنی چاہئے ۔ شاہی فوج کا ایک افسر کرنل اڈلر کرون کا دعویٰ تھا کہ چونکہ وہ ملازمت اور رتبہ میں ان سب افسروں سے برتر ہے جو اس وقت مدراس میں موجود تھے اس لیے اس کے سربراہی میں بنگال کی مہم

روانہ ہونی چاہیئے۔ اس نے اپنی شرائط حکومت مدراس کے سامنے پیش کیں جنھیں منظور نہیں کیا گیا۔ اس وقت امیر البحر واٹسن اور کلائیو بمبئی سے مدراس آچکے تھے۔

کلائیو کو ۱۷۵۵ء میں مجلس نظماء نے فوجی دستوں کے ساتھ اس غرض سے ہندوستان بھیجا تھا کہ وہ بمبئی جاکر مرہٹوں کی مدد سے بسی کے خلاف دکن میں فوج کشی کرے۔ لیکن جب وہ بمبئی پہنچا تو انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہوچکی تھی۔ چنانچہ دکن پر فوج کشی کی تجویز ملتوی کرنی پڑی۔ امیر البحر واٹسن بھی مع اپنے بیڑے کے بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز تھا۔ حکومت بمبئی نے واٹسن اور کلائیو کی موجودگی سے بحری قزاق آنگریا کا زور توڑنے کے لیے پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ واٹسن اور کلائیو نے اس کے مستقر گیریا پر قبضہ کرلیا اور اس طرح ہندوستان کے مغربی ساحل پر انگریزی تجارتی جہازوں کو کوئی کھٹکا باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد واٹسن اور کلائیو مدراس روانہ ہوگئے۔ کلائیو کو مجلس نظماء نے فورٹ سینٹ ڈیوڈ کا گورنر مقرر کردیا تھا۔ حکومت مدراس بھی اس زمانے میں یہ سوچ رہی تھی کہ صلابت جنگ کی مدد کے لیے انگریزی فوج بھیجے اس واسطے کہ صلابت جنگ نے بسی سے ناچاقی کے باعث خود مدد طلب کی تھی۔ چنانچہ مدراس کونسل کا خیال ہوا کہ کلائیو کی سرکردگی میں دکن فوج بھیجی جائے۔ لیکن جب بنگال سے تشویش ناک خبریں پہنچیں تو رابرٹ اورم کے اصرار پر جو مدراس کونسل کا رکن تھا اور جس نے اس زمانہ کے حالات اپنی مشہور اور مستند "ہسٹری آف دی ملٹری ٹرانزاکشنس آف دی برٹش نیشن ان ہندوستان" میں لکھے ہیں، مدراس کونسل نے دکن کی مہم کا منصوبہ ترک کردیا اور یہ فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو بنگال کو کمک بھیجنی چاہیئے۔ کونسل نے واٹسن اور کلائیو کو یہ کام سپرد کیا اور نو سو گورے سپاہ اور پندرہ سو ہندوستانی فوج ان کے ساتھ کی۔

کلائیو اور امیر البحر واٹسن ۱۵ ار دسمبر ۱۷۵۶ء کو ہگلی میں داخل ہوئے

سراج الدولہ کے سپہ سالار نے بج بج کے قلعے پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور قلعے پر کلائیو نے قبضہ کر لیا۔ یہاں سے کلائیو فورٹ ولیم کی طرف بڑھا۔ یہاں سراج الدولہ کا ایک افسر مقابلہ پر آیا لیکن اس کو بہت جلد یہ قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ اب پھر دوبارہ فورٹ ولیم کی فصیلوں پر انگریزی پرچم لہلہانے لگا۔ نواب سراج الدولہ جو مرشد آباد میں تھا یہ خبر سن کر بہت مشتعل ہوا۔ پہلے تو اس نے کوشش کی کہ فرانسیسیوں سے کچھ مدد ملے لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے چالیس ہزار کی فوج کے ساتھ فورٹ ولیم پر چڑھائی کر دی۔ کلائیو کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنی فوج لے کر فورٹ ولیم سے باہر نکل آیا تاکہ مقابلہ کرے۔ بیشتر اس کے کہ نواب کی فوج حملہ آور ہو کلائیو نے سورج نکلنے سے پہلے جب کہ ذرا اندھیرا تھا چھاپہ مارا سورج نکلنے کے بعد بھی دیر تک کہر چھائی ہوئی تھی۔ اسی کہر میں کلائیو کی توپوں نے نواب کی فوج میں کھلبلی ڈال دی۔ خود نواب کے ہوش خطا ہو گئے اور اس نے گھبرا کر صلح کی تحریک کر دی۔ چنانچہ ۹ فروری ۱۷۵۷ء کلائیو اور سراج الدولہ میں یہ معاہدہ ہوا کہ کمپنی کے تمام بنگالی مقبوضات واپس کر دئے جائیں گے۔ فورٹ ولیم پر استحکامات تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے گی اور انگریز اپنی ٹکسال قایم کرنے کے مجاز ہوں گے۔ غرض کہ ان شرائط پر کلائیو پہلا معرکہ جیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ عنقریب پھر انگریزوں کو سراج الدولہ سے لڑنا پڑے گا اس لیے وہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن نہیں ہوا۔ چونکہ اس زمانہ میں بنگال میں فرانسیسیوں اور ڈچ لوگوں کی کوٹھیاں موجود تھیں جن میں کافی تعداد میں سپاہ رہتی تھی اس لیے کلائیو نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ عارضی طور پر سراج الدولہ سے صلح و صفائی ہو جائے۔

چندر نگر کی فتح

اس معرکہ کے کچھ دنوں بعد ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں میں یورپ میں جنگ شروع ہو گئی جو تاریخ میں جنگ ہفت سالہ کے نام سے مشہور ہے۔ کلائیو کو اندیشہ ہوا کہ

کہیں نواب سراج الدولہ فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر پھر کلکتہ پر حملہ نہ کردے۔ چنانچہ پیشتر اس کے کہ اس کی نوبت آئے کلائیو نے خود چندرنگر پر حملہ کرنے میں پیش قدمی کردی جہاں سات سو فرانسیسی فوج تھی اور ہندوستانی فوج اس کے علاوہ تھی جس کو فرانسیسی افسروں نے مغربی طریق جنگ اور قواعد پریڈ سکھائی تھی۔ اگر سراج الدولہ کے لکھنے کے مطابق بُسی شمالی سرکار سے بنگال کی طرف آجاتا اور پانڈیچری سے فرانسیسی لوگوں کو کمک پہنچ جاتی تو انگریزوں کے لیے بنگال میں بڑی دشواری پیش آجاتی۔ پھر نواب سراج الدولہ اور کلائیو میں جو معرکہ ہوا اس سے اول الذکر کی قوت میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی اور نہ اس کے کس بل میں کوئی فرق آیا تھا۔ لیکن چونکہ پانڈیچری سے ابھی حال میں بُسی کو دکن میں کمک بھیجی جاچکی تھی اس لئے فرانسیسی حکومت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ بنگال کو کافی تعداد میں سپاہ بھیجی جاسکتی۔ پھر کرناٹک میں فرانسیسی مفاد کی حفاظت کے لیے فوج رکھنا ضروری تھا۔ غرض کہ واٹسن نے دریا کے راستے سے چندرنگر پر بڑے زور کی گولہ باری کی اور کلائیو نے خشکی کے راستے سے حملہ کردیا۔ فرانسیسیوں نے نو دن تک جم کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر انھیں ہار ماننی پڑی اس واسطے کہ زیادہ عرصے تک مدافعت ممکن نہ تھی۔ انھوں نے باعزت شرائط پر چندرنگر کو مارچ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اکثر فرانسیسی افسروں نے بھاگ کر مرشدآباد میں پناہ لی جہاں ژان لا پہلے سے فرانسیسی حکومت کے ایجنٹ کی حیثیت سے موجود تھا اور اس کا دربار کے معاملات میں اچھا خاصہ اثر تھا۔

سراج الدولہ نے شروع میں کلائیو کو اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چندرنگر پر حملہ کرے گا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں وہ اپنے وعدے سے پلٹ گیا اور اس نے بُسی کو بنگال آنے کی دعوت دی اور مدد دینے کا پورا وعدہ کیا۔ بات یہ تھی کہ سراج الدولہ اس وقت انگریزوں سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا تھا اس واسطے کہ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے (جنوری ۱۷۵۷ء میں) دہلی پر حملہ کرکے مغلیہ دارالسلطنت کو خوب لوٹا تھا۔ سراج الدولہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ادھر ہوتا ہوا بنگال

کا رخ نہ کرے۔ ایسی حالت میں سراج الدولہ انگریزوں سے دوستی اور اتحاد قایم رکھنا چاہتا تھا تاکہ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی صورت میں اسے ان کی مدد حاصل ہو سکے۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد سراج الدولہ کو کوئی خدشہ باقی نہ رہا۔ چنانچہ اس کی حکمت عملی فوراً بدل گئی۔ اب پھر وہ انگریزوں کو نیچا دکھانے کے منصوبے سوچنے لگا۔ لیکن بُسّی کو بنگال بلانے اور فرانسیسیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں کھڑا کرنے کی جو تدبیریں اس نے کیں وہ الٹی پڑیں۔ ان میں کوئی بھی کامیاب اور کارگر نہ ہو سکی۔

چندر نگر کی فتح سے انگریزوں کی دھاک سارے بنگال میں بیٹھ گئی۔ لڑائی کے زمانے میں بنگال سے جہازوں پر لد لد کر بے شمار غلہ اور دوسرا سامان بوربن اور ماریشس کے جزیروں کو بھیجا جاتا تھا چندر نگر کی تسخیر کے بعد فرانسیسیوں کے لیے بنگال کے وسائل ختم ہو گئے۔ چنانچہ بعد میں فرانسیسیوں کو اپنے مختلف مقبوضات میں سامان غذا کی قلت بہت محسوس ہوئی جس کی فراہمی میں انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اگرچہ انگریزوں نے چندر نگر پر قبضہ کر لیا تھا جو بنگال میں فرانسیسیوں کا بڑا زبردست مرکز تھا اور نواب سراج الدولہ سے انھوں نے معاہدہ کیا تھا اس سے بظاہر ان کا اثر بنگال میں مستحکم ہو چلا تھا لیکن پھر بھی انھیں اب تک اپنے اوپر پورا اعتماد تھا۔ وہ نواب سراج الدولہ سے برابر خائف رہتے تھے۔ مرشدآباد کے سیٹھ ساہوکاروں سے تجارت کے سلسلے میں پہلے سے ان کے تعلقات تھے۔ ان ساہوکاروں اور کمپنی کے ملازموں میں نفع اندوزی کے لیے سٹا بٹا خوب چلتا تھا۔ بعض ساہوکاروں کو نواب سراج الدولہ سے محصولات کی وصولی کے ضمن میں کچھ شکایت پیدا ہو گئی۔ کلائیو نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک دولت مند تاجر اُمی چند نامی کے توسط سے ساہوکاروں اور کلائیو میں سراج الدولہ کے خلاف سازباز شروع ہوا۔ اسی اثنا میں

نواب کی بدمزاجی کی وجہ سے دربار کے بعض امرا اور افسر بھی اس کے خلاف ہو گئے۔ میر جعفر جو نواب علی وردی خاں کا برادر نسبتی اور نواب سراج الدولہ کی فوج کا بخشی تھا، نواب سے ناراض ہوگیا۔ کلائیو نے سیٹھ ساہوکاروں کو چھوڑ کر امی چند کے ذریعے سے اس سے گفت وشنید شروع کردی۔ چنانچہ دونوں میں ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ انگریز سراج الدولہ کو نوابی سے برطرف کرکے میر جعفر کو بنگال کا نواب تسلیم کریں گے جس کے معاوضے میں میر جعفر انھیں ایک کروڑ تیرہ لاکھ روپئے نقد ادا کرے گا۔[1] اور اس کے علاوہ انگریز افسروں کو انعام واکرام دئیے جائیں گے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو قاسم بازار اور ڈھاکہ کی کوٹھیوں میں قلعہ بندی کی اجازت ہوگی۔ ۱۷۱۷ء کے شاہی فرمان کے بموجب انگریزوں کو بنگال میں جو تجارتی حقوق ومراعات حاصل ہوئی ہیں وہ برقرار رہیں گی۔ کلکتہ کے حدود میں برطانوی اقتدار تسلیم کیا جائے گا اور اس کے قریب چوبیس پرگنہ بطور جاگیر کمپنی کو دئیے جائیں گے جن کی آمدنی سے فوجی اخراجات کی پابجائی کی جائے گی۔ نواب کے مستقر میں ایک انگریز ایجنٹ رہا کرے گا۔ نواب ان فرانسیسیوں کو جو مرشدآباد یا بنگال میں کہیں اور پناہ گزیں ہوں اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دے گا تاکہ ان کی موجودگی سے معاملات میں آیندہ پیچیدگی نہ پیدا ہو۔ میر جعفر نے قسم کھاکر وعدہ کیا کہ انگریز سراج الدولہ سے نبرد آزما ہوں گے تو وہ عین لڑائی کے وقت مع فوج کے ان سے مل جائے گا۔

امی چند کو اگرچہ کلائیو نے ابتدائی گفت وشنید میں شریک کیا تھا لیکن بعد میں اس کے رقمی مطالبات کی وجہ سے اس سے بےتعلقی اختیار کرلی گئی۔ مندرجہ بالا معاہدہ کی بھنک کہیں سے اس کے کان میں

(1) Ormes Vol. 11, P. 188.

میں پڑی تو وہ بہت چراغ پا ہوا۔ اس نے کلائیو کو دھمکی دی کہ میں نواب سراج الدولہ کے سامنے بھانڈا پھوڑے دیتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور اس کا خمیازہ ان سبھوں کو بھگتنا پڑے گا جو اس خفیہ معاہدہ میں شریک ہیں۔ اس نے اس شرط پر خاموش رہنا منظور کیا کہ اس کو تیس لاکھ روپئے نقد دئے جائیں اور میر جعفر کے نواب ہونے کے بعد کمپنی کو اس سے جو کچھ روپیہ ملے اس کی پانچ فی صدی دستوری دی جائے (۱) کلائیو ان شرائط کو سن کر بہت سٹ پٹایا — اس نے ایک جعلی دستاویز تیار کی جس میں وہ سب شرائط درج تھیں جن کا مطالبہ امی چند نے کیا تھا اور وہ دستاویز اس کو دکھا کر اطمینان دلا دیا گیا۔ مگر اصلی دستاویز میں جس پر معاہدہ کرنے والوں نے اپنی مہریں ثبت کی تھیں ان شرائط کا کہیں ذکر بھی نہیں تھا۔ کلائیو نے اپنا فوری مقصد حاصل کرنے کے لیے جو پُر فریب طریق عمل اختیار کیا وہ ہمیشہ اس کے نام پر ایک بد نما دھبہ رہے گا۔ اس کی یہ حرکت کسی لحاظ سے بھی حق بجانب نہیں کہی جاسکتی۔ اگرچہ بعض انگریز مورخین یہ کہکر اس اخلاقی جرم کی سنگینی کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ "کلائیو اور اس کے ساتھی اس ضمن میں اس مثال پر عمل کر رہے تھے جو ڈوپلے اور بُسی نے ان کے سامنے پیش کی تھی۔ ان کی نیت خراب نہ تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اور بہت کچھ زیادہ حاصل کر سکتے تھے۔ انھوں نے وہی کیا جو ان کا کوئی اور ہم عصر ان حالات میں کرتا۔ اس لیے ہماری تنقید بجائے افراد کے اس زمانہ پر ہو تو مناسب ہے۔"(۲) لیکن باوجود اس کے یہ کہنا پڑے گا کہ برائی چاہے وہ کسی زمانے میں کی گئی ہو بہر حال برائی ہے اور اخلاقی حیثیت سے اسے کبھی بھی حق بجانب نہیں کہا جاسکتا۔ کلائیو اپنی

(1) Malcolm: Memoirs of Lord Clive. Vol.III. P.149

(2) *Dodwell. cambridge History of India Vol. V. P.151*

دانستہ میں اس حرکت کو درست سمجھتا تھا۔ چنانچہ بعد میں وہ کہا کرتا تھا کہ اگر پھر کبھی ایسا موقع آئے گا تو میں اسی طرح عمل کروں گا کیونکہ بدمعاملہ لوگوں کے ساتھ بدمعاملگی ہی سے کام چل سکتا ہے۔ بعض مخصوص حالات میں ناجائز چیز جائز ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلائیو کا معیارِ اخلاق پست تھا اور اس کے نزدیک اس میں اتنا لوچ تھا کہ حسب موقع اس کے ذریعے سے اپنا مطلب حاصل کیا جا سکتا تھا۔

جنگ پلاسی جون ۱۷۵۷ء

غرض کہ میر جعفر سے خفیہ معاہدہ طے ہو جانے کے بعد کلائیو نے سراج الدولہ کو یاددہانی کی کہ کمپنی سے فروری ۱۷۵۷ء میں اس نے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بموجب وعدہ کیا تھا کہ فرانسیسیوں سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ لیکن اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ کمپنی کے پاس اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ اس نے موسیو بسی سے مدد حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی ہے۔ سراج الدولہ نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چنانچہ کلائیو نے ساڑھے تین ہزار سپاہ اور دس توپوں کے ساتھ شمال کی جانب کوچ کر دیا اور پلاسی کے میدان میں خیمہ زن ہو گیا جو مرشدآباد سے ۲۰ میل پر تھا۔ نواب سراج الدولہ کی فوج نے جس کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھی میدان کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ نواب کی فوج کے بڑے حصے کی کمان میر جعفر کے تحت تھی جو لڑائی میں تماشہ بین کی حیثیت سے شریک رہا۔ نواب کی فوج نے جب حملہ کیا تو انگریزی توپ خانے نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس حملہ میں نواب کے سپہ سالار میر مدن کے کاری زخم لگا اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس سے نواب کی فوج میں بددلی پھیل گئی۔ اس لڑائی میں فرانسیسی دستوں نے خوب جم کر انگریزی فوج کا مقابلہ کیا لیکن آخر میں ان کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ میر جعفر عین لڑائی کے وقت مع فوج کے اس حصے کے جو اس کے تحت تھا کلائیو سے آ کر

مل گیا۔ اگرچہ بعض انگریز موزخوں کا خیال ہے کہ وہ اس وقت آ کر ملا جب کہ انگریز بالکل حاوی ہو چکے تھے۔ بہر حال اصلیت کچھ بھی ہو میر جعفر کے ملنے سے سراج الدولہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ خود سراج الدولہ مرشد آباد بھاگا اور وہاں سے بہار کی طرف نکل جانا چاہتا تھا لیکن میر جعفر کے بیٹے میرن نے اس کو گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔

پلاسی کے معرکہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کلائیو میر جعفر کے ساتھ مرشد آباد گیا اور اس کو گدی نشین کیا۔ نواب سراج الدولہ کے خزانہ کا جب جائزہ لیا گیا تو اس میں صرف ۲۵ لاکھ روپیہ نکلا حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ مقیم قاسم بازار نے اس کے متعلق جو اپنا اندازہ پیش کیا تھا وہ ۲ ½ کروڑ روپے تک پہنچتا تھا۔ معاہدہ میں جو رقم طے ہوئی تھی اسے پورا ادا کرنے اور انگریز افسروں کو انعام واکرام عطا کرنے کے لیے خزانہ میں رقم کافی نہ تھی۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ میر جعفر یہ رقم باقساط ادا کرے گا۔ امی چند کو کلائیو نے جو رقم دینے کا وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے امی چند کی دماغی حالت متاثر ہو گئی اس لیے کہ اس کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔

جنگ پلاسی کے بعد اگرچہ میر جعفر برائے نام بنگال پر حکمران تھا لیکن حقیقی حکومت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ میر جعفر کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں جنھیں کلائیو نے انگریزی فوج کے ذریعے فرو کیا اور اس کی بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنے کا ذمہ لیا۔ اب بنگال میں صرف انگریزوں کی فوج موجود تھی جو اندرونی امن کے قیام اور بیرونی حملہ کی صورت میں مقابلہ پر آ سکتی تھی۔ کلائیو اب تک حکومت مدراس کا ملازم تھا لیکن ۱۷۵۸ء میں مجلس نظما نے اس کو فورٹ ولیم کا گورنر مقرر کر دیا۔ یہ زمانہ تقریباً وہی ہے جب فرانسیسی حکومت نے لالی کو کرناٹک روانہ کیا تھا۔ کلائیو نے میر جعفر کو اپنے قابو میں رکھا اور جب اس نے پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر سے خط و کتابت کرنے کی کوشش کی تو اس کو

ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

شہزادہ علی گوہر کا بہار پر حملہ

عالمگیر ثانی کا بیٹا شہزادہ علی گوہر جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے نام سے مشہور ہوا اور وزیر غازی الدین سے تنگ آکر دہلی سے نکل کھڑا ہوا، پہلے کچھ دنوں رہیلکھنڈ کے رہیلہ سرداروں کے پاس رہا۔ اس کے بعد اس نے پورب کا رخ کیا۔ اس کو اطلاع تھی کہ بہار اور بنگال میں بڑی گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ شہزادہ نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ اس کے باپ نے بہار اور بنگال کے صوبے اس کے حوالے کر دیئے ہیں[1]۔ اس زمانے میں میر جعفر کی بدانتظامی سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پلاسی کی فتح کے بعد کوئی معقول نظم و نسق اب تک قائم نہیں کیا تھا۔ بقول سیر المتاخرین اب لوگ میر جعفر کے ظلم اور کنجوسی سے پریشان ہو کر سراج الدولہ کے زمانے کو حسرت سے یاد کرتے تھے[2]۔ غرضکہ شہزادہ علی گوہر کے ساتھ بہار کے اکثر زمیندار مل گئے۔ نواب شجاع الدولہ والی اودھ نے بھی اسے مدد دی۔ شہزادہ (۴۰) ہزار فوج لے کر پٹنہ کے قریب پہنچ گیا۔ بہار میں میر جعفر کی طرف سے رام نارائن صوبیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ پہلے تو شہزادہ سے مل گیا لیکن بعد میں الگ ہو گیا۔ اس نے کلائیو کے پہنچنے تک پٹنہ کو بچائے رکھا۔

میر جعفر کو جب یہ سب ماجرا معلوم ہوا تو اس نے کلائیو کو لکھا کہ جیسے بھی ہو پٹنہ کو بچاؤ ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔ اگرچہ کلائیو اپنی فوج کا نصف حصہ کرنل فورڈ کی ماتحتی میں شمالی سرکار روانہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی اس کی حوصلہ مندی میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ کوچ پر کوچ کرتا ہوا بنہ

ل Mill; History of India Vol. III, P 254

ل سیر المتاخرین، ص ۲۴۵

پہنچ گیا۔ میر جعفر کا لڑکا میرن بھی اس کے ہمراہ تھا۔ شہزادہ علی گوہر کے حوصلے پست ہو گئے اور بغیر مقابلہ کئے اس نے راہ فرار اختیار کی۔ کلائیو نے اس کا پیچھا کر کے اس کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ نے اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور وعدہ کیا کہ اب وہ بہار اور بنگال کی طرف آئندہ کبھی رخ نہ کرے گا۔ اکبر و عالمگیر کے اس جانشین کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ سب ساتھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اس کے پاس خرچ کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ چنانچہ کلائیو نے اس کو ۸ ہزار روپے بطور عطیہ دئے اور اس نے اپنی راہ لی۔

چنسورہ کی لڑائی ۱۷۵۹ء

کلائیو نے صرف یہ ہی نہیں کیا کہ بنگال میں ایسے شخص کو نواب مقرر کیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مرضی کا تابع فرمان تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی دوسری یورپین قوتوں کو بنگال میں ختم کر دیا۔ چنسورہ میں ولندیزوں (ڈچ) کی کوٹھی عرصے سے موجود تھی اور ان کی تجارت کی حالت بھی اچھی خاصی تھی۔ جاوا کے ولندیزی گورنر کو جب بنگال کے حالات کی اطلاع ہوئی تو اس کو سخت ناگوار ہوا کہ جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں نے پورے بنگال کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا ہے۔ کچھ دنوں بعد میر جعفر کو بھی انگریزوں کا اقتدار ناگوار ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے ولندیزی لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکایا تاکہ ان میں آپس میں جھگڑا شروع ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے کھوئے اقتدار کو بنگال میں حاصل کر سکے۔ لیکن یہ ایک موہوم امید تھی جو کبھی پوری نہ ہوئی۔ جاوا کے ولندیزی گورنر نے خیال کیا کہ اس وقت بنگال میں گڑبڑ مچی ہوئی ہے اور ابھی تک حالات نے کوئی معین صورت نہیں اختیار کی ہے چلو اس وقت ہم بھی قسمت آزمائی کریں۔ ولندیزیوں کو کلائیو سے یہ بھی شکایت تھی کہ اس نے ان کی شورہ کی تجارت کو بذریعہ حکم بند کر دیا تھا جو فرانسیسیوں کے ساتھ تھی اس لیے کہ شورہ جنگی ضروریات میں کام آتا ہے۔ اسی طرح

ان کی افیون اور کپڑے کی تجارت کو بھی انگریزوں نے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ چنسورہ کے ولندیزیوں نے جاوا لکھا اور امداد طلب کی۔ وہاں کے گورنر نے میر جعفر کی مدد کے بہانے سے بیڑہ روانہ کیا۔ اگرچہ بظاہر اس نے میر جعفر کو انگریزوں کے اثر سے آزاد کرنے کے لیے لیکن حقیقت میں خود اپنی قوم کے منصوبوں کو ترقی دینے کے لیے سات جہازوں کا ایک بیڑا چنسورہ بھیج دیا جس کے ساتھ سو یورپین اور آٹھ سو قواعد دان ملایا کے دیسی سپاہی تھے۔ لیکن چنسورہ میں ولندیزیوں کا جو اصلی افسر تھا اس میں ہمت اور قوت فیصلہ کی کمی تھی۔ پیشتر اس کے کہ جاوا سے بیڑہ چنسورہ پہنچے کلائیو نے پیشقدمی کر کے ہگلی ہی میں اس کو روک دیا۔ کموڈور ولسن نے کلائیو کے حکم سے تمام جہازوں کو گرفتار کر لیا۔ کلائیو نے کرنل فورڈ کو حکم دیا کہ خشکی پر ولندیزیوں کی فوجوں پر حملہ کر دے۔ کرنل فورڈ کو ولندیزوں پر حملہ کرنے میں ذرا تامل تھا اس واسطے کہ یورپ میں انگریزوں سے ان کے دوستانہ تعلقات قایم تھے۔ چنانچہ اس نے کلائیو سے تحریری حکم طلب کیا۔ جب فورڈ کا خط کلائیو کو پہنچا تو وہ اس وقت بعض احباب کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ چنانچہ کرنل فورڈ کے خط کی پشت پر پنسل سے اس نے یہ الفاظ لکھ دیئے "ان سے فوری جنگ کرو۔ میں تمہارے پاس کونسل کا تحریری حکم کل بھیج دوں گا"۔ غرضکہ ولندیزوں کو شکست دے کرنل فورڈ نے ان کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ ولندیزوں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور کلائیو کی تمام شرطوں کو مان لیا جن میں اہم شرطیں یہ تھیں کہ وہ بنگال میں ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج رکھنے کے مجاز نہ ہوں گے اور انگریزوں کو دس لاکھ روپیہ بطور ہرجانہ ادا کریں گے۔ چنسورہ کی کوٹھی ولندیزوں کو واپس کر دی گئی۔ اس طرح فرانسیسیوں اور ولندیزوں دونوں کو کلائیو نے نیچا دکھایا۔ اب آئندہ تین سال تک اس کو کوئی ایسا خطرہ بنگال میں پیش نہ آیا جس سے برطانوی اقتدار کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بنگال کی آب و ہوا سے کلائیو کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ فروری سنہ ۱۷۶۰ء میں انگلستان چلا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال

تھی ۔ اس نے کرناٹک اور بنگال دونوں جگہ انگریزوں کی سیاسی حیثیت کو کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ ۱۷۵۶ء میں بنگال میں انگریزوں کی حیثیت معمولی تاجروں کی تھی لیکن ۱۷۶۰ء میں وہ دروبست کے مالک بن گئے تھے ۔ نواب بنگال ان کا آوردہ تھا ۔ کلائیو جب پہلی گورنری ختم کر کے انگلستان گیا تو بنگال میں کوئی یورپین قوم انگریزوں کی مدِمقابل باقی نہیں رہی تھی ۔ فرانسیسی اور ولندیزی دونوں کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور اس کا امکان نہ تھا کہ پھر کبھی وہ بنگال میں انگریزوں کی بالادستی میں خلل ڈال سکیں گے ۔ دراصل انگریزی اثر اب بنگال کے آگے اودھ تک پہنچ چکا تھا اور ان کی فوجی دھاک اس [illegible] علاقے میں بیٹھ گئی تھی ۔ بنگال کے وسائل ہاتھ آجانے سے مدراس میں انگریزوں کی [illegible]است پر بڑا اثر پڑا اور فرانسیسی وہاں بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکے ۔ کلائیو نے انگلستان جاتے وقت یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کو بنگال پر باہر سے حملہ کرنے والے کا ڈر نہیں لیکن اگر اسے ڈر ہے تو اندرونی بدانتظامی کا ہے۔ اس کا یہ خدشہ درست تھا۔ اس نے ونسی ٹارٹ کو بنگال کی گورنری پر اپنا جانشین مقرر کیا جو اگرچہ ایماندار اور فرض شناس شخص تھا لیکن اس میں انتظامی قابلیت نہیں تھی ۔ اخلاقی جرات کی بھی اس میں کمی تھی ۔ کلائیو کے جانے کے بعد چند مہینے کے لیے ہالول گورنری کے فرائض انجام دیتا رہا اور ونسی ٹارٹ کے مدراس سے کلکتہ پہنچنے پر اس نے اس کو جائزہ دے دیا ۔

ونسی ٹارٹ کے عہد میں بدانتظامی ۔

ونسی ٹارٹ کے عہد حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کھلم کھلا رشوتیں لیتے اور تحفے تحائف دولت مند ہندوستانیوں سے وصول کرتے تھے ۔ ان کی زیادہ دلچسپی نجی تجارت کے ذریعے روپیہ کمانے تک محدود تھی ۔ پھر ونسی ٹارٹ کی سب سے بڑی پریشانی جس کی وجہ سے بنگال کے نظم ونسق پر برا اثر پڑا یہ تھی کہ اس کی

کونسل کے ارکان سب کے سب اس کے سخت مخالف تھے۔ وہ ہر معاملے میں مخالفت کرتے اور اس کی کسی تجویز کو منظور نہیں ہونے دیتے تھے۔ اسی اثناء میں شاہ عالم نے جو پہلے علی گوہر کے نام سے مشہور تھا بہار پر دوبارہ حملہ کر دیا لیکن میجر کیلیاڈ نے جو اس وقت بہار میں انگریزی فوجوں کا اعلیٰ افسر تھا اس کو پسپا کر دیا۔ شاہ عالم نے پھر سے دوستانہ تعلقات کی تجدید کی اور آئندہ کے لیے اتحاد و موافقت کا پکا وعدہ کیا۔

میر جعفر کی نکمی حکومت بالکل دوالیہ ہو چکی تھی۔ ملکی انتظام میں ہر طرف ابتری کے آثار نمایاں تھے۔ میر جعفر کا لڑکا میرن میجر کیلیاڈ کے ساتھ بہار میں تھا جب کہ اتفاق سے اس کے خیمہ پر بجلی گری اور وہ جلکر خاکستر ہو گیا۔ میر جعفر کی دماغی حالت پر اس حادثہ کا بہت برا اثر ہوا اور اس کی رہی سہی انتظامی لیاقت بھی ختم ہو گئی۔ نواب کی فوجوں نے اپنی چڑھی ہوئی تنخواہوں کا تقاضہ شروع کر دیا اور نواب کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ میر جعفر کے داماد میر قاسم نے معاملے کو رفع دفع کیا اور وہ خود کلکتہ گیا تاکہ انگریزی کونسل سے مالی امداد کی درخواست کرے۔ ہالول اور ونسی ٹارٹ کے بیچ میں پڑنے سے کونسل نے فیصلہ کیا کہ میر جعفر کو گدی سے برطرف کر کے میر قاسم کو اس کی جگہ بنگال کا نواب بنایا جائے تاکہ صوبے کے نظم و نسق کی حالت جو دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی درست ہو سکے۔ ونسی ٹارٹ انگریزی فوج لے کر میر جعفر کو معزول کرنے کی غرض سے مرشد آباد گیا اور با دل ناخواستہ میر جعفر اس پر آمادہ ہوا کہ وہ مرشد آباد سے کلکتہ آ جائے اور وہیں سکونت اختیار کرے۔ میر قاسم نے کونسل کے ارکان کو بیس لاکھ روپے اور جنوبی بنگال میں بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے زرخیز اضلاع بطور انعام عطا کئے۔ ونسی ٹارٹ نے جس کے متعلق انگریز مورخ کہتے ہیں کہ وہ بڑا ایماندار شخص تھا، سات لاکھ روپے بطور نذرانہ وصول کئے۔

میر قاسم منتظم شخص تھا۔ اس نے ان دیسی عہدہ داروں کو چن چن کر برطرف کیا جو رعایا پر ظلم کرتے یا زیادہ ستانی سے اپنی جیبیں گرم کرتے تھے۔ اس نے لگان اراضی پر نظر ثانی کی اور اپنی قلمرو کی آمدنی میں تقریباً ایک کروڑ

کا اضافہ کیا۔ وہ انگریزوں کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا بلکہ با اختیار صوبہ دار کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اور انگریزی حکام میں تجارتی محصولات کے تعین کے متعلق ان بن ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم نجی تجارت سے خوب مالا مال ہو رہے تھے اس واسطے کہ انھیں کسی قسم کا کوئی محصول نہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف تو کمپنی کی حکومت فوجی اخراجات کی پابجائی کے لیے نواب سے امدادی رقم طلب کرتی رہتی تھی اور دوسری جانب کمپنی کے ملازمین محصول سے اپنا استثناء ثابت کر کے نواب کی حکومت کی آمدنی پر کاری ضرب لگا رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ اصول عمل زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ فرخ سیر کے فرمان (۱۷۱۷ء) اور نواب میر جعفر کے معاہدے کی رُو سے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے مال کو محصولات سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ انگریز تاجروں نے اس کی یہ توجیہہ کی کہ اندرون ملک کی تجارت پر ان سے کوئی محصول نہیں لیا جا سکتا[1]۔ ہندوستانی تاجروں نے بھی اپنا مال محصول سے بچانے کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ وہ بھی کمپنی کے ملازموں سے کچھ رشوت دے دلا کر پروانے (دستک) حاصل کر لیتے تھے اور جن کشتیوں میں ان کا مال دریا کی راہ سے جاتا تھا ان پر انگریزی جھنڈا لگا دیتے تھے۔ بعض دفعہ نواب کے ملازموں نے اس قسم کی کشتیاں گرفتار کیں اور دیسی تاجروں کی چوری پکڑی لیکن چونکہ ان پر انگریزی جھنڈا ہوتا تھا اس لئے ان کو چھڑانے کے لیے کمپنی کی فوج استعمال کی جاتی تھی۔ جب اس قسم کے تصادم زیادہ ہونے لگے تو ونسی ٹارٹ نے میر قاسم سے یہ طے کر لیا کہ کمپنی کے ملازموں کے تجارتی مال پر نو روپے سیکڑہ محصول لگایا جائے حالانکہ دیسی تاجروں کو معمولاً چوبیس فیصدی اور نمک پر چالیس فیصدی محصول دینا پڑتا تھا[2]۔ جب ونسی ٹارٹ کلکتہ واپس آیا تو اس کی کونسل کے ارکان نے اس معاہدہ کی توثیق کرنے سے قطعی

۱۔ Dodwell, Dupleix and Clive. p.216.

۲۔ The cambridge History of India Vol. V. P. 172

طور پر انکار کر دیا جو اس نے میر قاسم کے ساتھ کیا تھا اور یہ فیصلہ کیا کہ نواب صرف نمک کی تجارت پر ڈھائی روپے فی صد سے زیادہ محصول عاید کرنے کا کسی حالت میں بھی مجاز نہیں ہو سکتا اور اس کے حکام کو انگریزی تجارتی گماشتوں کو گرفتار کرنے یا ان پر مقدمہ عاید کرنے کی اجازت نہ ہو گی۔ جب میر قاسم کو یہ معلوم ہوا تو اس نے ۱۷۶۳ء میں تنگ آ کر تمام تجارتی محصول ہر ایک کے لیے چاہے وہ ملکی تاجر ہو یا غیر ملکی، معاف کر دئے تاکہ انگریز تاجروں کو دیسی تاجروں پر کوئی ترجیح نہ باقی رہے۔ کمپنی کے اعلےٰ حکام کو یہ انتظام بھی پسند نہیں آیا اس واسطے کہ وہ چاہتے تھے کہ دیسی تاجروں سے تو حسب سابق محصول وصول کیا جائے لیکن انگریز تاجروں سے کچھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ کلکتہ کونسل نے یہ تجویز منظور کی کہ میر قاسم کو چاہئے کہ دیسی تاجروں پر جن کا مال صوبے میں سے ہو کر گزرتا ہے وہی شرح محصول قایم رکھے جو پہلے سے چلی آ رہی تھی اور صرف اس مال کو محصول سے مستثنےٰ کیا جائے جو انگریزی جھنڈے کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بنگال میں بھیجا جائے۔ ونسی ٹارٹ اور وارن ہیسٹنگز نے جو بنگال کونسل کے رکن تھے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ کونسل کے دوسرے سب ارکان کا اصرار تھا کہ کمپنی کے ملازموں کو میر جعفر کے زمانہ سے جو تجارتی حقوق حاصل رہے ہیں ان میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہو سکتی اور کمپنی کے ملازمین کی تجارت پر نواب بنگال کے گماشتوں کو نگرانی کا کوئی حق نہیں ہونا چاہئے۔ غرضکہ اب ایسا محسوس ہونے لگا کہ نواب اور کمپنی کے ملازموں کے مفاد اس قدر ایک دوسرے سے متصادم ہیں کہ مفاہمت کی کوئی شکل نہیں۔ مفاہمت کی شکل اسی وقت ممکن تھی کہ یا تو نواب کٹھ پتلی بننے پر آمادہ ہو جاتا اور یا کمپنی کے ملازم اپنے مخصوص مراعات سے دستبردار ہو جاتے۔ ان حالات میں کمپنی اور میر قاسم کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ میر قاسم نے اپنے آپ کو کلکتہ کونسل کے اثر سے آزاد کرنے اور با اختیار صوبہ دار بننے کے لیے اپنے صدر مقام کو مرشد آباد سے مونگیر منتقل کر دیا اور وہاں کے قلعے کو خوب مستحکم کر لیا۔ اس نے نواب اودھ شجاع الدولہ سے بھی گہرے دوستانہ تعلقات

پیدا کر لیے تا کہ ضرورت کے وقت اس سے انگریزوں کے خلاف مدد مل سکے۔ تین سال کے اندر اس نئے پچیس ہزار سوار اور پندرہ ہزار پیدل فوج بھرتی کر لی اور ایک بڑا اسلحہ خانہ بھی قائم کر لیا جہاں ٹوپی دار بندوقیں بنتی تھیں اور یورپین ماہروں کی نگرانی میں توپیں ڈھالی جاتی تھیں۔ بعض انگریز افسروں نے بھی جو کمپنی کی ملازمت بعض ذاتی شکایتوں کی بناء پر ترک کر چکے تھے میر قاسم کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے علاوہ دو ارمنی افسر سمرو اور مارکو بھی اس کے ہاں ملازم تھے۔ کلائیو اور کلیاڈ کے انگلستان چلے جانے کے بعد میر قاسم کا خیال تھا کہ اعلیٰ فوجی قابلیت کے افسر فورٹ ولیم میں موجود نہیں ہیں۔

اس وقت پٹنہ کی انگریزی کوٹھی مسٹر ایلس کے زیر اہتمام تھی۔ ایلس بڑا تند مزاج اور مغرور شخص تھا۔ وہ عرصے سے اس فکر میں تھا کہ میر قاسم کو نیچا دکھائے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ ونسی ٹارٹ نے دو انگریزوں کو جن کے نام امیٹ اور ہے Haye تھے، میر قاسم سے مزید گفت و شنید کے لیے روانہ کیا ہے تو اسے ونسی ٹارٹ کے خلاف بہت غصہ آیا۔ اس کے خیال میں نئے نواب کے ساتھ جو گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا اس سے سوائے انگریز قوم کی ذلت کے اور کچھ نہ حاصل ہوگا۔ ایلس اور میر قاسم کے عہدہ داروں میں پہلے سے رنجش چلی آ رہی تھی۔ جب میر قاسم کے نئے احکام پٹنہ میں نافذ کیے گئے تو ایلس نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا اور شہر پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں نواب کے سپہ سالار میر مہدی خاں کو جب یہ خبر ملی تو اس نے میر قاسم کی اجازت سے پٹنہ پر حملہ کر کے انگریز فوج کو شکست دی۔ بہت سے یورپین سپاہی مارے گئے اور گرفتار ہوئے۔ میر قاسم نے حکم دے دیا کہ اس کے زیر حکومت علاقوں میں جہاں کہیں بھی انگریز ملیں انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ پٹنہ کی لڑائی میں جو ڈیڑھ سو انگریز قیدی گرفتار کئے گئے تھے وہ میر قاسم کے ارمنی افسر سمرو کے حکم سے جو پہلے فرانسیسی فوج میں ملازم تھا قتل کر دئے گئے۔ اس پر بنگال کونسل نے جولائی ۱۷۶۳ء میں میر قاسم کو صوبیداری سے برطرف کر کے اس کی جگہ دوبارہ میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا اور

میر قاسم کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ میر جعفر نے نواب ہونے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ کمپنی کے ملازموں سے کسی قسم کا تجارتی محصول حسب سابق نہ وصول کیا جائے۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ میر قاسم کی حکمت عملی سے کمپنی اور اس کے ملازموں کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی پابجائی کی جائے گی۔ میر قاسم نے جو تین ضلعے کمپنی کے حوالے کئے تھے ان کی بھی میر جعفر نے توثیق کر دی۔ اور یہ بھی طے ہوا کہ جب تک میر قاسم کے خلاف جنگ کا سلسلہ جاری ہے میر جعفر انگریزوں کو پانچ لاکھ روپیہ مہینہ ادا کرتا رہے گا۔

جنگ بکسر ۱۷۶۴ء انگریزوں کی طرف سے میر قاسم کے خلاف حملہ کی بڑے پیمانہ پر تیاریاں شروع ہوگئیں میجر جان ایڈمس نے میر قاسم کی فوجوں کو کٹوا اور گھیریا کے مقام پر شکست دی۔ لیکن یہ لڑائیاں فیصلہ کن نوعیت نہیں رکھتی تھیں۔ میر قاسم کی فوجی قوت بدستور قایم تھی۔ اس اثنا میں میر قاسم نے انگریزوں کے خلاف شاہ عالم اور نواب اودھ کو ملانے کی کوشش شروع کر دی۔ اور نومبر ۱۷۶۳ء میں وہ خود اودھ چلا گیا۔ نواب اودھ شجاع الدولہ بہار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ چند مہینے کی تیاری کے بعد پچاس ہزار کے لشکر کے ساتھ پٹنہ کی طرف بڑھا۔ اڈمس اور کارنک کی سپہ سالاری میں انگریزی فوج میں جو دیسی سپاہ تھی اس میں تنخواہ کے اضافہ اور بھتے کے متعلق بڑی بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی کارنک کے تحت شجاع الدولہ کی فوج سے پٹنہ کے قریب جو جھڑپیں ہوئیں ان میں نواب اودھ کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن انگریزی فوج پیچھے ہٹ گئی۔ کارنک اپنی فوج کے ساتھ رسد کی سہولت کے مدنظر پٹنہ کے بالکل قریب آکر خیمہ زن ہوگیا۔ اس دوران میں میجر ہکٹر منرو کو کمپنی کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی۔ میجر موصوف نے جب کارنک سے اپنی خدمت کا جائزہ لیا تو کمپنی کی فوج میں بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ منرو نے نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے سخت گیری کی اور دیسی فوج کے پچیس سرغنوں کو فوجی عدالت کے سامنے پیش کرا کے توپ سے

اڑ دیا۔ دیسی فوج کی بغاوت فرو ہوگئی اور امن قائم ہوگیا۔ بارش کا موسم ختم ہونے پر منرو بکسر کی طرف بڑھا جہاں نواب اودھ پڑاؤ ڈالے پڑا ہوا تھا۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۷۶۴ء میں ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں نواب اودھ کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ اپنا تمام ساز و سامان اور ایک سو تیس توپیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ انگریزوں کی فوج کے ۸۴۷ آدمی مارے گئے اور نواب اودھ کے لشکر میں سے تقریباً دو ہزار سپاہی کھیت رہے۔ شاہ عالم نے بھاگنے کے بجائے اپنے آپ کو منرو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور خود آکر اس سے مل گیا۔ بکسر کی جنگ جدید ہند کی تاریخ میں فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ پلاسی کی جنگ کے بعد انگریزوں کے قدم بنگال میں جم گئے لیکن بکسر کی جنگ کے بعد انھیں شمال مشرقی ہند میں وادی گنگا کے تمام علاقوں کا حقیقی اقتدار حاصل ہوگیا۔ پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے بنگال کے ایک صوبہ دار کو شکست دی تھی لیکن بکسر کی جنگ میں مغل شہنشاہ اور نواب وزیر دونوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا جس سے سارے ہندوستان میں انگریزوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزی فوجیں اودھ تک بڑھتی ہوئی چلی گئیں اور بنارس، چنار، الہ آباد، فیض آباد اور لکھنؤ پر قبضہ کرلیا۔ نواب اودھ کی فوجوں نے کڑہ اور کالپی کے مقامات پر مقابلے کی کوشش کی لیکن ان کے پاؤں نہ جم سکے۔ شجاع الدولہ نے رہیلکھنڈ میں جاکر پناہ لی۔ شجاع الدولہ نے کمپنی کو پچاس لاکھ روپیہ تاوان ادا کرنے اور انگریزی فوج کے سپہ سالار کو پیش قرار نذرانہ دینے کی استدعا کی لیکن بنگال کونسل کلائیو کی انگلستان سے واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ چنانچہ شجاع الدولہ کو اپنی ابتدائی گفت و شنید میں جو اپنے ملک کی واگزاشت کے لیے اس نے شروع کی تھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس گفت و شنید میں اس واسطے اور بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کہ بنگال کونسل کا اصرار تھا کہ میر قاسم کو ان کے حوالہ کردیا جائے لیکن اس پر نواب اودھ آمادہ نہ ہوا۔ میر قاسم کچھ روز نواب اودھ کے ساتھ رہا اور پھر دہلی جاکر انتہائی بے بسی کی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

۱۷۶۵ء کے شروع میں میر جعفر کے انتقال کے بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے نجم الدولہ کو نواب بنگال کی گدی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کو نواب مقرر کرتے وقت بنگال کونسل نے یہ شرط کی تھی کہ اس کے مقرر کئے ہوئے وزیر کو نواب برطرف کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ وجہ یہ تھی کہ میر جعفر کے دوبارہ نواب ہونے کے بعد اس نے نند کمار کو اپنا وزیر مقرر کیا جو کمپنی کا خیر خواہ نہ تھا اور اکثر مختلف معاملات میں اس کی بنگال کونسل کے ارکان سے ان بن رہا کرتی تھی۔ لیکن بنگال کونسل اس کو برطرف کرنے کی مجاز نہ تھی۔ چنانچہ نند کمار نے میر قاسم اور شجاع الدولہ سے لڑائی کے وقت جتنی مدد کمپنی کو دینی چاہیے تھی اتنی نہیں دی تھی بلکہ بعض دفعہ اس نے روڑے اٹکانے کی کوشش کی۔ بنگال کونسل نے نجم الدولہ کو نواب مقرر کرتے وقت اور اس پر پوری طرح اپنا قابو رکھنے کے لیے یہ بھی طے کیا کہ آئندہ سے وزیر نائب صوبیدار کہلائے گا اور صوبے کا اصلی نظم و نسق اس کے ہاتھ میں رہے گا۔ چنانچہ محمد رضا خاں کو نائب صوبیدار کے عہدہ پر مقرر کیا گیا جو انگریزوں کا خاص آدمی تھا اور ان کے اشارے پر چلتا تھا۔ بنگال کونسل کے ارکان نے نجم الدولہ کو نواب مقرر کرتے وقت نذرانوں سے خوب جیبیں بھریں اور اس سے بیس لاکھ روپیہ وصول کیا۔ غرضکہ اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں کی اخلاقی حالت انتہا درجہ پست تھی۔ ان میں نظم و ضبط اور مفاد عامہ کے احساس کی کمی تھی اور ہر شخص چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لے۔

جب کلائیو پانچ سال انگلستان میں رہنے کے بعد مئی ۱۷۶۵ء میں ہندوستان واپس آیا تو کمپنی کے معاملات انتہائی ابتری کی حالت میں تھے۔ مجلس نظما نے اس کو بنگال کے گورنر اور سپہ سالاری کے پورے اختیارات تفویض کیے تھے۔ اس کو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو موجودہ بنگال کونسل کو یونہی برقرار رکھے اور چاہے تو اس کو برخاست کر کے اپنی مرضی کے موافق ایک مجلس منتخبہ (سلکٹ کمیٹی) مقرر کردے جس کی صدارت وہ خود کرے گا۔ اس مجلس کو حکومت کے جملہ اختیارات حاصل ہوں گے۔ چنانچہ کلائیو نے اپنی نامزد کردہ مجلس منتخبہ (سیلکٹ کمیٹی) بنائی جس کے مشورے سے اس نے کمپنی کے نظم و نسق

کو درست کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس کے پیش نظر سب سے پہلے ان دستوری اور سیاسی تعلقات کی نوعیت کو معین کرنا تھا جو مغل بادشاہ، نواب اودھ، صوبیدار بنگال اور کمپنی کے درمیان بکسر کی جنگ کے بعد ایک خاص شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس کو اس امر کا احساس تھا کہ انگریز ہندوستان میں اب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں حکومت کی ذمہ داری انھیں اپنے سر لینی چاہیئے۔ اودھ اور دہلی کے حکمران نیچا دیکھ چکے تھے اور پورے شمالی ہند میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ بقول کلائیو ملک کے باشندے نہ کسی پیمان وفا کے پابند ہیں اور نہ ان کی فوجیں انگریزی فوجوں کی طرح قواعد داں یا وقت پر تنخواہ پانے والی ہیں۔ اور ان میں اچھے افسر بھی ناپید ہیں۔ پھر اس میں شک وشبہہ کی کیا گنجایش ہے کہ انگریز قوم بالآخر پورے ملک کا اقتدار حاصل کر کے رہے گی۔ لیکن یہ کام اعتدال کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنا تھا تاکہ انگریزی راج کی بنیادیں مضبوط اور گہری قائم ہوں۔

کلائیو جب کلکتہ پہنچا تو نواب نجم الدولہ اس سے آکر ملا تھا۔ کلائیو نے نوجوان نواب کے متعلق اپنی ملاقات میں کوئی اچھی رائے نہیں قایم کی۔ نواب کی بے جوڑ سی باتوں سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس میں حکومت کی ذمہ داری کو سنبھالنے کی قابلیت نہیں ہے۔ محمد رضا خاں نے پچھلے دنوں جو قوت حاصل کر لی تھی اس کو بھی کلائیو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ چنانچہ جب وہ مرشد آباد گیا تو اس نے محمد رضا خاں کے وسیع اختیارات میں جو نائب صوبیدار کی حیثیت سے اس کو حاصل تھے دو اور ایسے اشخاص کو شریک کر لیا تھا جو کمپنی کے آوردہ تھے۔ نواب نجم الدولہ کو اس پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ نظامت کے اختیارات کمپنی کے سپرد کر دے جس کے معاوضے میں اس کو سالانہ ۵۳ لاکھ روپے دئے جائیں گے جن سے وہ دربار کے اخراجات اچھی طرح چلا سکتا ہے۔ کلائیو نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ جب نواب کو اس رقم کے ملنے کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ خدا کا شکر ہے کہ اب میں اطمینان سے خاطر خواہ عیش کر سکوں گا۔[1]

مرشد آباد سے کلائیو بنارس پہنچا جہاں نواب اودھ شجاع الدولہ پہلے سے موجود تھا۔ نواب سے دو مرتبہ ملاقات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ کلائیو اور نواب

Malcolm The life of the Lord Clive, Vol III P. 125 ـلـ

اودھ دونوں پہلے الہ آباد جا کر شاہ عالم سے ملیں۔ اس سے معاملات کی یکسوئی ہو جانے کے بعد کمپنی نواب اودھ سے کوئی معاہدہ کر سکے گی۔ چنانچہ دونوں الٰہ آباد پہنچے۔ شاہ عالم نے کلائیو سے شکایت کی کہ بنگال کے نواب پر اس کے ۳۲ لاکھ روپے واجب الادا ہیں جس کی ادائی کمپنی کو کرنی چاہیئے۔ اس پر کلائیو نے کہا کہ کمپنی اس قرضے کی ادائی کا ذمہ اپنے اوپر کیسے لے سکتی ہے جس کے متعلق اسے علم نہیں اور جو ایسی حکومت کے ذمہ ہے جو خود کمپنی کی مخالف تھی۔ بنگال کے معاملے کی پوری طرح یکسوئی کے لیے کلائیو نے تجویز کی کہ کمپنی سالانہ ۲۶ لاکھ روپے شاہ عالم کو حق دیوانی کے طور پر ادا کیا کرے گی بشرطیکہ بنگال، بہار، اوڑیسہ میں آئندہ سے سوائے کمپنی کے مالگزاری اور دوسرے محصولات وصول کرنے کا حق کسی دوسرے کو نہ رہے۔ ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو شاہ عالم جب کلائیو کے خیمے میں گیا تو وہاں باقاعدہ دربار منعقد کیا گیا اور شاہ عالم کو ایک کھانے کی میز پر انگریزی وضع کی گدے دار کرسی رکھ کر بٹھایا گیا جس پر معمولی زردوزی کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ بقول ایک ہمعصر فارسی مورخ کے حقوق دیوانی کا نہایت اہم معاملہ جس کے انجام دینے کے لیے مدبر وزیروں اور قابل سفیروں کے مامور کرنے کی ضرورت پڑتی اس قدر سہولت سے سرانجام پا گیا کہ ایک باربردار گدھے کی خرید و فروخت بھی غالباً اتنی جلد اور آسانی سے ممکن نہ ہوتی(۱)۔ کمپنی کو حق دیوانی ملنے کا فرمان پڑھا گیا اور شاہ عالم نے خود اپنے ہاتھ سے یہ فرمان کلائیو کے حوالہ کیا۔ کلائیو نے کڑاہ اور الہ آباد کے اضلاع نواب اودھ کی مملکت سے لے کر شہنشاہ دہلی کی خدمت میں نذر دئے تاکہ وہ اپنی شاہانہ حیثیت کو برقرار رکھ سکے۔

معاہدۂ الہ آباد

نواب اودھ شجاع الدولہ سے ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء ایک علٰحدہ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے نواب نے کمپنی کو ۵۰ لاکھ روپے بطور تاوان ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جب تک یہ رقم

(۱) سیر المتاخرین صفحہ ۳۵۲ (کلکتہ ایڈیشن)

پوری ادا نہ ہو جائے اس وقت تک چنار کے قلعے پر کمپنی کا قبضہ رہے گا۔ نواب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ میر قاسم اور سمرو سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا اور نہ کسی طرح سے ان کی امداد کرے گا۔ اگر کوئی یورپین اودھ میں آکر ملازمت اختیار کرنا چاہے یا کمپنی کی ملازمت ترک کرکے وہاں جائے تو اسے کمپنی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگر نواب کو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے فوج کی ضرورت ہو تو کمپنی فوج مہیا کرے گی جس کے اخراجات کا بار نواب اودھ کے خزانے پر ہوگا۔ کلائیو اگر چاہتا تو اس وقت اودھ کی پوری ریاست پر کمپنی کا قبضہ ہو جاتا لیکن وہ اس وقت اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار نہ تھا۔ وہ اودھ کو انگریزی اثر میں باقی رہنے دینا چاہتا تھا تاکہ اگر کبھی مرہٹے اس طرف سے بہار و بنگال کا رخ کریں تو یہ ریاست بیچ میں حد فاصل کے طور پر موجود رہے۔ اودھ کے ساتھ اس نے جو معاہدہ کیا وہ کم و بیش سو سال تک قائم رہا۔

کلائیو کے بعض مخالفوں نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے شاہ عالم کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک کیا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ چنانچہ سر آئر کوٹ، ونسی ٹارٹ اور منرو کی رائے تھی کہ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزوں کو سیدھے دہلی پہنچ کر دم لینا چاہیے تھا اور وہاں پہنچ کر شاہ عالم کے نام سے سارے ہندوستان پر انگریزی اقتدار کا اعلان کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن کلائیو اس کے خلاف تھا۔ اس نے اس وقت بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے حقوق دیوانی ہی کو غنیمت جانا۔ اگر اس سے زیادہ بڑھ کر کوئی اقدام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف والیان ملک انگریزوں کے خلاف کہیں متحد نہ ہو جائیں اور خود انگلستان میں اس پر سخت نکتہ چینی نہ کی جائے۔ کلائیو نے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے حقوق دیوانی حاصل کرنے پر جو اکتفا کیا اس سے اس کا مقصد درمیانی راستہ اختیار کرنا تھا۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ تھا اور نقصان کا کوئی خدشہ تھا ہی نہیں۔ فرانس اور ہالینڈ کی حکومتوں سے بھی حکومت انگلستان کہہ سکتی تھی کہ دیسی والیانِ ملک کے زیر سایہ انگریزوں نے حقوق حاصل کئے ہیں

نہ کہ انہیں برطرف کرے۔ اس طرح حکومت انگلستان کے لیے کسی قسم کی کوئی بین الاقوامی پیچیدگی نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خارجی دشمنوں کے علاوہ خود انگلستان میں بھی کلائیو کے دشمن موجود تھے۔ کمپنی کے ملازمین جو دولت سمیٹ کر انگلستان لے جاتے تھے اس سے دوسروں میں حسد پیدا ہو رہا تھا۔ خود پارلیمنٹ کے ارکان میں بعض ایسے تھے جو کمپنی اور اس کے ملازموں کے سخت دشمن تھے اور کھلم کھلا اس کا اظہار کرتے ہوئے بھی نہیں چوکتے تھے۔ بنگال میں کمپنی کو جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اسے ان دشمنوں سے بھی چھپانا ضروری تھا ورنہ ان کی مخالفت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ پھر نواب بنگال کمپنی کا وظیفہ خوار بن گیا جس کی آڑ میں کمپنی جو چاہتی کر سکتی تھی۔

دو عملی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے حقوق دیوانی ملنے سے ان علاقوں میں دو عملی کا دور شروع ہوا۔ بنگال کا نواب جو اب کمپنی کا نامزد کردہ ہوتا تھا، اس کے ذمے صرف نظامت یعنی فوجداری کا کام رہ گیا۔ چونکہ کمپنی صوبے کے پورے درو بست کی ذمہ دار نہ تھی اس لیے انتظام میں بڑی ابتری پیدا ہو گئی۔ کلائیو نے میر جعفر کے بیٹے نجم الدولہ کے انتقال پر اس کے چھوٹے بھائی سیف الدولہ کو بنگال کا صوبہ دار نامزد کیا[1]۔ اس کے اختیارات کم و بیش وہی تھے جو نجم الدولہ کو دیے گئے تھے۔ نئے نواب کی آڑ میں حکومت کا اصلی اختیار کمپنی کے ہاتھ میں آگیا تھا اور نواب محض برائے نام مقتدر رہ گیا تھا۔ کلائیو چاہتا تھا کہ پارلیمنٹ پر یہ بات پوری طرح ظاہر نہ ہو کہ شمالی ہندوستان میں کمپنی کے اقتدار کی وسعت کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس کو اندیشہ تھا کہ اس طریقے سے کمپنی کے مخالفین تمام معاملات پر بحث و تحقیق شروع کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے امور کی انجام دہی کے ساتھ کمپنی پر ان علاقوں کی حفاظت کی فوجی ذمہ داری بھی عاید ہو گئی تھی۔ کلائیو نے پوری طرح کوشش کی کہ نواب بنگال سے

---

[1] سیر المتاخرین صفحہ (۳۵۶)

اعزاز میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہو اور اس کا ظاہری بھرم برقرار رہے۔ اسی طرح نواب اودھ اور شاہ عالم کی حیثیت بھی بظاہر سیاسی لحاظ سے آزاد تھی لیکن حقیقت میں کمپنی کا اقتدار ان پر چپکے چپکے اپنا اثر جما رہا تھا۔

لیکن بنگال میں جس دو عملی کے نظام نے جنم لیا اس کی خرابیاں بہت جلد ظاہر ہونے لگیں۔ اس انتظام میں قوت کا ذمہ داری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نظم ونسق کا سارا کام براہ راست ہندوستانی عہدہ داروں کے ذریعے سر انجام پاتا تھا جو اگرچہ کمپنی کی نگرانی میں اپنے فرائض پایۂ تکمیل کو پہنچاتے تھے لیکن اب تک ان کا عمل دخل کافی موجود تھا۔ اس دو عملی کے انتظام سے دراصل یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کمپنی اس وقت تک بنگال بہار اور اڑیسہ کے انتظام کو براہ راست اپنے تحت لینے کے لیے تیار نہ تھی اور وہ اس کے لیے بھی تیار نہ تھی کہ ایک تجارتی جماعت کے بجائے خالص حکمران جماعت بن جائے بلاشبہ دو عملی کے نظام سے یہ ضرور ہوا کہ کمپنی کی دستوری حیثیت بنگال بہار اور اڑیسہ میں مضبوط ہو گئی اور نواب بنگال برائے نام حکمران رہ گیا۔ یہ دراصل ایک درمیانی راستہ تھا جو پرانے طریق عمل اور کھلم کھلا اقتدار حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے درمیان کلائیو نے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ مجلس نظماء نے بھی اس امر پر زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو نواب بنگال کے اعزاز کو برقرار رکھا جائے اور مالگذاری وصول کرنے کے جو پرانے طریقے چلے آ رہے ہیں ان میں فوری کوئی تبدیلی نہیں کرنی چاہیئے۔ کلائیو کی حکمت عملی کی مجلس نظماء نے ان الفاظ میں تائید کی :-

"اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جو ملک ہمیں حاصل ہو چکا ہے وہ مستقل طور پر ہمارے تسلط میں رہے۔ انسانی عقل و دانش ہمارے تسلط کو جتنا مستحکم اور مستقل بنا سکتے ہیں اتنی ہی ہمیں کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ ہم اپنے عاملانہ اختیارات کو نہایت سادگی سے برتیں۔ گزشتہ زمانے میں بادشاہ کے دیوان کے فرائض اور اختیارات یہ تھے کہ وہ مالگذاری جمع کرنے اور فوج اور نظامت کے اخراجات پورے کرنے کے بعد جو رقم بچتی اس کو

دھمکی بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن ہم اس طریق کار پر عمل نہیں کر سکتے۔ ہمیں بردوان کے علاقے میں جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس سے ہمیں پورا یقین ہوگیا ہے کہ انگریز مالگزاری جمع کرنے کے کام کے لیے غیر موزوں ہیں .... اس لیے ہم اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ حکومت کے پرانے طرز اور صوبیدار کے وقار کو برقرار رکھا جائے"۔(۱)

انتظامی اصلاحات

کلائیو نے بڑی دانشمندی سے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے نظم ونسق کی براہ راست ذمہ داری اپنے اوپر لینے سے اجتناب کیا اس واسطے کہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت کمپنی کے ملازموں اور کارندوں میں اس پایہ اور قابلیت کے لوگوں کی کمی ہے جو ان وسیع علاقوں کے انتظام کو سنبھال سکیں۔ کمپنی کو پہلے سے چوبیس پرگنوں، بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے اضلاع کا براہ راست نظم ونسق کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ یہ اضلاع کافی وسعت رکھتے تھے جن میں کمپنی کے ملازم چاہتے تو انتظامی تجربہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن اس کی بظاہر کوئی صورت اس وقت کے حالات میں موجود نہ تھی۔ سیاسی معاملات کو طے کر چکنے کے بعد کلائیو نے نظم ونسق کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ کمپنی کے ملازم والیان ملک اور زمینداروں سے کھلم کھلا تحفے وصول کرتے تھے۔ یہ کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی تھی اس واسطے کہ کمپنی کے بڑے سے لے کر چھوٹے ملازمین میں تحفے لینے کا عام رواج تھا۔ نجی کی تجارت اور تحفے لینے کے متعلق کلائیو نے اپنی مجلس منتخبہ (سلکٹ کمیٹی) کے ذریعے روک تھام کی کوشش کی، اگرچہ اس مجلس کے اختیارات کو تسلیم کرنے میں کلکتہ کونسل کو پس وپیش تھا۔ لیکن کلائیو نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ سختی کے ساتھ اپنی حکمت عملی پر عمل کرے گا۔ بہت جلد کلائیو کمپنی کے پورے دروبست پر حاوی ہوگیا۔ اس نے مجلس نظماء کے احکام کے بموجب کلکتہ کونسل کے ارکان اور

۱۔ Auber, Rise and Progress of the British Power in India, Vol: I, P.148—49

دوسرے کمپنی کے عہدہ داروں سے نئے معاہدے پر دستخط کرائے جس میں صراحت کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ آیندہ سے وہ تحفے نہیں لیں گے۔ ارکانِ کونسل سمجھتے تھے کہ چونکہ کلائیو خود تحفے قبول کرتا رہا ہے اس لیے بہت جلد وہ ان احکام کو یا تو منسوخ کردے گا یا ان پر عمل کرانے میں زیادہ اصرار نہیں کرے گا۔ لیکن کلائیو نے اس موقع پر خود اپنے ماضی کو جھٹلا دیا اور بڑی سختی سے ان احکام کی پابندی کرائی جس کے باعث کمپنی کے ملازم اس سے بہت ناخوش ہوگئے۔ جب کلائیو مرشدآباد گیا تو معلوم ہوا کہ نواب میر جعفر نے پانچ لاکھ کی قیمت کے جواہرات بطور تحفہ اس کے لیے چھوڑے ہیں۔ اس نے اس تحفے کو ذاتی طور پر قبول کرنے کے بجائے ارکانِ کونسل سے مشورے کے بعد ایک امدادی فنڈ قایم کردیا جس سے ان سپاہیوں اور افسروں کی بیواؤں کی مدد کی جائے جو لڑائی میں مارے گئے ہوں اور ان سپاہیوں کی اعانت کی جائے جو لڑائی میں زخمی ہوئے ہوں۔ تقریباً آئندہ سو سال تک یہ فنڈ قایم رہا۔ ۱۸۵۸ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا تو یہ سرمایہ کلائیو کے جانشینوں کو دے دیا گیا۔

نجی تجارت بند کرانے کے متعلق کلائیو نے محسوس کیا کہ مجلس نظما کے احکام کی پابندی کرانا دشوار ہے۔ نئے معاہدوں پر دستخط کرا کے کلائیو نے تحفے لینے کی تو قطعی ممانعت کرادی تھی۔ اب اگر نجی کی تجارت بھی فوراً بند ہو جاتی تو کمپنی کے عہدہ دار ملازموں کی آمدنی ان کے معمولی اخراجات کے لیے بھی کافی نہیں ہوسکتی تھی۔ اور اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ مجلس نظما کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کمپنی کے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کرے۔ کونسل کے رکن کی تنخواہ تین سو پونڈ سالانہ تھی۔ کلائیو کو اس کا بخوبی علم تھا کہ رکن کونسل کے مرتبے کا شخص ہندوستان میں تین ہزار پونڈ سالانہ سے کم خرچ نہیں کرسکتا۔ کمپنی کے دوسرے ملازموں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔ معمولی کارپردازوں کی تنخواہ (۱۵) پونڈ سالانہ تھی جو حیرت انگیز ہے۔ بغیر نجی تجارت کے ان کی گذر بسر بھی ناممکن تھی۔ یہ حالات مجلس نظما کے سامنے پیش کیے گیے اور شرکائے کمپنی نے مطالبہ کیا کہ نجی کی تجارت کے متعلق جو

احکام بھیجے گئے ہیں ان پر نظرِ ثانی کی جائے اس لیے کہ بغیر اس کے ہندوستان میں جو کمپنی کے ملازم اس وقت کارپرداز ہیں وہ سخت دشواریوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ کلائیو نے سوچا کہ نمک کی تجارت کا انسداد ممکن نہیں تو کم از کم اس کی کوئی منظم شکل ہی پیدا ہو جائے تاکہ مختلف مفادوں کا تصادم پیش نہ آئے۔ بعد میں مجلسِ نظماء نے بھی اس کو بہ حیثیت گورنر بنگال اس کا مجاز کر دیا تھا کہ نمک کی تجارت کی بابت ایسے قاعدے اور ضابطے بنائے جو قرینِ انصاف ہوں اس لیے کہ اس قسم کے قاعدے حالات سے ناواقفیت کی بناء پر انگلستان میں بیٹھ کر نہیں بنائے جا سکتے۔ چنانچہ کلائیو اور اس کے دوسرے شرکائے کار نے ایک انجمنِ تجارت (سوسائٹی آف ٹریڈ) قائم کی جسے نمک بنانے اور فروخت کرنے کا اجارہ حاصل تھا اور وہی ملک میں نمک کی تجارت کرنے کی مجاز تھی۔ اس انجمن میں زیادہ تر کمپنی کے سینیر عہدہ داروں نے اپنا سرمایہ لگایا تھا۔ تجارت کا منافع حصوں کی مناسبت سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ انجمن کی عاملانہ جماعت مجلسِ تجارت (کمیٹی آف ٹریڈ) تھی جو سرمایہ فراہم کرنے اور حصوں پر منافع تقسیم کرنے نیز تجارتی انتظامات کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ نمک کی تجارت کا اس تجارتی انجمن نے جو اجارہ حاصل کر لیا تھا اس سے بہت نفع ہوا۔ ہندوستانی تاجر کمپنی سے نمک خریدتے اور ملک کے دوسرے حصوں میں بلا محصول ادا کئے جاتے تھے۔ اس تجارت سے خود کلائیو کو ۱۷ ½ ہزار پونڈ سالانہ اور کونسل کے ارکان کو ۷ ہزار پونڈ سالانہ منافع ملتا تھا[(۱)]

کلائیو کے گورنر بنگال ہونے سے قبل ہی مجلسِ نظماء نے کئی مرتبہ اس پر زور دیا تھا کہ کمپنی کے افسروں کو جو بھتّہ دیا جاتا ہے وہ بہت زیادہ ہے چنانچہ جنگِ بکسر سے قبل کلکتہ کونسل بھتّے کی تخفیف کے متعلق غور کر رہی تھی لیکن چونکہ اس وقت افسروں کی بددلی سے کمپنی کے مفاد کو سخت نقصان

۱۔ Forrest: Life of Lord Clive Vol. II, p. 299.

پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لیے یہ مسئلہ ملتوی کر دیا گیا۔ یورپین افسروں کو اس وقت جب وہ میدان جنگ میں خدمات انجام دے رہے ہوں بھتہ دیا جاتا تھا جس کی مقدار میر جعفر نے اپنی گدی نشینی کی خوشی میں دگنی کر دی تھی۔ بعد میں لڑائی کے علاوہ اس وقت بھی جب کہ افسر اپنی چھاؤنیوں میں رہتے تھے دگنا بھتہ برابر جاری رہا۔ آہستہ آہستہ افسر لوگ اسے اپنا مستقل حق تصور کرنے لگے۔ جس طرح سول ملازمین تحفے وصول کرنے کو اپنا حق سمجھتے تھے اسی طرح بعض افسر اپنے دوہرے بھتے کو حق خیال کرتے تھے۔ اس سے ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو جاتا تھا۔ کلائیو نے کمپنی کے نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں جب اصلاح شروع کی تو فوجی تنظیم کا معاملہ بھی زیر غور آیا۔ مجلس نظماء کا اصرار تھا کہ دگنا بھتہ ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ کلائیو نے یکم جنوری ۱۷۶۶ء حکم جاری کر دیا کہ اس تاریخ سے دگنا بھتہ موقوف کیا جاتا ہے۔ انگریز افسروں نے اس حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کلائیو کے خلاف سازش کر کے یہ طے کیا کہ دو سو افسر ایک ساتھ اپنے استعفے پیش کر دیں تاکہ اس طرح حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اسی زمانے میں یہ خبر بھی مشہور تھی کہ ۶۰ ہزار مرہٹہ فوج الہ آباد کی طرف حملہ آور ہونے والی ہے۔ انگریز افسروں کو یقین تھا کہ ایسے نازک وقت میں ان کی استعفے کی دھمکی کارگر ہوگی اور ان کی شرطیں مان لی جائیں گی۔ لیکن کلائیو اس طرح دبنے والا شخص نہ تھا۔ وہ ایک دفعہ جب کسی بات کا ارادہ کر لیتا تو اس کو پورا کر کے رہتا تھا۔ اب ڈسپلن برقرار رکھنے کی خاطر اس کو مجبوراً ان لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا پڑا جن کے بل پر اس نے اپنی فوجی کامرانیاں حاصل کی تھیں۔ اس نے سب افسروں کے استعفے منظور کر لیے اور حکم دے دیا کہ ان سبھوں کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا جائے تاکہ ان کے خلاف بغاوت کے جرم میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ کلائیو نے مدارس سے فوجی دستوں اور افسروں کو طلب کر لیا اور کلکتہ کی یورپین نوآبادی میں جتنے لوگ افسری کے لیے موزوں مل سکے انھیں فوراً نوکر رکھ لیا تاکہ مرہٹوں کے خطرے کا سدباب ہو جائے

اس طرح دو ہفتے کے اندر اس نے اپنی مستقل مزاجی سے بغاوت کو بالکل فرو کردیا اور ڈسپلین قایم کردیا۔ اس موقع پر ڈسپلین قایم کرنے کی خاطر اس نے صاف کہدیا تھا کہ "میں یہ پسند کروں گا کہ فوجی سنگینیں میری گردن میں بھونک دی جائیں بجائے اس کے کہ میں اس قسم کے مطالبات کے آگے جھکوں"(۱)

کلائیو کی انگلستان کو واپسی

۱۷۶۷ء کے شروع میں کلائیو کی صحت جواب دینے لگی۔ چنانچہ وہ انگلستان چلا گیا۔ وہاں اس کے بہت سے دشمن تھے جنھوں نے اس سے انتقام لینا چاہا۔ مجلس نظامت کا ایک رکن سلیوان کلائیو کا سب سے بڑا مخالف پارلیمنٹ کا بھی رکن تھا اس نے اور کرنل بورگوئین نے پارلیمنٹ میں تجویزیں پیش کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان کے انتظامات کو بہتر بنانے کے لیے پارلیمنٹ کوئی تدبیر اختیار کرے۔ مسٹر بورگوئین نے اس پر بھی اصرار کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے جن اعلیٰ عہدہ داروں نے کسی والیٔ ملک سے معاہدہ کرکے یا فوجی قوت کی بناء پر ذاتی دولت اور عطیات حاصل کئے ہیں وہ مملکت کی ملک ہونے چاہئیں۔ لیکن کچھ دنوں بعد کرنل موصوف نے کلائیو کے نام لے کر دوسری تجویز پیش کردی جس میں صراحت تھی کہ "کلائیو نے مجلس منتخبہ کے رکن اور کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے دو لاکھ ۳۴ ہزار پونڈ کی رقم حاصل کی ہے وہ اپنے اقتدار کے بے جا استعمال سے حاصل کی ہے اور اس طرح اس نے کمپنی کے دوسرے ملازموں کے لیے ایک بری مثال قائم کی جس سے مملکت کے مفاد کو نقصان پہنچے گا"۔ اس تجویز پر رات بھر بحث ہوتی رہی آخر کار ہاؤس آف کامنز نے یہ تسلیم کیا کہ کلائیو نے جو رقم حاصل کی وہ اسے ہرگز نہیں لینی چاہیے تھی۔ لیکن باوجود اس کے اس نے ملک کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ کلائیو کی غیور طبیعت پر اس بدسلوکی کا بہت اثر ہوا

---

(۱) Strachey's Narrative, p. 167 (Clive to Barker, May 8, 1766)

جو اس کے اپنے ابنائے وطن کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑی۔ وہ پہلے ہی سے بیمار تھا۔ غرض کہ جسمانی اور نفسیاتی علالت سے تنگ آ کر اس نے ۱۷۷۴ء میں خودکشی کرلی۔ اس وقت اس کی عمر ۵۰ سال تھی۔

کلائیو کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں اتنی بڑی مملکت کا مالک بنادیا جو رقبے میں انگلستان سے زیادہ تھی۔ اس نے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی جو بنیادیں قایم کیں انھیں پر آئندہ تعمیر اور استحکام ممکن ہوا۔ اس نے فوجی تعلیم لارنس سے اور سیاسی تعلیم سانڈرس سے حاصل کی تھی لیکن بعد میں وہ اپنے ان دونوں استادوں سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے بڑی جرارت اور دانشمندی سے پہلے فرانسیسی منصوبوں کو شمالی سرکار اور کرناٹک میں ختم کیا اور اس کے بعد بنگال کے نظم ونسق کے پورے اختیارات حاصل کرکے برطانوی سلطنت کی اس ملک میں داغ بیل ڈالی۔

کلائیو زبردست سپہ سالار اور مدبر تھا۔ اگرچہ وہ سپاہیوں کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتا تھا لیکن جب نظم وضبط قایم کرنے کا معاملہ درپیش ہوتا تو وہ کسی کی مطلق رو رعایت نہیں کرتا تھا۔ اس کی سپاہ کو اس کی قوت فیصلہ پر پورا بھروسہ تھا۔ دراصل اس کی کامیابیوں کا راز اس کی قوت فیصلہ اور قوت ارادی میں پوشیدہ تھا۔ وہ ایک مرتبہ جب کسی بات کا ارادہ کرلیتا تو پھر کوئی طاقت اس کو اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ کلائیو بہادری اور اولوالعزمی کے باوجود ہر معاملے میں تدبر اور حکمت عملی سے کام لیتا اور بہت جلد معاملے کی تہہ کو پہنچ جاتا تھا اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے ذریعوں پر فوراً اس کے ذہن کی رسائی ہوجاتی تھی۔ وہ اعتدال کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ بکسر کی کامیابی کے بعد اکثر انگریز اعلیٰ افسروں کی رائے تھی کہ دہلی تک بڑھتے چلے جائیں لیکن کلائیو نے اس کو اصول اعتدال کے خلاف سمجھا اور انھیں اس سے باز رکھا۔ لیکن باوجود ان خوبیوں کے اس میں صحیح اخلاقی حس کی کمی تھی۔ اس نے اپنے بنگال کے ابتدائی دور میں خوب دولت سمیٹی اور امی چند کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ کسی طور پر بھی حق بجانب نہیں کہا جاسکتا۔

بعض انگریز مورخ یہ کہہ کر کلائیو کو حق بجانب ٹھیراتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان کے اخلاق عامہ کی حالت اس قدر خراب تھی کہ اگر کلائیو بھی اسی رنگ میں رنگ گیا جو اس کے گرد و پیش تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اول تو تاریخی لحاظ سے صحیح نہیں اور دوسرے اگر اہل ہند کے اخلاق عامہ کی پستی کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی کلائیو اور اس کے شرکاء کار کے ان افعال کو درست نہیں کہا جا سکتا جو عالمگیر اصول اخلاق سے گرے ہوئے تھے اور جن کا اثر کسی نہ کسی طور پر انفرادی اور اور اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین باوجود نظماء کی ہدایتوں کے کلائیو کی قایم کی ہوئی مثالوں پر عمل کرتے رہے جس کی وجہ سے انگریزی قوم کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا۔ اور اگر بعد میں سختی کے ساتھ اس قسم کے افعال کی روک تھام نہ کی جاتی جس کی مثال کلائیو نے اپنی عملی زندگی میں قایم کر دی تھی تو ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے قایم کرنے میں بڑی سخت دشواریاں پیش آتیں۔ میر جعفر کو بنگال کا نواب بناتے وقت کلائیو نے دو لاکھ ۳۴ ہزار پونڈ کی رقم ہتھیائی اور ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ کونسل کے ارکان اور فوجی افسروں کو دلوائے۔ میر جعفر اس غلط فہمی میں تھا کہ کمپنی کے ارباب کار کو یہ رقمیں ادا کرنے کے بعد اس سے مزید مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس کی یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ کمپنی کے مطالبات ان رقموں کی ادائی کے بعد بھی برقرار رہے جن کی پابجائی کرنی پڑی۔ کلائیو کا یہ دعویٰ کہ یہ رقمیں بطور عطیہ خوشی سے دی گئی تھیں اور ان کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی زبردستی یا جبر سے کام نہیں لیا گیا تھا قابل قبول نہیں (۱)۔ کلائیو کے انگلستان چلے جانے کے بعد کلکتہ کونسل نے پانچ سال تک اس کی قایم کی ہوئی روش پر عمل کیا اور ایسے لوگوں کو بنگال کا دروبست

لے۔ Reports of the House of Commons, Vol. III, p. 148

دلوایا جن سے عطیات حاصل کرنے کی توقع تھی۔ ان حالات میں ظاہر ہے بنگال میں جو نظم و نسق قایم ہوا وہ نہ تو کمپنی کے لیے مفید ہو سکتا تھا اور نہ وہاں کی رعایا کے لیے۔ بہت جلد اس نظم و نسق کی آڑ سے بدنظمی اور ابتری رونما ہوئی اور سارے بنگال پر چھاگئی۔ پانچ سال تک اس ابتری کا دور دورہ رہا جو انگریزی قوم کے دامن پر ہمیشہ ایک بدنما داغ رہے گا۔

کلائیو کے جانشین

کلائیو نے بنگال کی گورنری کا جائزہ مسٹر ورلسٹ کو دیا جو دو سال تک برسر اقتدار رہا۔ اس کے بعد مسٹر کارٹیر بنگال کا گورنر ہوا۔ اس کو اگرچہ بنگال کے حالات کا کافی تجربہ تھا لیکن وہ کوئی کار نمایاں انجام نہ دے سکا۔ ورلسٹ اور کارٹیر کے عہد حکومت میں کمپنی کے ملازموں کی حرص اور لالچ نے سارے نظم و نسق کو مفلوج کر دیا۔ جن معاہدوں پر کلائیو کے عہد میں انھوں نے دستخط کیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ سے وہ تحفے نہیں لیں گے ان کی حیثیت طاق نسیان کے نقش و نگار سے زیادہ باقی نہیں رہی۔ انھوں نے کھلم کھلا نجی تجارت پھر شروع کر دی۔ نمک، چھالیا اور تمباکو کی تجارت کا اجارہ اندرون ملک کی تجارت میں انھیں حاصل تھا۔ محمد رضا خان نائب نواب اور اس کے کارندے کمپنی کے ملازموں کے معاملات میں مداخلت کرنے کی جراءت نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کونسل میں کمپنی کے ملازموں کی روک تھام کرنے کی طاقت نہیں تھی۔

ورلسٹ اور کارٹیر کے عہد حکومت میں دوعملی کے انتظام کی خرابیاں پوری طرح ظاہر ہوگئیں۔ نواب کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ انگریز ملازمین کمپنی من مانی کرتے اور ذمہ داری نواب کی رہتی۔ اگرچہ اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں نے ذاتی تجارت سے نفع کما کر اپنی جیبیں خوب بھریں لیکن کمپنی کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں تھی۔ انگلستان میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کے حقوق دیوانی مل

جانے سے کمپنی کی دولت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ برطانوی تاج کی خواہش تھی کہ اس میں اسے بھی حصہ ملے۔ اور کمپنی کے حصہ داروں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ آئندہ پچاس سال تک انھیں چودہ فیصدی منافع دیا جائے)۔ چنانچہ کمپنی نے شرح منافع ۱۰ فیصدی کر دیا۔ حکومت انگلستان نے یہ بھی طے کر دیا کہ کمپنی خزانہ شاہی میں صرف شاہی کے لئے ۴ لاکھ پونڈ سالانہ کی رقم ادا کیا کرے گی۔ حالانکہ ۱۷۶۶ء میں کمپنی پر تقریباً ۹۰ لاکھ پونڈ قرض تھا۔ معمولاً ہندوستان سے جو مال خرید کر انگلستان اور دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا اس کی قیمت کم و بیش تین لاکھ پونڈ ہوتی تھی۔ لیکن مجلس نظماء کے حکم کے بموجب ۸ لاکھ پونڈ کا مال خرید کر بھیجا جانے لگا۔ کمپنی نے طے کیا کہ یہ تمام مال دیوانی کی آمدنی سے خریدا جائے۔ ڈچ اور فرانسیسی اپنا اسباب تجارت فراہم کرنے کے لیے بڑی بڑی شرح سود پر قرض لیتے تھے۔ اور انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی دیوانی کی آمدنی سے انگلستان کو اجناس اور دوسری اشیاء خرید کر روانہ کرتی تھی۔ بنگال کی دیوانی کی آمدنی میں سے ۵۰ لاکھ پونڈ کا سونا اجناس کی خریداری کے لیے چین اور دوسرے ممالک کو تین سال میں بھیجا گیا۔ بنگال کی بے حساب دولت بے دریغ حقوق دیوانی ملنے کے بعد کئی سال تک دوسرے ملکوں کو کھینچ کھینچ کر بھیجی جانے لگی۔ خود ورلسٹ نے اپنی کتاب میں اس زمانے کی کیفیت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔ "پارلیمنٹ اور کمپنی کے حصہ داروں میں یہ شدید ہوس کہ کمپنی کے نئے مقبوضات سے خوب نفع اندوزی کی جائے بہت سی ایسی خرابیوں کا باعث ہوئی جو پیدا نہ ہوتیں اگر اہل انگلستان ذرا ہوشمندی اور اعتدال سے کام لیتے۔ اسی وجہ سے وصول مالگزاری کے کام میں کوئی مفید تبدیلی نہ ہو سکی اور پرانے زمانے کی وہ تمام برائیاں جو متعدد حکمرانوں کے تحت پھیل چکی تھیں برابر قایم رہیں۔ یہی خرابیاں اہل ملک کی معاشی زندگی کے لیے کیا کم تباہ کن تھیں کہ بنگال کو ایک اتھاہ سونے کی کان سمجھ کر مزید مالگزاری کے شدید مطالبہ نے ان بہت سے اسباب

زوال میں اور بھی اضافہ کر دیا جو یہاں کی محنتی اور جفاکش آبادی کو پیسے ڈالتے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہو جب کہ انگلستان سے یہ احکام نہ آئے ہوں کہ ہندوستان میں مال کی خریداری بڑھاؤ۔[1]

کارٹیر کے عہد میں مالگزاری کی وصولیابی کو منظم کرنے اور دیسی عہدہ داروں کی نگرانی کرنے کے لیے انگریز نگراں کار (سپروائزر) مقرر کیے گیے جنہیں تجارت کی اجازت تھی۔[2] چونکہ یہ نگراں کار اضلاع پر رہتے تھے اس واسطے انھیں دولت سمیٹنے کے غیر معمولی مواقع حاصل تھے محاصل لینے والے اور زمیندار اُن کے اشاروں پر چلتے تھے۔ نگراں کاروں نے ہر ضلع میں ایک جابر حاکم کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔[3] ان نگراں کاروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ حقوق اراضی کی جانچ پڑتال کر کے جمع بندی کریں اور مقررہ لگان کے علاوہ جو کاشتکاروں سے زمیندار وصول کرتے ہیں اس کا سدباب کیا جائے۔ ابھی ان نگرانکاروں کو مقرر ہوے ایک سال ہی گزرا تھا کہ ۱۷۷۰ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ کے علاقوں میں سخت قحط پڑا۔

بنگال کا قحط اس قحط کے زمانہ میں بھی مالگزاری کے مطالبات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ کمپنی کے گماشتوں نے اپنی فوجی اور شہری ضروریات کے لیے اضلاع سے غلہ خرید کر حاصل کر لیا اور دیہات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ خود ہمعصر انگریزوں کا خیال ہے کہ اس قحط میں بنگال کی تقریباً ⅓ آبادی (یعنی کم و بیش ایک کروڑ) ہلاک ہو گئی۔ کاشتکاروں نے اپنے بچوں کو بیچ ڈالا۔ یہاں تک کہ کوئی ان کا خریدنے والا بھی نہ رہا۔ دیہات میں لوگوں کی

---

[1] Verlest, A view of the rise. progress and present state of the English Government in Bengal, p. 81-85.

[2] سیر المتاخرین۔ صفحہ ۳۶۳

[3] Ramsay Muir, The Making of British India. p. 5.

گزر اوقات درخت کے پتوں اور گھانس پر تھی جس کی وجہ سے ہیضہ ۔ بخار اور چیچک کی وبائیں پھوٹ پڑیں ۔ اگرچہ ۱۷۷۱ء میں بنگال میں بارش کی حالت اچھی رہی لیکن ۱۷۷۰ء کی وباؤں اور عام تباہی کے معاشی اور عمرانی اثرات ایسے شدید تھے کہ آئندہ نسلوں تک ان کے اثرات اہلِ بنگال کی زندگی میں موجود رہے ۔[1] پرانے شرفا کے خاندان تباہ ہو گئے ۔ کاشتکار اپنی زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ غرض کہ اس زمانہ میں بنگال کی معیشت زرعی کا توازن ایسا بگڑا کہ عرصہ تک درست نہ ہو سکا ۔ بعد میں وارن ہیسٹنگز نے نومبر ۱۷۷۲ء کو مجلس نظما کو بنگال کی حالت کے متعلق جو مراسلہ لکھا تھا اس میں بنگال کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اگرچہ قحط کے زمانہ میں خدا کی مخلوق سخت مصیبت میں مبتلا تھی لیکن کمپنی نے مالگزاری وصول کرنے میں کوئی کمی یا رعایت نہیں کی ۔ وہ لکھتا ہے " ۱۷۷۰ء کا قحط جو ان صوبوں میں پڑا اور سال بھر رہا اس کے اثرات پہلے بھی مختلف تحریروں سے آپ کو معلوم ہو چکے ہوں گے ۔ اس کی نسبت مجلس نظماء اور عام پبلک کو جو اطلاعیں بھیجی گئی ہیں ان میں رحم و کرم کے جذبات برانگیختہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر جو الفاظ سے ممکن ہے کی گئی ہے ۔ لیکن قحط کا کوئی نمایاں اثر مالگزاری کے جمع کرنے پر نہیں پڑا ۔ ممکن ہے کہ مالگزاری جمع کرنے والوں نے کوئی اثر محسوس نہ کیا ہو اور ان لوگوں نے محسوس کیا ہو جن سے وہ جمع کی گئی ہے ۔ اگرچہ ان صوبوں کی آبادی کا ۱/۳ حصہ موت کے گھاٹ اتر چکا ہے جس کی وجہ سے یقیناً کاشتکاری میں کمی ہوئی ہوگی لیکن ۱۷۷۱ء کی مالگزاری کی مجموعی رقم ۱۷۶۸ء کی مجموعی رقم سے بھی زیادہ رہی ہے جیسا کہ حسابات کے خلاصہ سے ظاہر ہوگا ......

قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ قحط کے المناک واقعات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مالگزاری میں تخفیف عمل میں آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا ۔ اس

[1] Hunter, the annals of rural Bengal, p. 19

کا سبب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ مالگزاری کے جمع کرنے میں جو سابقہ معیار قایم ہو چکے ہیں انھیں پورا کیا گیا اور اس کے لیے جو ذریعے استعمال کیے گیے ہوں گے انھیں معلوم کرنا آسان کام نہیں۔"

پانچواں باب

جنوبی ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دشواریاں

— (۱۷۶۲ء تا ۱۷۷۲ء) —

بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیوانی کے حقوق حاصل کر لیے تھے لیکن کرناٹک میں نواب محمد علی والا جاہ دیوان اور ناظم دونوں کے فرائض ادا کر رہا تھا لیکن حقیقی اقتدار یہاں بھی کمپنی کو حاصل ہو چکا تھا۔ انگریز اس وقت تک یہ نہیں چاہتے تھے کہ کرناٹک کے درو بست کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لیں۔ ان علاقوں میں بھی جو کمپنی نے بطور جاگیر حاصل کر لیے تھے مالگزاری نواب ہی کے نام پر وصول کی جاتی اور اسی کو ادا کی جاتی تھی۔ معاہدہ الٰہ آباد کی رو سے کلائیو نے یہ طے کرا لیا تھا کہ نواب محمد علی آئندہ سے دکن کے آصف جاہی خاندان کا تابع فرمان نہیں رہے گا اور وہ اپنے خاندان کے لیے والا جاہ کا لقب استعمال کر سکے گا۔ نواب محمد علی نے شروع ہی سے اپنے آپ کو انگریزی قوم کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ اگرچہ جنوبی ہند میں فرانسیسی قوت کے ٹوٹ جانے کے بعد کرناٹک کی سیاست کو کمپنی کے نقطہ نظر سے زیادہ اہمیت باقی نہیں رہی تھی لیکن بہر حال کمپنی کا تجارتی مفاد اس

کا مقتضی تھا کہ وہاں امن وامان قایم رہے۔ چنانچہ مختلف پولیگاروں (زمینداروں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے نواب محمد علی انگریزوں کی امداد کا متوقع رہتا تھا۔ نواب محمد علی نے اپنے صدر مقام ارکاٹ میں سکونت ترک کردی اور اب وہ مدراس میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کررہا تھا۔ انگریز ساہوکاروں کا قرض اس پر بڑھتا جارہا تھا جس کے ضمن میں اس نے اپنی عملداری کے بیشتر حصے ان کے حوالے کردیے تھے کہ ان کا انتظام کرکے اپنا قرض وصول کریں۔ ۱۷۶۶ء میں حکومت مدراس نے یہ قاعدہ مقرر کردیا تھا کہ آئندہ سے نواب کو جو انگریز ساہوکار قرض دیں اس پر دس فی صدی سے زیادہ سود نہیں لیا جاسکے گا۔ اس زمانہ میں خود مدراس کے اکثر ارکان ذاتی تجارت یا لین دین کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں بعض کی رقمیں بڑھی ہوئی شرح سود پر نواب پر چڑھی رہتی تھیں جس کی وجہ سے نواب کونسل کو اپنے حسب منشا متاثر کرلیا کرتا تھا۔

۱۷۶۲ء میں نواب محمد علی والاجاہ نے مدراس کونسل کو باور کرالیا کہ تنجور کے راجا پر اس کی پیشکش کی رقم عرصہ سے واجب الادا ہے۔ مدراس کے گورنر پیگاٹ نے نواب والاجاہ کی حمایت کی۔ چنانچہ انگریزی فوج کے بل پر تنجور کے راجا پرتاپ سنگھ کو بقایا پیشکش کی رقم ادا کرنی پڑی اور وعدہ کرنا پڑا کہ آئندہ ہر سال وہ مقررہ پیشکش نواب کو ادا کرے گا۔ نواب کے ایما پر ویلور کے فوجدار مرتضیٰ علی اور مدورا کے فوجدار یوسف خاں کے خلاف بھی انگریزوں نے فوج کشی کی تاکہ ان کے علاقوں پر نواب والاجاہ کا نظم و نسق براہ راست قایم ہوجائے لیکن نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ نکلا کہ بدنظمی میں اور زیادہ وسعت ہوگئی۔

سرکار نظام اور کمپنی میں معاہدہ

اس وقت دکن اور جنوبی ہند میں سرکار نظام، مرہٹے اور حیدر علی والی میسور کی تین اہم قوتیں حکمران تھیں جن کے ساتھ کمپنی کو سیاسی تعلقات استوار کرنے تھے۔ کلائیو نے بادشاہ شاہ عالم کے ساتھ جو معاہدہ طے کیا اس کی رو سے

کمپنی کو شمالی سرکار کے قبضہ کی توثیق حاصل ہو گئی جنھیں کرنل فورڈ نے فرانسیسیوں کو شکست دے کر ۱۷۵۹ء میں پہلی مرتبہ حاصل کیا تھا ۔ ۱۷۵۹ء سے ۱۷۶۵ء تک شمالی سرکار کے نظم ونسق کی نوعیت یہ تھی کہ یہاں آصف جاہ ثانی نے حسین علی کو اپنے نگراں کار اور تعہدار کے طور پر مقرر کر دیا تھا جس کو ہدایت کی تھی کہ مالگزاری میں سے حکومت مدراس کے ساتھ آدھوں آدھ رقم بانٹ لی جایا کرے ۔ حسین علی کی حکومت شمالی سرکار پر محض برائے نام تھی۔ لیکن حکومت مدراس نے فرانسیسی مداخلت کے مقابلہ میں اس کو گوارا کیا اور مالگزاری وصول کرنے کے ضمن میں سرکش پولیگاروں (زمینداروں) کے خلاف اگر فوج کشی کی ضرورت پڑتی تو کمپنی کی سپاہ استعمال ہوتی تھی ۔ کلائیو نے شاہ عالم سے شمالی سرکار کے قبضہ کی جو سند حاصل کی تھی اس کو حکومت مدراس استعمال کرتے ہوئے ذرا ہچکچاتی تھی اس واسطے کہ جب تک بنگال کی صورت حالات میں یکسوئی نہ پیدا ہو جائے وہ کمپنی کے لیے مزید سیاسی پیچیدگی نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی ۔ بالآخر مارچ ۱۷۶۶ء میں حکومت مدراس نے شمالی سرکاروں میں اس سند کی تشہیر کی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ان اضلاع کی مالگزاری وصول کرنے کے متعلق مغل بادشاہ سے ملی تھی ۔ جنرل کیلیاڈ کو مع سپاہ وسامان شمالی سرکار روانہ کیا گیا تاکہ اگر نواب میر نظام علی خاں یا ان کے تعہدار حسین علی کی طرف سے کوئی مزاحمت ہو تو اس کا تدارک کیا جا سکے ۔ جنرل کیلیاڈ کو اس کا علم تھا کہ نواب میر نظام علی خاں کو یہ بات بہت ناگوار گزر رہی ہے کہ کلائیو نے بالا بالا بغیر ان کے مشورے کے شمالی سرکاروں کے متعلق شاہ عالم سے فرمان حاصل کر لیا ۔ چنانچہ ان کا ارادہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف فوج کشی کریں اور اپنے عامل وہاں مقرر کریں ۔ لیکن حکومت مدراس خواہ مخواہ صوبیدار دکن سے بگاڑ بھی نہیں چاہتی تھی مدراس کے گورنر نے جنرل کیلیاڈ کو ہدایت دی تھیں کہ شمالی سرکاروں پر انگریزوں کے قبضہ وتصرف کا استقرار کرنے کے ساتھ اگر نواب میر نظام علی خاں سے بھی معاملات کی صفائی ہو جائے تو اچھا ہے ۔

چنانچہ جنرل موصوف نے اس ضمن میں گفت و شنید شروع کی اور ۱۲ر نومبر ۱۷۶۶ء بمقام حیدرآباد ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار نظام میں معاہدہ طے ہو گیا جس کی رو سے حکومت مدراس نے سات لاکھ روپے سالانہ بطور پیشکش ادا کرنے کا وعدہ کیا۔[1] یہ اضلاع سرکار نظام نے کمپنی کو بطور انعام جاگیر عطا کیے۔ سرکار مرتضیٰ نگر (گنتور) کے متعلق یہ طے ہوا کہ چونکہ یہ سرکار میر نظام علی خاں کے بھائی بسالت جنگ کی جاگیر ہے اس لیے تا حین حیات یہ انھیں کے قبضہ و تصرف میں رہے گی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سرکار بھی انگریزی عملداری میں شامل کر دی جائے گی۔ لیکن چونکہ سرکار گنتور کرناٹک کی سرحد پر واقع ہے جس کی حفاظت کا ذمہ کمپنی نے اپنے اوپر لیا ہے اس لیے اگر وہاں انتظامی ابتری پیدا ہوئی تو لا محالہ اس کا اثر کرناٹک پر پڑے گا۔ ایسی صورت میں کمپنی مجاز ہوگی کہ سرکار گنتور پر قبضہ و تصرف حاصل کر لے تاکہ کرناٹک سیاسی ابتری سے محفوظ رہے۔ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جب کبھی دونوں حکومتوں (سرکار نظام اور انگریزی حکومت) میں سے کسی کو فوجی امداد کی ضرورت ہو تو دوسرے فریق کا فرض ہوگا کہ وہ امداد کرے۔ یہ بھی طے ہوا کہ انگریزی فوج کا ایک دستہ جو دو بٹالین پر مشتمل ہوگا چھ توپوں کے ساتھ سرکار عالی کی مدد کے لیے ممالک محروسہ میں موجود رہے گا اور مناسب موقع پر سرکار نظام اس کو استعمال کرنے کی مجاز ہوگی۔ چنانچہ سرکار نظام نے قلعہ کنداپلی میں انگریزی فوج کو رہنے کی اجازت دیدی۔ اس فوج کی تنخواہ کی ادائی کی یہ صورت طے ہوئی کہ شمالی سرکاروں کی بابت جو پیشکش کمپنی کے ذمہ واجب الادا ہے اس میں سے اس فوج کی تنخواہ کی رقم منہا کر لی جائے گی اور بقایا سالانہ تین اقساط میں سرکار نظام کو ادا کیا جائے گا۔ یہ معاہدہ در اصل حکومت مدراس نے حیدر علی والی میسور کے خلاف کیا تھا۔

حیدر علی کا عروج | جس زمانہ میں نواب میر نظام علی خاں دکن میں

[1] Aitchison, Collection of Treatise, Vol. V, p. 145

برسرِ اقتدار ہوئے اسی زمانہ میں جنوبی ہند میں حیدر علی نے عروج حاصل کیا۔ اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ میسور کے راجا کے معمولی ملازم کی حیثیت سے گذارا تھا۔ اپنی قابلیت اور اولعزمی سے وہ ڈنڈگل کا فوجدار ہوا اور پھر کچھ عرصہ بعد سپہ سالار بن گیا۔ اس نے وزیر کھنڈے راؤ کو قید کر لیا اور پھر دروبست پر خود حاوی ہو گیا۔ بیدنور کی ریاست پر قبضہ کرنے سے اس کو بہت کچھ دولت ملی جس سے اس نے اپنی فوج کو مستحکم کیا اور دربار کی رونق میں اضافہ کر کے شاہانہ آداب قائم کیے۔ راجا کو پنشن دے کر وہ میسور کی ریاست کا حکمران بن بیٹھا۔ اس کی قوت بہت جلد اتنی بڑھ گئی کہ آس پاس کے حکمران اس سے ڈرنے لگے۔ جب اس نے مالابار فتح کیا تو وہاں جو انگریزی تجارتی کوٹھیاں حکومت بمبئی کے تحت تھیں ان سے اس کو سابقہ پڑا۔ کمپنی کی حکومت بمبئی حیدر علی سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ حکومت بمبئی نے حکومت مدراس کو لکھا کہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت نکالنی چاہئے جس کی بدولت حکومت مدراس بیچ میں پڑ کر حیدر علی اور نواب محمد علی کے جھگڑوں کو ختم کیا جاسکے۔ حیدر علی کو یہ توقع تھی کہ حکومت بمبئی کے توسط سے وہ بارود اور اسلحہ وغیرہ خرید سکے گا جو توسیع حکومت کے لیے نہایت ضروری تھا۔ اس نے حکومت بمبئی سے باہمی امداد کا معاہدہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اس واسطے کہ جنوب کے نائر حکمرانوں سے انگریزی حکومت کے پہلے سے دوستانہ معاہدے تھے اور ان کے ملک کو حیدر علی نے فتح کر لیا تھا۔ لیکن حکومت بمبئی حیدر علی سے بگاڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لہ

حیدر علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو پیشوا اور سرکار نظام دونوں خاص طور پر اپنے لیے مخدوش خیال کرتے تھے۔ چنانچہ جب حیدر علی نے

لہ۔ Forrest, Bombay Selections, II, p. 123-31

مالابار کے اضلاع فتح کرنے کے بعد شمال میں دریائے کرشنا کے علاقوں کی طرف توجہ کی تو ۱۷۶۷ء میں پیشوا اور سرکار نظام نے اس کے خلاف متحد ہو کر کوشش کردی۔ حیدر علی نے مرہٹوں کو روپیہ دے کر راضی کر لیا اور نواب میر نظام علی خاں کو آمادہ کر لیا کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف اس سے اتحاد کرلیں تو وہ انھیں شمالی سرکار واپس دلوا دے گا۔ چونکہ انگریزوں نے ۱۷۶۶ء میں سرکار نظام سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی جیسی کہ چاہیے پابندی نہیں کی گئی تھی اور شمالی سرکاروں کی پیشکش ادا نہیں کی گئی تھی اس لیے انھیں حکومت مدراس پر مطلق اعتبار نہیں رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مفاد اسی میں دیکھا کہ اس وقت حیدر علی کا ساتھ دیں۔ اس موقع پر حیدر علی نے یہ بھی طے کر لیا کہ نواب محفوظ علی خاں برادر کلاں نواب محمد علی والاجاہ کی بیٹی سے ٹیپو سلطان کی شادی ہو جائے تو سرکار نظام کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس ترکیب سے نواب محمد علی کو کرناٹک کی نوابی کے حق سے محروم کر کے ٹیپو سلطان کا وہاں حق قائم کر دیا جائے گا۔ اس صلحنامہ پر حیدر علی اور نواب میر نظام علی خاں دونوں نے اپنے دستخط ثبت کردئے۔

پہلی جنگ میسور

اس کے بعد حیدر علی اور نواب میر نظام علی خاں کی متحدہ افواج نے ۱۷۶۷ء میں کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۶۶ء کے معاہدہ کی رو سے جو انگریزی فوج ممالک محروسہ میں رکھی گئی تھی اسے حکومت مدراس نے واپس بلا لیا۔ کرنل اسمتھ کی فوج سے حیدر علی اور نواب میر نظام علی خاں کی متحدہ افواج کا مقابلہ چنگما اور تری نوملی کے مقامات پر ہوا۔ اسی دوران میں نواب ارکاٹ محمد علی والاجاہ نے نواب میر نظام علی خاں کے مدار المہام نواب رکن الدولہ کے توسط سے انگریزی حکومت اور سرکار نظام میں صلح و صفائی کرانے کی کوشش کی اور اس کو اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ نواب میر نظام علی خاں حیدرآباد واپس تشریف لے آئے۔ نواب محمد علی والاجاہ نے نواب میر نظام علی خاں کو یہ باور کرا دیا کہ حیدر علی انھیں اپنے مقاصد کے

لیے بطور آلۂ کار استعمال کر رہا ہے۔

سرکار نظام سے معاہدہ کی تجدید

۱۷۶۸ء میں بمقام مدراس ایک جدید معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ سرکار نظام سات لاکھ روپے سالانہ پیشکش کے صلہ میں کرناٹک بالا گھاٹ کی دیوانی کے حقوق ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض فرما دیں گے اور پانچوں سرکاروں پر کمپنی کو حقوق ملکیت حاصل ہوں گے سوائے سرکار گنتور کے جس پر کمپنی کو بسالت جنگ کے حین حیات قبضہ و تصرف کا حق نہ ہوگا۔ ۱۷۶۶ء کے معاہدہ کے بموجب سات لاکھ کی پیشکش ادا کرنے کا جو حکومت مدراس نے وعدہ کیا تھا اس کی توثیق کی گئی۔ یہ بھی طے ہوا کہ حکومت مدراس کرناٹک اور بالا گھاٹ کو حیدر علی سے چھین کر اپنے قبضہ و تصرف میں بطور جاگیر کے رکھ سکتی ہے۔ نواب میر نظام علی خاں، ایسٹ انڈیا کمپنی یا نواب محمد علی والا جاہ کے مقبوضہ علاقوں کے ایسے زمینداروں کو اپنی پناہ میں نہیں لیں گے اور نہ ان کی ہمت افزائی کریں گے جن کے سبب سے امن و امان میں خلل پڑ رہا ہو۔ تینوں میں سے ہر ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن متصور ہوگا۔ اگر تینوں فریق میں سے کسی ایک کے علاقہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہو تو باقی کو مدد کرنا لازم ہوگا۔ کمپنی اور والا جاہ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر سرکار نظام کو ضرورت ہوگی تو دو پلٹنیں، چھ توپیں جو یوروپین افسروں کی نگرانی میں ہوں گی روانہ کی جائیں گی بشرطیکہ سرکار نظام ان کے اخراجات اپنے ذمہ لیں۔ یہ فوج جب تک کہ سرکار نظام کی خدمت رہے گی اس وقت تک اس کا قیام قلعہ کنداپلی میں رہے گا۔ چونکہ شاہ عالم بادشاہ دہلی نے شاہی فرمان کے ذریعہ سے نواب محمد علی والا جاہ اور اس کے وارثوں کو کرناٹک پائیں گھاٹ کی حکومت تفویض کی ہے اور نواب میر نظام علی خاں نے بھی سالانہ پیشکش کے عوض بذریعہ سند کرناٹک پائیں گھاٹ کو دکن کی ماتحتی سے آزاد کر دیا ہے اور اس معاہدہ کے جملہ گزشتہ و حال کے تمام مطالبات کو سوخت کر دیا

ہے، اس لیے نواب محمد علی والاجاہ اور اس کے وارثوں کو کرناٹک پائیں گھاٹ کے علاقے بطور التمغا یا معافی اپنے قبضہ و تصرف میں رکھنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔

حیدر علی نے باوجود سرکار نظام کے علیحدہ ہو جانے اور انگریزوں اور نواب محمد علی والاجاہ کا حلیف بن جانے کے جنگ کا سلسلہ بدستور جاری رکھا شروع میں تو دو ایک جگہ اس کی فوج پسپا ہوئی لیکن ۱۷۶۸ء میں اس نے کرنل اسمتھ اور کرنل وڈ کو پے در پے شکستیں دیں اور ملک میں خوب لوٹ مار کی۔ حیدر علی کا دھیان بٹانے کے لیے انگریزوں نے بمبئی سے ایک فوج ساحل منگلور پر اتار دی تاکہ اس طرف سے بڑھ کر بیدنور اور قریب کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لے۔ حیدر علی نے اپنے بیٹے ٹیپو سلطان کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا اور پھر کچھ دنوں بعد کرناٹک میں میر علی رضا خاں (فرزند چندا صاحب) اور محمد علی کمندان کی سربراہی میں اپنی فوج چھوڑ کر خود بھی منگلور کی جانب بڑھا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مغربی ساحل کی طرف چلے جانے سے انگریزی فوج کو موقع ملا کہ کرناٹک کے کھوئے ہوئے علاقوں پر قبضہ کر لے۔ منگلور پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا اور انگریزی فوجوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا سامان چھوڑ کر جہازوں پر سوار ہو کر بمبئی واپس جائیں۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے کرناٹک پر زبردست حملے شروع کر دئے۔ حیدر علی کے مشہور جنرل فیض اللہ خاں نے انگریزی فوجوں کو متعدد مقامات پر شکست دی۔ اس جنرل کی قابلیت اور فن جنگ کی مہارت کو انگریز مورخ بھی تسلیم کرتے ہیں[1]۔ ڈسمبر ۱۷۶۸ء میں حیدر علی کی فوجیں بارہ محل میں داخل ہوئیں اور مارچ ۱۷۶۹ء مدراس سے پانچ میل پر پہنچ گئیں جس کے باعث حکومت مدراس نے اپنے لیے زبردست

[1] Thronton, History of British India, Vol. I, p. 366.

خطرہ محسوس کیا اور صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔

مدراس کا صلحنامہ

مدراس کونسل کے رکن مسٹر انڈریوز نے حیدر علی کے کیمپ میں آکر صلح کی شرطیں طے کیں اور بارہ روز کے لیے التوائے جنگ منظور کر لیا گیا حیدر علی کی شرطوں کو شروع میں مدراس کونسل نے ماننے سے انکار کیا لیکن بہت جلد یہ محسوس کیا گیا کہ وہ مدراس پر قبضہ کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ جب اس کی فوجیں مدراس کے بالکل قریب پہنچ گئیں تو مدراس کونسل کے دوسرے رکن مسٹر ڈیوپرے ۱۳ اپریل ۱۷۶۹ء صلح کی گفت و شنید کے لیے بھیجے گئے۔ صلح کی شرائط یہ تھیں کہ فریقین نے ایک دوسرے کے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے وہ واپس کر دیے جائیں۔ بارہ محل کرور کے علاقے اور دوسرے سرحدی مقامات جو اصل میں میسور کے تحت تھے اور جن پر نواب محمد علی والا جاہ قابض ہو گیا تھا وہ حیدر علی کو واپس کر دیے جائیں گے۔ یہ بات نواب والا جاہ کو بہت ناگوار گذری اور کمپنی کے خلاف اس کو شکایت کا موقع ملا لیکن حکومت مدراس مجبور تھی کہ حیدر علی سے معاہدہ کرے اور نواب والا جاہ کے مفاد کو قربان کرے اس لیے کہ بغیر ایسا کیے ہوئے اس کو مصیبت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا۔ شرائط صلح میں یہ بھی تھا کہ فریقین ایک دوسرے کے سب قیدی واپس کر دیں گے۔ اگر کسی تیسری قوت سے جنگ ہو تو فریقین ایک دوسرے کی فوجی اعانت کریں گے[۱]

صلحنامہ مدراس کے کچھ دنوں بعد حکومت بمبئی نے بھی حیدر علی کے ساتھ ایک علٰحدہ معاہدہ کر لیا جس کی رو سے کمپنی کو ریاست میسور میں مرچ خریدنے کا تنہا ٹھیکا حاصل ہو گیا جس کے عوض حکومت بمبئی حیدر علی کو توپیں، بندوقیں، شورہ، بارود اور سیسہ مہیا کرے گی اور اس کے بعد بھی جو رقم بچے گی وہ نقد ادا کی جائے گی۔ مالابار کے جنگلوں میں لکڑی خریدنے اور منگلور کی بندرگاہ سے چاول باہر بھیجنے کا بھی کمپنی نے حق حاصل کر لیا۔ حکومت بمبئی نے وعدہ کیا کہ وہ حیدر علی کے دشمنوں کی مدد نہ کرے گی اور اسی طرح حیدر علی کمپنی کے دشمنوں کی اعانت سے احتراز

---

[۱] Thronton History of British India P. 578

کرے گا۔[1]

غرض کہ حکومت مدراس اور بمبئی دونوں نے حیدر علی کے ساتھ جو معاہدے کیے ان میں اس امر کا وعدہ کیا گیا کہ اگر حیدر علی کی کسی دوسری قوت سے جنگ ہو تو انگریز اس کی مدد کریں گے۔ اس معاملہ میں بڑی نزاکت کے پہلو نکلتے تھے۔ نظام، مرہٹے اور حیدر علی کے مفاد کا تصادم اس قدر واضح تھا کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجایش نہیں تھی۔ انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ مدد کرنے کے وعدے تو ان تینوں قوتوں سے کریں لیکن انھیں آپس میں ایک دوسرے سے نبٹنے دیں تا کہ وہ آپس میں لڑ لڑ کے نڈھال ہو جائیں۔ انگریزوں نے پہلے سرکار نظام سے دوستانہ معاہدہ کیا، پھر حیدر علی سے اور سب سے آخر میں مرہٹوں سے بھی معاہدہ کرنے کی کوشش کی ظاہر ہے کہ ان تینوں طاقتوں کے مفاد جب ایک دوسرے سے دائمی طور پر ٹکرا رہے تھے تو یہ ناممکن تھا کہ انگریز ان سب کی مدد کر سکتے۔ پھر حکومت مدراس نے نواب والاجاہ کے ساتھ جو اتحاد قایم کر کے اس کو اپنی حفاظت میں لیا تھا اس کی وجہ سے بھی جنوبی ہند کی سیاست میں اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ نواب محمد علی والاجاہ سرکار نظام کا کم اور حیدر علی کا زیادہ مخالف تھا۔

اگرچہ اس نے عارضی طور پر کمپنی اور سرکار نظام میں یکسوئی اور صفائی کی کوشش کی تھی تا کہ حیدر علی کا خاتمہ کیا جا سکے لیکن وہ دل سے یہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ انگریزوں اور سرکار نظام میں مضبوط اتحاد قایم ہو۔ بلکہ اس کی کوشش برابر یہ رہی کہ حکومت مدراس مرہٹوں سے دائمی اتحاد قایم کرے تا کہ ان کی مدد سے حیدر علی اور سرکار نظام دونوں کو نیچا دکھانا

[1] Dupre to Orme, 10 June, 1769 (Love, Vestiges of old Madras, II. p. 599); Auber, Vol. I, p. 266-67.

ممکن ہو۔[4] معاہدہ مدراس میں جو شرطیں طے ہوئیں ان کی وجہ سے کمپنی دکن کی پر آشوب سیاست میں الجھ کر رہ گئی اور اس کے فوجی اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا۔ نواب محمد علی والاجاہ حکومت مدراس سے ناراض ہو گیا اس لیے کہ معاہدہ مدراس میں اس کے مفاد کو قربان کر دیا گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی شکایتیں جان میکفرسن کے ذریعہ جو ان دنوں انگلستان جا رہا تھا حکومت انگلستان تک پہنچوا دیں اور اس کے ساتھ حکومت مدراس نے جو بدسلوکی کی اس کی تفصیل لکھ بھیجی۔ نواب والاجاہ پر پچھلے دنوں جو قرض ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بھی اس میں اور حکومت مدراس میں ناموافقت پیدا ہو گئی تھی۔

مرہٹے اور حیدر علی

سنہ ۱۷۷۰ء میں حکومت انگلستان نے سر جان لنڈسے کو نواب محمد علی والاجاہ کی شکایات کے متعلق تحقیق کرنے اور کمپنی کے عام سیاسی حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے بطور سفیر خاص روانہ کیا۔ اس کے مدراس پہنچنے کے بعد مرہٹوں اور حیدر علی میں لڑائی چھڑ گئی۔ سنہ ۱۷۶۱ء کی جنگ پانی پت کے بعد اگرچہ مرہٹوں کی قوت مضمحل ہو گئی تھی لیکن اس کے سات سال بعد پیشوا مادھو راؤ کی سرکردگی میں مرہٹہ قوت کی تنظیم عمل میں لائی گئی اور نانا فرنویس کے تدبر نے کھوئے ہوئے مرہٹہ اقتدار کو پھر سے مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ فوجی تنظیم کے ساتھ تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے راجپوتانہ کے راجاؤں سے دس لاکھ کی رقم بطور چوتھ وصول کی گئی اور پھر سنہ ۱۷۷۰ء میں دوآبہ پر یورش کر دی گئی۔ روہیلے سردار حافظ رحمت خاں سے بھی (۴۰) لاکھ کی رقم کا وعدہ لے لیا گیا جس کی ضمانت نواب اودھ نے کی۔ حیدر علی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو مرہٹے اپنے لیے مخدوش خیال کرتے تھے۔ پچھلے دنوں میسور کے

4- Cambridge History of India, Vol. V, p. 277.

علاقے میں ان کے چوتھ کے حقوق کا حیدر علی نے خاتمہ کر دیا تھا۔ پیشوا نے حیدر علی سے ایک کروڑ کا مطالبہ کیا اور مرہٹے زبردست لشکر کے ساتھ قتل و غارت کرتے ہوئے سرنگا پٹم کی فصیلوں تک پہنچ گئے۔ حیدر علی نے ہر چند حکومت مدراس کو لکھا کہ صلحنامۂ مدراس کے بموجب انھیں مدد کرنی چاہیئے۔ اس نے حکومت مدراس کو یہ بھی لکھا کہ اگر اس وقت اس کی امداد کی گئی تو وہ بارہ محل کا علاقہ واپس کرنے اور کچھ رقم بھی ادا کرنے پر آمادہ ہے۔ اس نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر اس وقت اس کی مدد نہ کی نہ کی گئی تو وہ مجبور ہو کر فرانسیسیوں سے نامہ و پیام شروع کر دے گا تاکہ انھیں سے کچھ اعانت مل سکے۔ لیکن نواب محمد علی والاجاہ نے سر جان لنڈ سے کو اپنا ہم خیال بنالیا کہ انگریزوں کو حیدر علی کی امداد کے بجائے مرہٹوں سے اتحاد قایم کرنا چاہیے کہ اسی میں ان کے مفاد کی حفاظت ممکن ہے۔ چنانچہ لنڈ سے اور اس کے جانشین ہارلینڈ نے پیشوا سے معاہدہ کی گفت و شنید کی جس کی مدراس کونسل نے سخت مخالفت کی۔ غرض کہ کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ باوجود نواب محمد علی والاجاہ کی کوشش کے مرہٹوں سے معاہدہ نہ ہو سکا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں نے حیدر علی کی مطلق امداد نہ کی۔ اب حیدر علی کے لیے مرہٹوں سے دب کر صلح کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ چنانچہ اس نے چھتیس لاکھ روپے نقد ادا کیے اور چودہ لاکھ سالانہ چوتھ دینے کا وعدہ کیا اور اپنی ریاست کے شمال مغربی اضلاع مرہٹوں کے حوالہ کر دئے۔ اسنے یہ صلح بہت گراں قیمت پر خریدی۔ اس نے انگریزوں کی وعدہ خلافی کو فراموش نہیں کیا اور نو سال بعد ان سے جنگ کر کے تاوان وصول کیا۔

نواب محمد علی والاجاہ نے شاہی سفیر لنڈ سے اور اس کے جانشین ہارلنڈ کو ایسا قابو میں کر لیا کہ وہ اسکا کلمہ پڑھنے لگے اور وہ جو کچھ چاہتا اس کی تائید کرتے۔ نواب نے تنجور کے راجا سے اپنے پیشکش کے مطالبات

کی رقم وصول کرنے کی کوشش شروع کی تو ظاہر ہے کہ وہ کمپنی کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ مدراس کونسل بھی اس کی ہم نوا ہو گئی۔ سنہ ۱۷۶۲ء میں گورنر پیگاٹ کے بیچ میں پڑنے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ راجا تنجور نواب محمد علی والاجاہ کو آئندہ سے پابندی کے ساتھ پیشکش ادا کیا کرے گا۔ نواب محمد علی والاجاہ نے راجا تنجور پر یہ الزام لگایا کہ اس نے حیدر علی کے ساتھ ساز باز کر رکھا ہے اور جو رقم واجب الادا ہے وہ بھی نہیں ادا کی۔ چنانچہ کمپنی کی افواج نے سنہ ۱۷۷۱ء میں تنجور پر حملہ کر کے راجا کو گرفتار کر لیا۔ اس پر انگلستان میں سخت تنقیدیں ہوئی اور سابق گورنر پیگاٹ کو حکومت مدراس کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ پیگاٹ نے مدراس پہنچ کر راجا کو اس کی گدی پر بحال کر دیا۔ اب نواب محمد علی والاجاہ اور گورنر پیگاٹ میں سخت کشمکش شروع ہوئی۔ نواب والاجاہ نے اپنے قرض خواہوں کو جن میں اکثر انگریز ساہوکار (بینکرز) تھے تنجور کے علاقے میں براہ راست مالگذاری وصول کرنے کے حقوق دیدئے تھے تاکہ ان کے قرض کی بازیابی ہو۔ اس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ان قرض خواہوں میں پال بن فیلڈ نے بعد میں بہت شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ مدراس کونسل کے بعض ارکان کا بھی نواب پر قرض تھا۔ وہ بھی تنجور میں مالگذاری وصول کرنے کے حق سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مدراس کونسل کے ارکان کی اکثریت گورنر پیگاٹ کی قدم قدم پر مخالفت کرنے لگی جس کی وجہ سے اس کو کم و بیش اسی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جو وارن ہسٹنگز کو بنگال میں پیش آئی تھی۔ جنوبی ہند کے نظم و نسق میں سخت ابتری پیدا ہو جانا ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔

چھٹا باب

وارن ہیسٹنگز کا نظم و نسق اور انگریزی حکومت کا استحکام

وارن ہیسٹنگز سنہ ۱۷۴۹ء میں ۱۸ سال کی عمر میں کمپنی کے معمولی اہلکار کی حیثیت سے پہلی مرتبہ ہندوستان آیا۔ اپنی محنت اور قابلیت سے اس نے ایک ایک کر کے ترقی کے سب درجے طے کئے۔ پہلے پہل کلائیو نے اس کے ذاتی جوہر کو پہچانا اور قدر کی۔ جنگ پلاسی کے بعد وارن ہیسٹنگز کو میر جعفر کے دربار میں کمپنی کے ریزیڈنٹ کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ پھر وہ کلکتہ کونسل کا رکن ہوا۔ جنگ بکسر کے بعد وہ انگلستان واپس گیا لیکن سنہ ۱۷۶۹ء میں کمپنی کی مجلس نظما نے اس کو مدراس کونسل کی رکنیت پر اور پھر سنہ ۱۷۷۲ء میں بنگال کی گورنری پر متغرر کیا۔

دو عملی کا خاتمہ

وارن ہیسٹنگز نے جس وقت حکومت بنگال کا جائزہ لیا اس وقت کلائیو کے قائم کئے ہوئے دو عملی کے نظام کی خرابیاں اچھی طرح ظاہر ہو چکی تھیں۔ یہ انتظام ملک کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا جس سے چھٹکارا دلانا ضروری تھا۔ مرشدآباد کے انگریز ریزیڈنٹ بیشر Becher. نے بنگال کی ابتری کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا ہے:-

"ہر انگریز کو یہ معلوم کر کے رنج ہونا چاہئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی کے حقوق ملے ہیں اس ملک کے باشندوں کی حالت پہلے کے مقابلہ میں بہت خراب

ہوگئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خوشنما ملک جو انتہا درجہ کی استبدادی اور مطلق العنان حکومت کے تحت خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا اب جب کہ انگریزوں کا اس کے نظم ونسق میں بڑا حصہ ہے، تباہی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے[1] دوعملی کے تحت اوصول مالگزاری کا انتظام نائب دیوان محمد رضا خاں اور شتاب رائے اور ان کے مقرر کئے ہوئے عاملوں اور گماشتوں کے ذریعے سے ہوتا تھا لیکن انگریز ریزیڈنٹ کی نگرانی ان پر رہتی تھی۔ ہر ضلع میں جو انگریز نگراں کار (سپروائزر) مقرر کئے گئے تھے وہ دیسی بنیوں کے ذریعے اندرونی تجارت سے خوب دل کھول کر نفع کما رہے تھے۔ باہر کے سٹہ کرنے والے بھی رعایا کا خون چوس رہے تھے ۱۷۷۰ء کے قحط کے بعد دوعملی کے نظم ونسق سے رعایا اور زیادہ تباہ و برباد ہو رہی تھی۔ وارن ہیسٹنگز نے پہلا کام یہ کیا کہ محمد رضا خاں اور شتاب رائے دونوں کو خدمت سے الگ کر کے ان پر غبن کا مقدمہ قائم کر دیا اور دونوں کو کلکتہ میں قید کر دیا تاکہ کمپنی کے خلاف وہ اپنے اثر کو استعمال نہ کر سکیں۔ ایک سال کے بعد دونوں کو بری کر دیا گیا۔ ان تمام کارروائیوں کے لیے اس نے پہلے ہی سے مجلس نظماء سے سب کچھ طے کر لیا جس نے اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات دے دئے تھے[2] اس لئے کہ بنگال کی انتظامی ابتری سے انگریزی تجارت اور آمدنی کو بالآخر نقصان پہنچتا۔ آیندہ دو سال میں بنگال کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لئے جو تدبیریں کی گئیں ان کی پوری ذمہ داری وارن ہیسٹنگز پر ہے جیسے اس نے خود مانا ہے[3]

نظم ونسق کی اصلاح

وارن ہیسٹنگز نے مالگزاری جانچ کرا کے زمینوں کو پانچ سال کے ٹھیکہ پر نیلام کرا دیا اور انگریز کلکٹروں کے

[1] Monckton Jones, Warren Hastings in Bengal, صفحہ 145.

[2] ایضاً صفحہ ۸۵

[3] Selections from the state papers of the Governers-General of India....Warren Hastings ed. by G. W. Farrest). جلد دوم II صفحہ

ذریعہ مالگزاری کی پوری رقم وصول ہونے کا انتظام کیا۔ اس کی پابندی بھی کی گئی کہ رعایا پٹہ پر زمین لے سکے اور مقررہ لگان میں اضافہ نہ کیا جائے۔ کلکٹروں کو نج کی تجارت سے پورے طور پر روک دینا ممکن نہ تھا جب تک کہ ان کی تنخواہ میں کافی اضافہ نہ کیا جاتا جس کے لیے کمپنی اس وقت تیار نہ تھی۔ چنانچہ نج کی تجارت کی کچھ برائیوں کو تجارت کے قاعدے وضع کر کے دور کیا گیا۔ دستک کا طریقہ بند کر دیا گیا۔ کمپنی اور اس کے ملازمین اور دیسی تاجروں کے لیے محصول میں یکسانی قایم کر دی گئی تاکہ فرق و امتیاز کی وجہ سے جو آئے دن جھگڑے ہوا کرتے تھے وہ نہ ہوں لہٰ پٹنہ اور مرشدآباد کی دو مجالس مال (ریونیو بورڈز) کی جگہ اس نے کلکتہ میں ایک مجلس مال قایم کی اور خزانہ بھی مرشدآباد سے کلکتہ کو منتقل کر دیا۔ مجلس مال گورنر اور اس کی کونسل کے چار ارکان پر مشتمل تھی۔ بنگال کو مالگزاری جمع کرنے کی آسانی کے لحاظ سے چودہ ضلعوں میں تقسیم کیا گیا۔ مالگذاری کے عہدہ داروں (کلکٹروں) کی ہدایت کے لیے قاعدے مرتب کیے گئے۔ ہر ضلع میں ایک دیوانی اور ایک فوجداری عدالت قایم کی گئی۔ یہ دونوں عدالتیں کلکٹر کے تحت ہوتی تھیں۔ فوجداری عدالت میں کلکٹر ایک قاضی اور دو مفتیوں یا ہندو پنڈتوں کی مدد سے مقدموں کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ کلکتہ میں صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت مرافعہ کے لیے قایم کی گئیں۔ صدر دیوانی عدالت کے مرافعوں کی سماعت ایک ہندوستانی جج کرتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین کی تدوین کروائی تاکہ مقدموں کے فیصلوں میں آسانی ہو۔ سنسکرت سے فارسی میں ہندوؤں کے قوانین کا مجموعہ منتقل کیا گیا اور مسلمانوں کے مقدموں کے لیے فتاویٰ عالمگیری کو معیار قرار دیا گیا۔ ہر ضلع میں پولیس کے محکمہ کی تنظیم کی گئی اور فوجداروں کا تقرر کیا گیا جو ضلع میں امن کے قیام کے ذمہ دار تھے۔ چنانچہ پولیس کے اس نئے انتظام کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ ہمالیہ کی ترائی میں جو سنیاسی لوگوں

لہٰ۔ Ramsay Muir, the Making of British India. صفحہ 107

کے غول پھرا کرتے تھے اور گاؤں میں سے چھوٹے بچوں کو چرا لے جایا کرتے تھے انھیں سخت سزائیں دے کر ان کی پوری روک تھام کی گئی - یہ اصلاحیں وارن ہیسٹنگز نے اپنی گورنری کے ابتدائی چھ مہینوں میں نافذ کیں۔

نواب نجم الدولہ کا انتقال کلائیو کے عہد ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میر جعفر کے دو بیٹے سیف الدولہ اور پھر مبارک الدولہ باری باری سے نواب ہوئے - مبارک الدولہ گدی نشینی کے وقت نابالغ تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے اس کی والدہ منی بیگم کو اس کا ولی اور راجا نند کمار کے بیٹے راجا گرو داس کو محل کے انتظامات کا نگران کار مقرر کیا۔ نواب کو ۳۲ لاکھ روپے سالانہ بنگال کی مالگزاری میں سے دئے جاتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے اب ۱۶ لاکھ روپے سالانہ مقرر کر دئے۔ محل کے انتظامات میں جو فضول خرچیاں ہوتی تھیں ان کی بھی روک تھام کی گئی۔

بنارس کا معاہدہ ستمبر ۱۷۷۳ء

اندرونی اصلاحات کی طرف سے تھوڑی بہت فرصت پانے کے بعد ہیسٹنگز نے کمپنی کے خارجی تعلقات کی طرف توجہ کی۔ کلائیو کے زمانے میں مرہٹوں کی سیاسی قوت پانی پت کی جنگ کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن ۱۷۶۹ء میں انھوں نے پھر نربدا پار کر کے دہلی کی سیاست پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی۔ مادھوجی سندھیا ۱۷۷۱ء میں بادشاہ شاہ عالم کو اپنے ساتھ الہ آباد سے دہلی لے گیا اور مدت تک وہ ایک نظر بند کی حیثیت سے رہا۔ جس طرح انگریز شاہ عالم کو الہ آباد میں اپنے قابو میں رکھ کر سیاسی فائدے اٹھانا چاہتے تھے اسی طرح مرہٹے اس کو دہلی میں رکھ کر اس کے ذریعہ سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شاہ عالم نے مادھوجی سندھیا کو سلطنت کا وکیل مطلق مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے دوآبہ کے علاقہ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ پھر جب مرہٹہ فوجوں کو دہلی خالی کرنا پڑا تو غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا کر قید کر دیا۔ لیکن سندھیا نے دہلی پر پھر قبضہ کر کے شاہ عالم کو چھڑایا اور اس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ چنانچہ

ہیسٹنگز نے ۲۶ لاکھ کی پیشکش بند کردی جو سالانہ ادا کی جاتی تھی اور کڑہ و الہ آباد کے ضلعوں پر جو کلائیو نے اس کے گذارے کے لئے دئے تھے انگریزی فوجوں نے قبضہ کرلیا اس لیے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ مرہٹے ان پر قبضہ کرلیں گے۔ اگست سنہ ۱۷۷۳ء میں وارن ہیسٹنگز نے شجاع الدولہ نواب اودھ کے ساتھ بنارس میں معاہدہ کیا جس کی رو سے الہ آباد اور کڑہ کے ضلعے پچاس لاکھ روپئے کے معاوضہ میں اس کے حوالہ کردئے گئے۔ یہ بھی طے ہوا کہ کمپنی نواب کی فوجی مدد کرے گی تاکہ وہ رہیلکھنڈ کے علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کرسکے۔[1] جب تک انگریزی فوجیں نواب کے استعمال میں رہیں گی اس وقت تک وہ دو لاکھ دس ہزار روپئے ماہوار ان کے خرچ کی بجا آوری کے لیے ادا کرے گا۔ نواب نے وعدہ کیا کہ رہیلوں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ بنارس کے قریب چنار کا قلعہ کمپنی کو دیدے گا۔ اس کے علاوہ وہ چالیس لاکھ کی رقم بھی ادا کرے گا جو فوج کے اخراجات کے علاوہ ہوگی۔ ہیسٹنگز نے سوچا کہ اس معاہدہ سے کمپنی کی مالی حالت بھی اچھی طرح سدھر جائے گی اور رہیلوں کی قوت کا بھی خاتمہ ہوجائے گا جن کا اگر مرہٹوں سے اس وقت اتحاد ہوجاتا تو اودھ اور کمپنی کے علاقوں کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ رہیلوں نے اب تک انگریزی حکومت کی مخالفت میں کوئی کارروائی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے انھیں کمپنی کا دشمن سمجھا جاتا۔

رہیلوں کی جنگ

انگریزوں سے معاملوں کی یکسوئی کے بعد نواب شجاع الدولہ نے رہیلہ سردار حافظ رحمت خاں سے ۳۵ لاکھ کی رقم طلب کی جس کے ادا کرنے کا اس نے اس شرط سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرہٹوں کے خلاف اس کی حفاظت میں امداد کرے۔ کل رقم ۱۷ جون ۱۷۷۲ء کے معاہدہ کے ذریعہ ۴۰ لاکھ ہوئی تھی جس میں سے پہلی قسط

---

[1] Selections from the state papers of the Governors-General of India, Warren Hastings, جلد II, صفحہ 314.

حافظ رحمت خاں نے نواب وزیر کو ادا کر دی تھی۔ حافظ رحمت خاں نے کہا کہ مرہٹوں کی واپسی نواب وزیر کی کوشش سے نہیں بلکہ دربار پونا کے حکم سے ہوئی جس میں نواب وزیر کی کوششوں کو کوئی خاص دخل نہ تھا۔ غرض کہ کچھ دن نواب وزیر اور رہیلہ سردار میں بات چیت ہوتی رہی۔ آخر نواب وزیر نے وارن ہیسٹنگز کو مدد کے لیے لکھا جو معاہدہ بنارس کی رو سے اس کا وعدہ کر چکا تھا۔ کلکتہ کونسل نے کچھ سوچ بچار کے بعد نواب وزیر کی فوجی مدد کرنے کی تائید کی[1]۔ چنانچہ کرنل چیمپین کے تحت انگریزی فوج اودھ روانہ ہو گئی۔ انگریزی فوج اور نواب کی فوج نے مل کر روہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا۔ میرن پور کٹرہ کے مقام پر بڑا رن پڑا جس میں حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ تقریباً ۲۰ ہزار رہیلوں نے اپنے وطن چھوڑ کے گنگا پار جا کر اپنی بستی بسائی تاکہ نواب اودھ کے تابو سے نجات ملے۔ روہیلکھنڈ کا پورا علاقہ اودھ میں ملا لیا گیا۔ صرف رامپور کی ریاست باقی رہی جہاں فیض اللہ خاں کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا جس کے ساتھ ۷ اکتوبر ۱۷۷۴ء کمپنی نے دوستانہ معاہدہ کر لیا۔ موجودہ نواب رامپور فیض اللہ خاں ہی کی اولاد میں ہیں۔ خود کرنل چیمپین نے ان زیادتیوں کی شکایت کی جو نواب اودھ کے سرداروں نے روہیلکھنڈ کی رعایا پر روا رکھیں۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز سے جب پوچھ گچھ شروع ہوئی تو جنگ رہیلہ کے سلسلے کی زیادتیاں ایک ایک کر کے اس کے خلاف الزام کے طور پر پیش کی گئیں۔

سر جان اسٹریچی، جس نے وارن ہیسٹنگز کی حمایت کی ہے، جنگ رہیلہ کے فائدوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ روہیلکھنڈ پر نواب وزیر کا قبضہ ہو جانے سے اودھ اور بنگال کی شمال مغربی سرحد مرہٹوں سے محفوظ ہو گئی جو اس وقت انگریزی حکومت کے سب سے قوی دشمن تھے۔ پھر یہ دعویٰ بھی درست نہیں کہ جنگ رہیلہ کے سلسلے میں جو مظالم ہوئے ان کی ذمہ داری ہیسٹنگز پر نہیں ہے اس واسطے کہ جنگ کی تفصیلات اس نے معین نہیں کی تھیں۔ دراصل یہ جنگ

[1] Strachey, W. Hastings and the Rohilla War, p. 123

اخلاقی طور پر حق بجانب نہیں کہی جاسکتی۔ بقول لائیل (۱) یہ جنگ اصولاً غلط تھی اس لیے کہ رہیلوں نے ہمیں کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور نواب وزیر سے اس کے سوا کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ اپنے اس مفید تعلق سے جو اس کو انگریزوں کے ساتھ حاصل تھا بیجا فائدہ اٹھاتا۔(۲)

اس وقت کے حالات کی جانچ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ رحمت خاں نے رہیلکھنڈ کے علاقے میں جو حکومت قایم کی تھی وہ انتشار کے اس دور میں بہت غنیمت تھی اور نواب اودھ کی حکومت سے کہیں بہتر تھی۔ اس نے تقریباً چالیس سال تک ملک میں امن و امان قایم رکھا۔ چنانچہ رام پور میں جو پہلے انگریز ریزیڈنٹ بھیجا گیا تھا اس نے لکھا تھا کہ حافظ رحمت خاں کے عہد حکومت میں پورے رہیلکھنڈ میں شاید ہی چپا بھر زمین بے کاشت کے رہی ہو۔ لیکن غالباً اس جنگ کا اصلی محرک کمپنی کی مالی ابتری تھی جسے درست کرنے کی غرض سے وارن ہیسٹنگز نے غیر منصفانہ اقدام کیا۔ چنانچہ مجلس نظماء نے اس جنگ کے اصول سے اختلاف کیا اور اسے ناحق اور ناروا ٹھیرایا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ رہیلوں نے رہیلکھنڈ کے علاقے کو مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں غاصبانہ طور پر حاصل کیا تھا۔ جس طرح ملک کے دوسرے حصوں میں مرکز گریز قوتیں کام کر رہی تھیں اسی طرح یہاں بھی انھیں قوتوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جس طرح نواب وزیر نے اودھ میں اپنی حکومت قایم کر لی اسی طرح حافظ رحمت خاں نے مرکزی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر رہیلکھنڈ میں نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی جس طرح انگریز کمپنی کو بنگال اور مدراس کے علاقہ میں اپنی حکومت کے ڈول ڈالنے کا حق تھا اسی طرح حافظ رحمت خاں اور اس کے ساتھی اپنے علاقوں کے انتظام کو سنبھالنے کے مجاز تھے۔ شاہ عالم کو انگریز، مرہٹے، اور رہیلے تینوں اپنے اپنے مقاصد کے لیے دباؤ میں رکھنا چاہتے تھے۔ چونکہ رہیلے بہادر اور جنگجو تھے اس لیے انگریزی حکومت ان

۱۔ Strachey, W. Hastings and the Rohilla War, p. 123

۲۔ Reports from committees of the House of Commons. VI, p. 30.

کے استحکام میں آئندہ کے لیے خطرہ تصور کرسکتی تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ رہیلوں کی طرف سے اب تک انگریزی مفاد کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا تھا۔ شجاع الدولہ کا یہ کہنا کہ مرہٹے اور رہیلے اتحاد کرلیں گے ٹھیک نہیں۔ یہ دعوی محض اس لیے کیا گیا تھا کہ انگریزوں کے دل میں رہیلوں کی طرف سے خدشے پیدا ہو جائیں۔ نواب وزیر کے تحت آنے کے بعد رہیلکھنڈ کا نظم و نسق پہلے کے مقابلہ میں بہت خراب ہوگیا اور رعایا چین اور عافیت سے محروم ہوگئی جس کی ذمہ داری وارن ہیسٹنگز کی حکمت عملی ہی پر عاید ہوتی ہے۔

قانون تنظیم ۱۷۷۳ء

کچھ عرصے سے انگلستان کے سوچنے سمجھنے والے طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاصل کئے ہوئے ہندوستان کے وسیع علاقوں پر تاج کی براہ راست حکومت قایم ہونی چاہیے اس لیے کہ کمپنی ان پر حکومت کی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ نہیں ہوسکے گی۔ خود کلائیو نے بھی پٹ کو ۱۷۵۹ء میں ایک خط میں لکھا تھا کہ کمپنی نے بنگال میں جو حقوق اور اختیارات حاصل کرلیے ہیں انھیں وہ بغیر قوم کی مدد کے برقرار نہیں رکھ سکتی۔ لیکن پٹ اس وقت کمپنی کے اختیارات کے دستوری مسئلہ کو اٹھانا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اس کے ضمن میں بہت سی پیچیدگیوں کے پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔ لیکن پارلیمنٹ کے بعض ارکان اپنی تقریروں میں کمپنی کے ہندوستانی نظم و نسق پر سخت تنقید ہی نہیں بلکہ کھلم کھلا یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ کمپنی نے ہندوستان میں جو مقبوضات حاصل کئے ہیں وہ قانوناً اس کے نہیں بلکہ تاج کے ہیں۔ حکومت نے اس وقت صرف اتنی مداخلت روا رکھی کہ پارلیمنٹ کے ایک منظور کئے ہوئے قانون کی رو سے کمپنی پر لازم کیا گیا کہ وہ سالانہ چار لاکھ پونڈ حکومت انگلستان کو ان مقبوضات کے صلہ میں ادا کرے جو اس نے انگریزی قوم کی مدد سے ہندوستان میں حاصل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ کمپنی کا فرض قرار پایا کہ کم سے کم ۲۳ لاکھ پونڈ کے برطانوی سامان کو سالانہ برآمد کیا کرے۔ اس سے زیادہ حکومت انگلستان نے کمپنی کے معاملات میں دخل دینا مناسب نہیں خیال کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ بنگال کے دیوانی حقوق ملنے کے بعد کمپنی کے ملازموں نے شخصی طور پر دونوں ہاتھوں سے خوب دولت سمیٹی لیکن کمپنی کی مجموعی طور پر مالی حالت خراب ہوتی گئی۔ کلائیو جانتا تھا کہ انگلستان میں کمپنی کے ملازموں کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھکر کمپنی کی حالت کے متعلق جو رائے قائم کی جارہی تھی وہ ٹھیک نہ تھی۔ چنانچہ جب پارلیمنٹ نے یہ قانون منظور کیا کہ کمپنی حکومت انگلستان کو سالانہ چار لاکھ پونڈ ادا کیا کرے تو کلائیو نے اس کی مخالفت کی لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کئی سال سے کمپنی اپنے مالی خسارہ کی بنک آف انگلینڈ سے قرض لے کر بھرپائی کر رہی تھی۔ ۱۷۷۲ء میں کمپنی نے لارڈ نارتھ کی وزارت سے دس لاکھ پونڈ کے قرضے کی درخواست کی تو پارلیمنٹ کے ان ارکان کو جو کمپنی کے مخالف تھے اس بات کا موقع ملا کہ وہ کمپنی کے حالات کی چھان بین کی تجویزیں پیش کریں۔ چنانچہ لارڈ نارتھ کی حکومت نے کمپنی کے معاملات کی جانچ پڑتال کے لیے دو کمیٹیاں مقرر کیں۔ ایک پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ (سلکٹ کمیٹی) جو ۳۱ ارکان پر مشتمل تھی اور دوسری خفیہ مجلس جو ۱۳ ارکان پر مشتمل تھی۔ ان دونوں کمیٹیوں نے کمپنی کے معاملات کی تفصیلی چھان بین کی اور بتایا کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۷۶۶ء تک کمپنی کے مختلف ملازموں نے بنگال کے باشندوں سے تقریباً ۲۲ لاکھ پونڈ نذرانہ کے طور پر وصول کئے ہیں۔ اس رقم میں کلائیو کی جاگیر شامل نہیں ہے جس کی قیمت بطور سرمایہ کے اگر معین کی جائے تو ۶ لاکھ پونڈ ہوگی۔ دونوں کمیٹیوں کی رپورٹ میں کلائیو پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ اس نے جاگیر اور نقد رقم جو حاصل کی وہ کمپنی کی ملکیت قرار دینی چاہئے تھی کمیٹیوں نے یہ بھی سفارش کی کہ کمپنی کے انتظام اور حکومت کے ڈھنگ میں بنیادی تبدیلی کر دی جائے تاکہ حالات میں بہتری پیدا ہو۔

لارڈ نارتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستور میں تبدیلی کے متعلق پارلیمنٹ میں جو تجویزیں پیش کیں وہ ایک قانون کی شکل میں منظور ہوئیں جسے قانون تنظیم (ریگولیٹنگ ایکٹ) کہتے ہیں۔ اس قانون کے بموجب صرف کمپنی کے دستور ہی میں تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ کمپنی کا جو تاج کے ساتھ تعلق تھا اس کی بھی صراحت

کر دی گئی۔ کمپنی کا یہ فرض قرار پایا کہ اپنے تمام اہم کاغذات وزرائے انگلستان کے سامنے پیش کیا کرے۔ اسی طرح وزیروں کے توسط سے پارلیمنٹ کا عمل دخل کمپنی کے نظم و نسق میں موثر ہو گیا۔ کمپنی نے ہندوستان میں جو مقبوضات حاصل کر لئے تھے انھیں اسی کے تصرف میں رہنے دیا گیا۔ مجلس نظما کے ارکان کے عہدہ کی مدت بجائے ایک سال کے چار سال قرار دی گئی اور صرف مجلس شرکا کے ان ارکان کو حق رائے دہی دیا گیا جنھوں نے کم از کم ایک ہزار پونڈ کے حصے برابر ایک سال تک رکھے ہوں۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ کمپنی کے معاملات میں جو لوگ اپنی رائے سے فیصلے کریں ان کے احساس ذمہ داری میں اضافہ ہو۔ گورنر بنگال کو ہندوستان میں کمپنی کے سارے مقبوضات کا گورنر جنرل بنا دیا گیا جسے بمبئی اور مدراس کے احاطوں (پریسی ڈنسیوں) پر نگرانی کا اختیار دیا گیا۔ اس کی چار ارکان کی ایک کونسل تجویز کی گئی۔ ارکان کی مدت عہدہ پانچ سال قرار پائی۔ گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے چاروں ارکان کے نام قانون تنظیم میں ظاہر کر دئے گئے۔ وارن ہیسٹنگز کو گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ کونسل کے ارکان یہ تھے۔ جان کلیورنگ، جارج مانسن، فلپ فرانسس اور رچرڈ بارول۔ قانون میں اس کی صراحت تھی کہ گورنر جنرل کی کونسل کے فیصلے کثرت رائے سے طے ہوا کریں گے۔ مدراس اور بمبئی کے احاطوں کی حکومتیں گورنر جنرل بنگال بہ اجلاس کونسل کی اجازت کے بغیر ہندوستانی والیان ملک سے جنگ یا صلح نہیں کر سکیں گی سوائے ایسی صورت کے کہ اجازت حاصل کرنے میں جو تاخیر ہو گی اس کے سبب سے کمپنی کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے لئے ضوابط و احکام (آرڈی ننس) نافذ کرنے کا حق ہوگا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ احکام کسی حیثیت سے بھی قوانین انگلستان کے خلاف نہ ہونے چاہییں۔ تاج بہ اجلاس کونسل کو حق ہوگا کہ ان احکام کو مسترد کر دے۔ قانون تنظیم کی رو سے فورٹ ولیم میں ایک عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) ایک چیف جسٹس اور تین ججوں کی قائم کی گئی۔ وارن ہیسٹنگز کا یار اور ہم مکتب سر ایلیجا امپی چیف جسٹس مقرر کیا گیا۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے وضع کئے ہوئے ضوابط و

احکام اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ عدالت عالیہ انھیں شائع نہ کرے۔ گورنر جنرل کی ۲۵ ہزار پونڈ سالانہ، ہر رکن کونسل کی ۱۰ ہزار پونڈ سالانہ اور چیف جسٹس کی ۸ ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی۔ قانون کی دوسری دفعات میں کمپنی کے عہدہ داروں کے لیے نجی تجارت یا تحفے وصول کرنا قطعی ناجائز قرار دیا گیا۔

قانون تنظیم کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس کی زبان غیر واضح اور مبہم تھی جس کی وجہ سے بعد میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ پھر عاملہ اور عدلیہ کے اختیارات کی حد بندی نہیں کی گئی۔ بعض اوقات عدالت عالیہ ایسے فیصلے کر دیتی تھی جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا تمام انتظامی محکمے اس کے تحت ہیں جن کی کارروائیوں کی نظر ثانی اور نگرانی کا اسے پورا اختیار ہے۔ چونکہ مقننہ موجود نہ تھی اور خود وہ قوانین مبہم اور غیر متعین تھے جن کے نافذ کرنے کا عدالت عالیہ کو مجاز کیا گیا تھا، اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت عالیہ کو اپنے اختیارات کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ قانون تنظیم میں اس کی صراحت نہ تھی کہ عدالت عالیہ کا حلقہ سماعت کیا ہے اور وہ کونسا قانون نافذ کرنے کی مجاز کی گئی ہے۔ حکام عدالت کہتے تھے کہ کمپنی کے تمام مقبوضات سلطنت برطانیہ کا جز ہیں اس لیے عدالت عالیہ کے احکام ہر جگہ موثر ہونے چاہئیں اور انہیں یہ بھی اختیار ہے کہ وہ دیسی عدالتوں کی نگرانی کریں جو نواب بنگال کے تحت تھیں جسکے مقتدرانہ حقوق کی نسبت قانون تنظیم میں کسی قسم کی توضیح نہیں کی گئی تھی۔ عدالت عالیہ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ انگلستان کے قوانین کا اطلاق کمپنی کے ملازموں کے علاوہ بنگال کے تمام زمینداروں اور محاصل اراضی وصول کرنے والوں پر کر سکتی ہے اس لیے کہ یہ سب کمپنی کے ملازموں کے ذیل میں آتے ہیں۔ ملک کے باشندوں کے نزدیک عدالت عالیہ استبداد کا آلہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ عام طور پر اس کو ایک ڈراؤنی چیز سمجھتے تھے جس کے طریق کار میں ان کے لیے پریشانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

قانون تنظیم کے مطابق گورنر جنرل کو کونسل کی کثرت رائے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ کونسل کے تین ارکان کلیورنگ، فلپ فرانسس اور مونسن

مل کر وارن ہیسٹنگز کو زچ کر دیتے تھے اور وہ ان کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ ایسے اہم امور میں جن کے فیصلہ کے وقت اتحاد عمل کی ضرورت ہوتی ہے گورنر جنرل کو اپنی کونسل کے ارکان کی مخالفانہ جھنوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ قدم قدم پر کونسل کے ارکان گورنر جنرل کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے جن سے ملکی نظم ونسق کو سخت نقصان پہنچا۔ فلپ فرانسس کو وارن ہیسٹنگز سے شخصی اختلاف تھا۔ جب وہ انگلستان ہی میں تھا اسی وقت سے اس کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک وارن ہیسٹنگز کو اس کے عہدہ سے برطرفی کے لیے مجبور نہ کر دیا جائے اس وقت تک کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے نظم ونسق کو درست نہیں کیا جا سکتا۔ چھ سال تک برابر وارن ہیسٹنگز کو اپنی کونسل کے ارکان کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کی عام حکمت عملی اور طرز حکمرانی کے سخت مخالف تھے۔ بس عدالت عالیہ سے مقابلہ کے لیے گورنر جنرل اور کونسل کے ارکان میں وقتی اتفاق ہو جاتا تھا ورنہ ویسے ہر معاملہ میں شخصی مخالفت قایم رہتی تھی۔ چنانچہ اکثر وارن ہیسٹنگز ایسے فیصلوں کے نافذ کرنے پر مجبور ہوتا تھا جنھیں وہ خود پسند نہیں کرتا تھا۔ مجلس نظماء میں بھی اس کی حمایت کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جس پر وہ بھروسا کر سکتا۔

ایک تو حکومت کو کونسل کی مخالفت نے اپاہج کر رکھا تھا اور دوسرے قانون تنظیم میں مدراس اور بمبئی کے احاطوں کو اجازت دی گئی تھی کہ سخت ضرورت کے وقت اپنی قوت فیصلہ استعمال کریں تاکہ کمپنی کے مفاد کو نقصان نہ پہنچے چنانچہ مدراس اور بمبئی کی حکومتیں قانون کی اس دفعہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے جان بوجھ کر کلکتہ کی حکومت سے پوچھ گچھ کو غیر ضروری خیال کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر جنرل کو ان پر قابو حاصل نہیں رہا۔ خاص کر مرہٹوں کی پہلی لڑائی کے موقع پر بمبئی کی حکومت نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ نہ صرف کلکتہ کی حکومت کی حکمت عملی کے خلاف تھا بلکہ اس کی وجہ سے بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

لیکن باوجود ان خرابیوں کے قانون تنظیم سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کمپنی کا نظم ونسق پارلیمانی اثر و اقتدار کے تحت آگیا اور ہندوستان میں انگریزی حکومت

ایک دستور کے تحت ہو گئی۔ اگرچہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات پر تاج برطانیہ کا راست اقتدار ۱۸۵۸ء تک قایم رہا لیکن قانون تنظیم سے حکومت انگلستان کی نگرانی کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ ۱۷۷۳ء تک کمپنی کا طرز حکمرانی غیر معین تھا۔ قانون تنظیم کے بعد اس میں تھوڑا بہت دستوری تعین کا رنگ پیدا ہوا۔ کمپنی کے وہ انتظامات جو محض تجارتی اغراض کے تحت کئے جاتے تھے اب آیندہ سے حکومت وسیاست کی ضروریات کے لحاظ سے انجام پانے لگے۔

وارن ہیسٹنگز اور کونسل

قانون تنظیم کے بموجب گورنر جنرل کی کونسل میں چار ارکان نامزد کیے گئے تھے۔ گورنر بنگال کی پرانی کونسل میں سے صرف ایک بارول کو رکن رکھا گیا۔ باقی تین انگلستان سے بھیجے گئے ان میں فلپ فرانسس لبرل جماعت کا ممتاز رکن اور انشا پرداز کی حیثیت سے ملک میں کافی مشہور تھا۔ دوسرے کرنل مانسن شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور تیسرے جنرل کلیورنگ جس کے تعلقات شاہی خاندان اور وزیروں کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ یہ تینوں ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت جبر اور سختی کا ایک مجموعہ ہے اور خود وارن ہیسٹنگز اس جبر اور بے انصافی کا آلہ کار ہے جو کمپنی کے تمام ہندوستانی مقبوضات میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تینوں ایک ہی جہاز سے ۲۰ نومبر ۱۷۷۴ء کو کلکتہ پہنچے گودی سے اتر کر گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ وارن ہیسٹنگز نے بجائے پرتپاک سواگت کرنے کے بے رخی ظاہر کی۔ چنانچہ تینوں نے اس کی شکایت اپنے خطوں میں کی ہے جو انھوں نے ہندوستان پہنچکر ولایت بھیجے۔ غرضکہ ان تینوں میں اور وارن ہیسٹنگز میں اسی دن سے اختلاف رونما ہو گیا جس دن وہ ہندوستان پہنچے اور یہ اختلاف اس وقت تک قایم رہا جب تک کہ ان تینوں میں سے دو کا انتقال نہ ہو گیا اور تیسرا یعنی فرانسس اپنے حریف وارن ہیسٹنگز سے جنگی (ڈیول) میں زخمی ہو کر انگلستان نہ چلا گیا جہاں اس نے اس کے خلاف اپنے اثر و رسوخ کو اچھی طرح سے استعمال کیا۔ حکومت انگلستان کی جانب سے قانون تنظیم کے نافذ کرنے کے سلسلے میں گورنر جنرل اور ارکان کونسل کو جو

ہدایتیں بھیجی گئی تھیں ان میں خاص طور پر اس پر زور دیا گیا تھا کہ وہ آپس میں مل کر انتہائی ہم آہنگی کے ساتھ کام کریں گے۔ گورنر جنرل اور ارکان کونسل کو اس کی بھی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جن امور کی چاہیں تحقیق کر سکتے ہیں تاکہ ان کی روک تھام کی مناسب تدبیریں اختیار کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ فرانسس، کلیورنگ اور مانسن نے وارن ہیسٹنگز سے وہ کاغذات طلب کئے جو کمپنی اور نواب اودھ سے خط و کتابت کے سلسلے میں وصول ہوئے تھے تاکہ جنگ رہیلہ اور اس سے متعلق دوسرے معاملات کی چھان بین کی جائے۔ وارن ہیسٹنگز نے کاغذات حوالے کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ کونسل نے کثرت رائے سے وارن ہیسٹنگز کو حکومت کے اختیارات سے محروم کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے فوراً مسٹر مڈل ٹن کو جو اودھ میں کمپنی کی حکومت کا نمایندہ تھا واپس بلا لیا اور اس کی جگہ مسٹر برسٹو کو اس عہدہ پر مقرر کر دیا۔[1] انھوں نے تحکمانہ طور پر اودھ کی امدادی فوج کے کمانڈر کو حکم دیا کہ انگریزی فوج کا جو دستہ اودھ میں ہے اُسے ابھی بنگال واپس لے آئے اور نواب اودھ سے امدادی فوج کے سلسلہ میں جو رقم واجب الادا ہے اس کا فوری مطالبہ کرے۔ رقم کی ادائی کے لئے دو ہفتے کی میعاد مقرر کر دی گئی۔ بنارس کے معاہدہ کی رُو سے وارن ہیسٹنگز نے کڑہ اور الہ آباد کے ضلعے نواب اودھ کو دیدیئے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں واپس لے لئے گئے۔

اسی دوران میں نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا تو وہ سب معاہدے جو کمپنی اور نواب اودھ کے درمیان اب تک ہوئے تھے منسوخ قرار دیئے گئے۔ یہ کارروائی اُس انداز سے کی گئی کہ وارن ہیسٹنگز کی بے بسی اور بے اختیاری کا تمام ہندوستان میں اعلان ہو جائے۔ نئے نواب آصف الدولہ سے الگ معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے امدادی فوج کے اخراجات

---

[1] Gleig, Memoirs of Warren Hastings. جلد I. صفحہ 474

کے ضمن میں جو رقم کمپنی لیا کرتی تھی اس میں اور اضافہ کر دیا گیا۔ شجاع الدولہ نے دو کروڑ کے لگ بھگ روپیہ چھوڑا تھا جو اس کے محل کے تہ خانوں میں دفن تھا۔ کونسل نے لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ کو ہدایت کی کہ ان خزانوں کا تین چوتھائی شجاع الدولہ کی بیوہ بہو بیگم کو وصیت نامہ کی رو سے ملنا چاہیئے۔ اس وقت آصف الدولہ کی فوج کی تنخواہیں کئی مہینے سے ادا نہیں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے سپاہیوں نے بغاوت کر دی لیکن کمپنی کی فوج کے سبب سے اودھ عام بغاوت سے بچ گیا۔ آصف الدولہ نے ہر چند کونسل کے سامنے اپنے معاملہ کی نمایندگی کرائی کہ نواب شجاع الدولہ کا خزانہ دراصل ریاست کا خزانہ ہے اور سب سے پہلے سپاہ کی تنخواہوں کی ادائی اس سے ہونا چاہیئے لیکن کونسل نے ان میں سے ایک بات بھی نہ مانی۔ اس طرح اودھ کی بیگمات کے قضیہ کی بنا پڑی جس کی ذمہ داری بعد میں وارن ہیسٹنگز کے طریق کار پر عاید کی گئی۔

نظم و نسق کی خرابیوں کی چھان بین کے سلسلے میں وارن ہیسٹنگز کے ذاتی معاملات بھی بحث میں آئے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ وارن ہیسٹنگز کے اختیارات بڑی حد تک چھینے جا چکے ہیں تو انھوں نے بے خوف ہو کر ارکان کونسل کو شہادتیں بہم پہنچانے میں دریغ نہ کیا۔ سب سے پہلے رانی بردوان کا ایک خط کونسل کے سامنے پیش کیا گیا جس میں وارن ہیسٹنگز پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے رانی سے رشوت قبول کی۔ اس کے بعد نند کمار کا معاملہ پیش ہوا۔ نند کمار ایک برہمن تھا جو ایک زمانہ میں دربار مرشد آباد میں خاص اثر رکھتا تھا

نند کمار کا مقدمہ

نند کمار نے کئی خطوں میں ارکان کونسل کو وارن ہیسٹنگز کے رشوت لینے اور غبن کے حالات لکھے اور درخواست کی کہ اگر موقع دیا جائے تو وہ دوسرے واقعات کونسل کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہے۔ دو مرتبہ ارکان کونسل نے کثرت رائے سے فیصلہ کیا کہ نند کمار کو موقع دینا چاہیئے کہ وہ اپنا بیان آکر دے لیکن ہر مرتبہ وارن ہیسٹنگز نے صدر کی حیثیت سے کونسل کو برخاست کر دیا اور وہ اور اس کے ساتھ بارول کونسل سے اٹھ کر

چلے گئے۔ اس نے کہا کہ کمپنی کی حکومت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے ایسے اجلاس کی صدارت میرے شان شایاں نہیں جس میں مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہو لیکن تیسری مرتبہ جب یہی صورت پیش آئی اور وارن ہیسٹنگز اور بارول اٹھ کر چلے گئے تو کلیورنگ صدر بن گیا اور کونسل کے روبرو نند کمار نے اپنا بیان دیا۔ اس نے ایک فارسی زبان میں لکھا ہوا خط بھی کونسل کے سامنے پیش کیا جو میر جعفر کی بیوہ منی بیگم نے وارن ہیسٹنگز کو لکھا تھا جس سے ساڑھے تین لاکھ روپے رشوت لینا ثابت ہوتا تھا۔ کونسل نے وارن ہیسٹنگز کو حکم دیا کہ یہ رقم جو اس نے ناجائز طور پر وصول کی ہے سرکاری خزانہ میں ابھی داخل کرے۔ بعد میں جب وارن ہیسٹنگز نے مواخذہ کے وقت تمام الزاموں کی صفائی پیش کی تو اس نے تسلیم کیا کہ اس نے منی بیگم سے ڈیڑھ لاکھ روپے تحفہ کے طور پر لئے تھے۔ اس نے اپنی صفائی میں کلائیو اور ورسٹ کی مثال پیش کی کہ ان دونوں نے بھی جب وہ مرشد آباد گئے تھے تو ۲۲۵ پونڈ روزانہ کے حساب سے نواب سے الاونس وصول کیا تھا۔ لیکن چونکہ کلائیو اور ورسٹ نے یہ رقم وصول کی تھی اس لئے اس کو حق بجانب تو نہیں کہا جا سکتا۔ سر جیمس اسٹیفن ہنگ نے جو وارن ہیسٹنگز کا مداح ہے اور اس کو مختلف الزاموں سے بری خیال کرتا ہے اس قسم کے الاونس کی وصولی کو ناروا ٹھہرایا ہے۔[1]

وارن ہیسٹنگز اور بارول نے نند کمار کے الزاموں سے تنگ آکر سازش کی علت میں اس پر عدالت عالیہ میں نالش کر دی۔ ججوں نے نند کمار کو حوالات سے ضمانت پر چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں جب یہ مقدمہ چل رہا تھا ایک شخص موہن پرشاد نامی نے نند کمار پر جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ بارہ گھنٹے کی سماعت کے بعد عدالت عالیہ نے متفقہ طور پر نند کمار کو مجرم قرار دے کر پھانسی کا حکم صادر کر دیا اس لئے کہ اس زمانہ میں انگلستان کے قانون میں جعل سازی کی یہی سزا تھی۔ چنانچہ نند کمار کو پھانسی دیدی گئی اور اسی طرح وارن ہیسٹنگز کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا نکل گیا۔ فرانسس اور اس کے ساتھیوں نے وارن ہیسٹنگز پر الزام لگایا کہ اس نے

---

[1] Stphen: Nuncomar and Impey, I, p. 72

قانون کی آڑ لے کر نند کمار کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا تاکہ اس کے خلاف شہادت نہ مل سکے۔ برک نے اپنی پارلیمنٹ کی تقریروں میں صاف صاف کہا کہ نند کمار کو جو پھانسی دی گئی وہ قطعی طور پر وارن ہیسٹنگز کے ایما پر دی گئی ہے تاکہ اس کے خلاف شہادت کی تکمیل نہ ہو سکے۔ ممکن ہے کہ اس الزام کا ایسا ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکے جسے قانون تسلیم کرے۔ لیکن اس میں تو شبہ کی مطلق گنجایش نہیں ہے کہ جو سزا تجویز کی گئی وہ قطعاً غیر منصفانہ تھی۔ نند کمار کوئی معمولی شخص نہ تھا بلکہ اس زمانہ کے بنگال کے ذی وجاہت لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ پھانسی کی سزا کو کچھ مدت کے لیے ملتوی نہیں کیا گیا تاکہ اس اہم معاملہ میں حکومت انگلستان کو رجوع کیا جا سکے۔ خود اسٹیفن کا خیال ہے کہ جو سزا تجویز کی گئی وہ ناواجب تھی۔ زیادہ سے زیادہ چند ماہ کی قید اور جرمانہ کافی سزا ہوتی[1] خود عدالت عالیہ بھی اپنے چارٹر کی رو سے اس کی مجاز تھی کہ ایسے حالات میں جب کہ قانون کے عاید کرنے سے کسی کی جان جاتی ہو اور معاملہ کی نوعیت ایسی ہو کہ اس موقع پر رحم و کرم زیادہ مناسب ہو تو وہ اپنے اختیار تمیزی سے معاف کر سکتی یا سزا میں تخفیف کر سکتی تھی۔ اس مقدمہ سے قبل خود وارن ہیسٹنگز نے اپنے ایک مراسلہ میں جو انگلستان بھیجا گیا تھا لکھا تھا کہ اہل ہند کو ایسی سزا میں دینا جن کا وہ جرم کی سنگینی سے تعلق قایم نہیں کر سکتے سخت بے انصافی ہوگی[2] چونکہ نند کمار نے وارن ہیسٹنگز پر الزام لگایا تھا اس لیے یہ فطری امر تھا کہ اس زمانہ میں عام طور پر اہل ہند نے نند کمار کے پھانسی دیے جانے کو وارن ہیسٹنگز کی دشمنی کے ساتھ منسوب کیا[3] یہ امر خود مشتبہ تھا کہ آیا عدالت عالیہ کمپنی کے ملازمین کے علاوہ ہندوستانیوں کو سزا دینے کی مجاز بھی تھی یا نہیں۔ ایسی حالت میں جو سزا دی گئی وہ کبھی قرین انصاف نہیں کہی جا سکتی۔

[1] Stephen: Nuncomar and Impey, I, p. 72.

[2] Monckton Jones, Warren Hastings, p. 158.

[3] Cambridge History of India, V, p. [illegible]

نند کمار کے پھانسی پا جانے کے بعد کلیورنگ کو نند کمار کی وہ عرضداشت ملی جس میں اس نے صاف صاف لکھا تھا کہ اس کو وارن ہیسٹنگز اور ججوں کی سازش کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ فرانسس چاہتا تھا کہ اس دستاویز کو وارن ہیسٹنگز کے خلاف استعمال کرے لیکن اس نے سوچا کہ چونکہ عدالت عالیہ وارن ہیسٹنگز کی حمایت کرے گی اس لیے بہتر ہے کہ اس دستاویز کو تلف کر دیا جائے۔ کونسل میں وارن ہیسٹنگز سے نوک جھوک برابر ہوتی رہی۔ ستمبر ۱۷۷۶ء میں مانسن کے انتقال پر وارن ہیسٹنگز نے اپنی فیصلہ کن رائے کے ذریعہ اکثریت کو غیر موثر بنا دیا۔ اگلے سال جب کلیورنگ کا بھی انتقال ہو گیا تو وہ کونسل پر چھا گیا۔ کلیورنگ کی جگہ سر آئر کوٹ کے کمانڈر ان چیف کے عہدہ اور کونسل کی رکنیت پر آنے سے ہیسٹنگز کے مخالفوں کا زور ٹوٹ گیا اس واسطے کہ نیا کمانڈر ان چیف ہیسٹنگز کا حامی تھا۔ باوجود اس کے کہ وارن ہیسٹنگز نے اب اپنے کھوئے ہوئے اختیارات حاصل کر لئے تھے لیکن فرانسس اب بھی وقت بے وقت کونسل میں مخالفت کرتا رہتا تھا۔ آخر کار ہیسٹنگز اور فرانسس میں مقابلہ (ڈیول) تک نوبت آئی جس میں فرانسس اپنے حریف کے پستول سے زخمی ہوا اور وہ انگلستان روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے ہیسٹنگز کی لبرل جماعت کے ذریعہ خوب چھیچھاڑ کی اور وہ تمام واقعات ایک ایک کر کے اخباروں میں شائع کرائے جن کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزی حکومت سے لوگ ڈرنے لگے تھے۔

مرہٹوں کی پہلی جنگ

نومبر ۱۷۷۲ء میں پیشوا مادھو راؤ کا انتقال ہوا تو چونکہ وہ لاولد تھا اس لئے اس کے چھوٹے بھائی نارائن راؤ کو پیشوائی کی گدی ملی۔ اس کی عمر اس وقت صرف ۱۷ سال تھی۔ نو مہینے کی حکومت کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ عام طور پر مرہٹوں کا خیال تھا کہ یہ قتل مادھو راؤ کے چچا رگھوناتھ راؤ اور اس کے ساتھیوں کی سازش سے ہوا تھا۔ رگھوناتھ راؤ جو عام طور پر رگھوبا کے نام سے مشہور ہے پیشوا باجی راؤ دوم کا بھائی اور پیشوا مادھو راؤ کا چچا تھا۔ وہ بڑا سازشی اور اقتدار پسند تھا۔ ۱۷۷۳ء میں پونا کی خالی گدی پر رگھوناتھ راؤ قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مرہٹہ سرداروں

میں اپنا اثر بڑھانے کی غرض سے نواب میر نظام علیخاں سے لڑائی چھیڑ دی۔ لیکن دربار پونا میں نانا فرنویس نے اس کے خلاف زبردست اتحاد قایم کرلیا تھا۔ اس اثنا میں متوفی پیشوا نارائن راؤ کی بیوہ کے ایک بچہ ہوا جس کی پیشوائی کو نانا فرنویس اور اس کے ساتھیوں نے تسلیم کرکے ایک مجلس تولیت قایم کرلی تاکہ وہ نظم ونسق کی دیکھ بھال کرے۔ بچے کا نام مادھو راؤ دوم رکھا گیا۔ رگھوناتھ راؤ نے مجلس تولیت کی فوج کو شکست دے کر دوسرے مرہٹہ سرداروں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش شروع کردی۔ چنانچہ سندھیا، ہلکر اور گیکواڑ کو اپنا حامی بنانے کے لئے وہ مالوہ اور گجرات کی طرف روانہ ہوگیا۔ رگھوناتھ راؤ نے بمبئی کی انگریزی حکومت سے بھی نامہ وپیام شروع کردیا اور فوجی امداد کے معاوضہ میں بہت سا روپیہ اور علاقہ دینے کا وعدہ کیا اسے علم تھا کہ بمبئی کے علاقے میں جزیرہ سالسیٹ اور بندرگاہ باسین پر بہت دنوں سے حکومت بمبئی کی للچائی ہوئی نظریں پڑ رہی تھیں۔

گفت وشنید کے بعد معاہدہ سورت پر حکومت بمبئی اور رگھوناتھ راؤ کی طرف سے دستخط ہوگئے جس کے مطابق یہ طے ہوا کہ حکومت بمبئی رگھوناتھ راؤ کو نومولود پیشوا مادھو راؤ دوم کا ولی مان لینے کو آمادہ ہے بشرطیکہ وہ جزیرۂ سالسٹ اور بندرگاہ باسین انگریزوں کے حوالے کرے اور اٹھارہ لاکھ روپے نقد ادا کرے۔ حکومت بمبئی نے اس کی امداد کے لیے تین ہزار فوج فوراً بھیجنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ سالسٹ اور باسین پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور رگھوناتھ راؤ کی مدد کے لیے کرنل کیٹنگ کی سربراہی میں انگریزی فوج روانہ ہوگئی جس نے آرا اس کے مقام پر دربار پونا کی فوج کو شکست دی۔ گیکواڑ نے رگھوبا کی اس موقع پر مدد کی جب کہ اس کی فوجیں بھاگ کر نربدا پار چلی گئیں۔ ادھر انگریزی بیڑے نے بھی دربار پونا کے بیڑے کو سمندر میں شکست دی۔ غرضکہ خشکی پر اور سمندر میں دونوں جگہ حکومت بمبئی کے منصوبے امید سے بڑھ کر کامیاب رہے۔

وارن ہیسٹنگز معاہدہ کا مویّد نہ تھا لیکن چونکہ حکومت بمبئی جنگ شروع کرچکی تھی اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کامیابی کے ساتھ اس کو تکمیل کو پہنچائے۔ کلکتہ کونسل نے

معاہدۂ سورت کی سخت مخالفت کی تھی اس لیے کہ وہ کونسل کی منظوری کے بغیر کیا گیا تھا۔ قانون تنظیم کے بموجب حکومت بمبئی کے لیے لازم تھا کہ وہ اس کی نسبت گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے استصواب کرتی۔ کونسل نے دربار پونا کے خلاف جنگ کو ناجائز قرار دیا اور کرنل اپٹن کو اپنے نمایندہ کے طور پر براہ راست پونا بھیج دیا تاکہ وہ نانا فرنویس اور اس کے شرکاء سے دوسرا معاہدہ کرلے اور معاہدۂ سورت سے کلکتہ کی حکومت کی بے تعلقی کا اظہار کردے۔ حکومت بمبئی کی اس طرح بڑی توہین ہوئی اور وہ مرہٹوں کی نظر میں بے وقار ہوگئی۔ کرنل اپٹن نے ۱۷۷۶ء میں دربار پونا سے ایک علحدہ معاہدہ طے کرلیا جو صلحنامہ پورندھر کہلاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے ہوا کہ کمپنی نے مرہٹوں کے جو علاقے حاصل کرلیے ہیں سوائے سالسٹ کے وہ سب واپس کیے جائیں گے۔ جنگ کے اخراجات کے سلسلہ میں دربار پونا ۱۲ لاکھ روپئے ادا کرے گا۔ رگھوبا کی فوج برطرف کردی جائے گی اور وہ خود دریائے گوداوری کے کنارہ کسی موزوں مقام پر جاکر سکونت اختیار کرے گا۔

معاہدۂ پورندھر پر دستخط ہونے کے چار ماہ بعد مجلس نظماء کا مراسلہ حکومت بمبئی کو وصول ہوا جس میں معاہدۂ سورت کی پوری تائید کی گئی تھی۔ اس مراسلہ سے اس ذلت کی تلافی ہوئی جو کلکتہ کونسل کے ہاتھوں حکومت بمبئی کو اٹھانی پڑی تھی۔ اسی دوران میں پونا میں سینٹ لیوبان نامی ایک فرانسیسی نے نانا فرنویس پر بہت اثر قایم کرلیا۔ اس نے نانا فرنویس کو یقین دلایا کہ جلد فرانس اور انگلستان میں یورپ میں لڑائی چھڑنے والی ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ کافی تعداد میں فرانسیسی فوج بندرگاہ چول پر اتارنے کا انتظام کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی افسر دس ہزار دیسی فوج کو تربیت دے کر اس قابل کردیں گے کہ وہ بخوبی انگریزوں کا مقابلہ کرسکیں۔ نانا فرنویس سینٹ لیوبان کی مدد سے دربار پونا میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنا چاہتا تھا اس لیے کہ اس وقت سکھارام باپو اور دوسرے وزیر نانا فرنویس کے سخت مخالف ہوگئے تھے۔ سینٹ لیوبان کی پونا میں موجودگی سے کلکتہ کی حکومت نانا فرنویس کے ارادوں کی نسبت شبہ کرنے لگی۔

حکومت بمبئی نے پیشوا مادھوراؤ دوم کا ولی رگھوناتھ راؤ کو مقرر کر دیا اور اس کو بمبئی میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ حکومت بمبئی نے چار ہزار سپاہیوں کی فوج کرنل ایجرٹن کی سرکردگی میں پونا روانہ کی تاکہ رگھوناتھ راؤ کو وہاں کا کرتا دھرتا مقرر کرے اور کمسن پیشوا اس کے قابو میں رہے۔ کرنل ایجرٹن نے فوج کی قیادت کرنل کرناک کے سپرد کر دی جس نے وڑگاؤں کے مقام پر شکست کھائی اور ہتھیار ڈال دیئے اور ایک اور معاہدہ پر دستخط کر دئے جس کے مطابق سالسٹ دوبارہ پونا کو واپس کر دیا جائے گا۔ رگھوناتھ راؤ کو جب معلوم ہوا کہ انگریز اس کو نانا فرنویس کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہیں تو اس نے بھاگ کر سندھیا کے پاس پناہ لی۔ اس معاہدہ سے انگریزوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔

اس دوران میں کلکتہ کونسل کے حالات میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ ہیسٹنگز اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ وہ شروع ہی سے اس تجویز کے موافق تھا کہ بمبئی کی حکومت کی مدد کرنی چاہیئے اور رگھوناتھ راؤ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ خاص کر سینٹ لیوبان کا دربار پونا میں انگریزوں کے خلاف سازش کرنا جب سے اس کو معلوم ہوا اس وقت سے وہ اور بھی زیادہ رگھوبا کی تائید پر ہو گیا تھا۔ اس نے جنرل گوڈارڈ کی سرکردگی میں بنگال سے ایک زبردست لشکر روانہ کیا تاکہ پونا میں فرانسیسیوں کے جوڑ توڑ کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ لشکر ایک ہزار میل سے زائد مسافت طے کرنے کے بعد برہانپور پہنچ گیا۔ یہاں گوڈارڈ کو وڑگاؤں کی شکست اور ذلت آمیز شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنے کی اطلاع ملی۔ ہیسٹنگز نے گوڈارڈ کو یہ ہدایتیں بھیجدی تھیں کہ وڑگاؤں کے معاہدہ کو کالعدم قرار دیا جائے اور پورندھر کے معاہدہ کی شرائط کے بموجب از سرنو دربار پونا سے گفت وشنید شروع کی جائے۔ رگھوناتھ راؤ بھی سندھیا کی مدد سے سورت میں آکر جنرل گوڈارڈ سے مل گیا۔ جنرل گوڈارڈ نے دربار پونا سے گفت وشنید کے دوران میں قطعی جواب مانگا تو نانا فرنویس نے صاف کہلا بھیجا کہ جب تک رگھوناتھ راؤ کو حوالہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔ ادھر اس نے نواب میر نظام علی خاں اور حیدر علی سے اتحاد کر لیا۔ جنرل گوڈارڈ نے گیکواڑ سے باہمی مدافعت کا

معاہدہ طے کرنے کے بعد لڑائی کی تیاری شروع کر دی۔ سندھیا اور ہلکر نانا فرنویس سے مل گئے۔ ان دونوں کی فوجیں گجرات کی طرف بڑھیں تو گوڈارڈ نے انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔

۱۷۸۰ء میں ہیسٹنگز نے ایک دوسرا لشکر میجر پوپہم کی سرکردگی میں گوالیار روانہ کیا تاکہ سندھیا دربار پونا کو چھوڑ کر اپنے صدر مقام کی حفاظت کے لیئے یہاں آنے پر مجبور ہو جائے۔ سر آئر کوٹ نے جو اس زمانے میں کمپنی کی افواج کا کمانڈر ان چیف تھا، قلعہ گوالیار کی تسخیر کو ناقابل عمل بتایا تھا۔ لیکن میجر پوپہم نے بڑی قابلیت سے گوالیار کے قلعہ کو فتح کر لیا۔ اس شاندار فتح سے انگریزی وقار بڑھ گیا۔ سندھیا ایسا بد دل ہوا کہ اس نے نانا فرنویس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور انگریزوں سے علیحدہ معاہدہ کر لیا جس کے بموجب اس نے وعدہ کیا کہ وہ بیچ میں پڑ کر انگریزوں اور دربار پونا میں مصالحت کرا دے گا اور جو شرائط طے ہونگی ان کی تکمیل کرانے میں اپنا اثر پوری طرح استعمال کرے گا۔ سندھیا کا وہ تمام علاقہ جو جمنا کے مغربی جانب تھا اس کو واپس کر دیا گیا۔ راجہ بھونسلا نے بھی نانا فرنویس کی امداد کے لیے جو فوج بھیجی تھی وہ واپس بلا لی۔ اب گوڈارڈ نے باسین پر فوجکشی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ نانا فرنویس نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ صلح کر لی جائے۔ اور خود ہیسٹنگز بھی حیدر علی کی یورش کی وجہ سے مصالحت چاہتا تھا۔ غرضکہ سندھیا کے توسط سے مئی ۱۷۸۲ء میں صلحنامہ سالبائی پر دستخط ہو گئے۔ یہ طے پایا کہ انگریزوں نے معاہدہ پورندھر کے بعد سے مرہٹوں کے جتنے علاقوں پر قبضہ کیا ہے وہ واپس کر دئے جائیں۔ رگھوناتھ راؤ کی ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار پنشن کر دی جائے اور انگریزی حکومت آئندہ اسے کسی قسم کی مدد نہ دے۔ سندھیا کی خدمات کے صلہ میں بروچ اس کے حوالہ کیا جائے۔ سالسٹ پر انگریزوں کا قبضہ برقرار رہے۔ دربار پونا نے گیکواڑ کے معاملات میں ہر طرح کی دخل دہی سے بچنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اگر حیدر علی اپنی کرناٹک کی تمام فتوحات کو واپس نہ کرے تو دربار پونا اس کو اپنا دشمن تصوّر کرے۔ معاہدہ سالبائی کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد

انگریزوں اور مرہٹوں میں آئندہ بیس سال تک صلح برقرار رہی اور اس دوران میں انگریزی اقتدار چپکے چپکے ہندوستان کے بیشتر حصے میں مستحکم ہوگیا مرہٹوں سے لڑائی کا سلسلہ سات سال تک قائم رہا جس کی وجہ سے کمپنی کے خزانہ پر بہت بار پڑا اور ہیسٹنگز کو اخراجات کی پابجائی کے لیے ایسی تدبیریں کرنی پڑیں جو کسی طرح بھی حق بجانب نہیں کہی جا سکتیں۔

میسور کی دوسری جنگ

۱۷۶۹ء میں معاہدۂ مدراس کی رُو سے حکومت مدراس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر حیدر علی کے ملک پر کسی دوسری قوت نے حملہ کیا تو وہ اس کی امداد کرے گی۔ لیکن جب مرہٹوں نے ۱۷۷۱ء میں حملہ کیا تو حیدر علی نے حکومت مدراس سے امداد کی درخواست کی اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس امداد کے معاوضہ میں وہ بارہ محل کا علاقہ انگریزی حکومت کے حوالہ کر دے گا۔ اور جو کچھ خرچ ہوگا اس کو برداشت کرنے کے علاوہ کچھ اور رقم بھی دے گا۔ لیکن حکومت مدراس نے نواب محمد علی کے کہنے میں آکر مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حیدر علی کو تنہا مرہٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بنگلور اور کولار کے اضلاع ان کے حوالہ کرنے پڑے اور تاوان جنگ بھی ادا کیا۔ حکومت مدراس کی اس وعدہ خلافی کو حیدر علی کبھی بھولا نہیں۔ اس نے اپنی فوجی تیاری مکمل کر لی اور اس انتظار میں رہا کہ مناسب موقع پر انگریزوں سے انتقام لے۔ چنانچہ جس وقت انگریزی حکومت دربار پونا سے الجھی ہوئی تھی اور ادھر یورپ میں انگریزوں کی فرانسیسیوں سے جنگ چھڑ گئی تھی حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ انگریزوں کے تعلقات اس زمانہ میں سرکار نظام سے بھی کشیدہ ہو گئے تھے اس لیے کہ حکومت مدراس نے ۱۷۷۹ء میں بسالت جنگ سے نواب میر نظام علیخاں کی اطلاع کے بغیر جو معاہدہ سرکار گنتور کے متعلق کیا تھا وہ نواب میر نظام علیخاں کو نہایت ناگوار گزرا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے سرکار گنتور حکومت مدراس کو منتقل کر دی گئی جسے دس سال کے لیے پٹہ پر نواب محمد علی والاجاہ کو دیدیا گیا۔ پھر حکومت مدراس نے ایک اور بڑی بھاری حماقت یہ کی کہ مسٹر ہالینڈ کو حیدر آباد روانہ کیا تاکہ

نواب میر نظام علی خاں کو آمادہ کیا جائے کہ سنہ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کے بموجب شمالی سرکار کی بابت حکومت مدراس نے جو سات لاکھ روپیہ سالانہ پیشکش ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے اس کے بقایے سے دستبردار ہو جائیں اس لیے کہ حکومت مدراس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ اس حماقت سے نواب میر نظام علی خاں سخت ناراض ہوئے۔ انہیں یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ پہلی جنگ مرہٹہ کے سلسلہ میں کلکتہ نے راجا ناگپور کو دربار پونا سے توڑنے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں برار کے بعض علاقے اس کو دلوانے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ ان حالات میں نواب میر نظام علی خاں نے انگریزی حکومت سے بدظن ہو کر بسالت جنگ کے یہاں کی برطرف شدہ فرانسیسی سپاہ کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا اور نانا فرنویس اور حیدر علی سے مل کر انگریزی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ غرضکہ یہ سب حالات حیدر علی کے موافق تھے کہ وہ حکومت مدراس کے خلاف جنگ شروع کر دے۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت کلکتہ اور حکومت بمبئی مرہٹوں کی جنگ میں ایسی پھنسی ہوئی ہیں کہ وہ حکومت مدراس کو زیادہ امداد نہ دے سکیں گی۔ اُدھر نانا فرنویس نے حیدر علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرے تو مرہٹے اپنے ان تمام مطالبات سے جو حکومت میسور پر ہیں دستبردار ہو جائیں گے اور انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر وہ اپنی شمالی سرحد دریائے کرشنا تک لے آئے۔

غرضکہ حیدر علی نے جولائی سنہ ۱۷۸۰ء میں کرناٹک پر زبردست لشکر سے حملہ کر دیا۔ اس نے کرنل بیلی اور منرو کی فوجوں کو شکست دے کر آرکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ حکومت مدراس نے اس کے مقابلے کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ گورنر مدراس نے صاف کہہ دیا کہ لڑائی لڑنے کے لیے خزانے میں روپیہ ہی نہیں۔ وارن ہیسٹنگز کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے کچھ پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ اگرچہ مرہٹوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا لیکن وارن ہیسٹنگز نے سر آئر کوٹ کمانڈر ان چیف کو فوج کے ساتھ فوراً سمندر کے راستہ سے روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں جزیرہ بوربن سے فرانسیسی حکومت نے حیدر علی

کی مدد کے لیے سامان جنگ روانہ کیا اور امیر البحر دے سفران نے انگریزی جنگی جہازوں کی مزاحمت پر بھی ڈھائی ہزار فرانسیسی فوج حیدر علی کی مدد کے لیے مشرقی ساحل پر اتار دی۔ حکومت مدراس کی مالی حالت اس زمانہ میں بہت خراب تھی اور ظاہر ہے کہ کلکتہ کی حکومت جو مرہٹوں کی جنگ کی وجہ سے خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا تھی زیادہ رقمی امداد نہیں بھیج سکتی تھی۔ ہیسٹنگز نے دوسری جنگ میسور کے اخراجات کی پابجائی کے لیے چار سال کے عرصے میں جب تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا دو کروڑ ۶ لاکھ روپیہ نقد یا سامان کی شکل میں بھیجے تھے۔ اس سے زیادہ مدد کرنا حکومت کلکتہ کے بس میں بھی نہ تھا۔ حکومت کلکتہ نے بارہا گورنر مدراس کو یہ توجہ دلائی کہ وہ نواب کرناٹک سے بھی کچھ نہ کچھ وصول کرے جس کے ملک کی حفاظت کے لیے حیدر علی سے ان بن ہوئی لیکن نواب کی آمدنی کا سوتا ہی خشک ہو چکا تھا۔ وہ انگریز ساہوکاروں کا مقروض تھا جنھیں اس نے اپنے ملک میں مالگزاری وصول کرنے کا حق دے دیا تھا۔

ان حالات میں لارڈ میکارٹنی نے جواب مدراس کا گورنر مقرر ہوا تھا نواب محمد علی والاجاہ کو مجبور کیا کہ وہ پانچ سال کے لیے کرناٹک کی مالگزاری وصول کرنے کا حق حکومت مدراس کو دیدے۔ مالگزاری کا $\frac{1}{6}$ حصہ نواب اور اس کے قرض خواہوں کو ادا کیا جائے گا۔[1] گورنر مدراس نے یہ دلیل پیش کی کہ چونکہ حیدر علی کے خلاف جو جنگ کی جارہی ہے اس کا مقصد نواب والاجاہ کے علاقوں کی حفاظت ہے اس لیے اسی کو خرچ کا بار بھی اٹھانا چاہیئے۔ اس کی صرف یہی ایک صورت ممکن ہے کہ وہ مالگزاری وصول کرنے کا حق آئندہ کم از کم پانچ سال کے لیے حکومت مدراس کے حوالے کرے۔ حکومت مدراس نے ایک خاص کمیٹی (کمیٹی آف اسائنڈ ریونیو) مقرر کی تاکہ وہ مالگزاری کی وصولی کی نگرانی کرے اور انتظامی اصلاحات نافذ کرے۔ نئے انتظام کی وجہ سے نواب کرناٹک کے علاقوں کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ ہو گئی۔

۱؎ - Cambridge History of India, Vol. V, p.

سرآئیر کوٹ کی صحت اتنی خراب ہو گئی کہ ۱۷۸۲ء میں وہ مجبور ہو کر بنگال واپس چلا گیا۔ حیدر علی کے بیٹے ٹیپو سلطان کو بسی کے گوڈلور پہنچنے کا انتظار تھا تاکہ دونوں مل کر انگریزوں کو مدراس سے بے دخل کردیں۔ لیکن بسی کے پہنچنے میں دیر ہوئی۔ اسی اثناء میں وارن ہیسٹنگز نے معاہدہ سالبائی کے ذریعے مرہٹوں سے صلح کر لی تھی اور بمبئی کے مغربی ساحل پر انگریزی بیڑے کا حیدر علی کے خلاف استعمال ممکن ہو گیا تھا۔ چنانچہ کرنل ہمبر اسٹن کے تحت ایک فوج حیدر علی کی مغربی سرحد پر حملہ کرنے کالی کٹ پر اتری۔ اس کے مقابلے کے لئے ٹیپو سلطان کرناٹک سے مالابار کی طرف چلا آیا۔ لیکن دسمبر ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کے انتقال کی وجہ سے اس کو پھر کرناٹک لوٹ جانا پڑا۔ حکومت بمبئی نے جو جنگی بیڑا بھیجا اس نے بنگلور پر قبضہ کر لیا اور انگریزی فوجیں کوئمبتور تک پہنچ گئیں۔ ہیسٹنگز نے ولندیزوں سے اس موقع پر مدد مانگی لیکن چونکہ اس زمانے میں حکومت انگلستان اور حکومت ہالینڈ کے سیاسی تعلقات کشیدہ تھے اس لئے ولندیزیوں نے مدد دینے سے انکار کیا۔ چونکہ یورپ میں انگلستان اور ہالینڈ میں جنگ شروع ہو گئی اس لئے بجائے اس کے کہ ولندیزیوں سے مدد ملے اور ان کی طرف سے حکومت کلکتہ کو دغدغہ پیدا ہو گیا۔

وارن ہیسٹنگز نے جس طرح ناگپور کے بھونسلا راجا کو مرہٹوں کے اتحاد سے الگ کر لیا تھا اسی طرح نواب میر نظام علی خاں کو حیدر علی سے الگ کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوا۔ اس نے سپریم کونسل سے یہ منظور کرا دیا کہ گنتور سرکار نواب میر نظام علیخاں کو واپس کر دی

جائے اور اس کے متعلق حکومت مدراس نے نواب محمد علی والاجاہ سے جو دس سال کا پٹہ کیا ہے اس کو منسوخ سمجھا جائے۔ گورنر مدراس سر ولیم رمبالڈ اور اس کی کونسل کے دو ارکان کو خدمت سے الگ کر دیا گیا اور باقی دو ارکان رکنیت سے علیحدہ کر دئے گئے۔ مجلس نظما نے بھی حکومت کلکتہ کے اس فیصلہ کی تائید کی۔ مجلس نظما کے فیصلہ سے نواب میر نظام علی خاں کو اطمینان ہوا اور انگریزوں کی موافقت میں ان کی حکمت عملی بدل گئی چونکہ آئندہ بھی کمپنی اور سرکار نظام میں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا اس لیے حکومت کلکتہ نے مسٹر ہالینڈ کی خدمات حکومت مدراس سے حاصل کریں اور اس کو اپنی جانب سے حیدرآباد میں وکیل (ریزیڈنٹ) مقرر کیا۔ اگر وارن ہیسٹنگز کا سا دانشمند اس وقت کلکتہ کی سپریم گورنمنٹ کا گورنر جنرل نہ ہوتا تو یقیناً سرکار نظام، مرہٹوں اور حیدر علی کے منشاء کے مطابق اپنی حکمت عملی کی تکمیل کرتی۔

حکومت مدراس اپنے دیوالیہ پن اور بدانتظامی سے ایسی پریشان ہوگئی تھی کہ اس نے ٹیپو سلطان سے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ مارچ ۱۷۸۴ء میں صلحنامہ منگلور پر دستخط ہوئے جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ دونوں فریق فتح کیے ہوئے علاقوں اور قیدیوں کو واپس کر دیں۔ دونوں جانب سے یہ محسوس کیا گیا کہ اپنے حریف کو بالکل زیر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن صلح کی درخواست میں حکومت مدراس نے وارن ہیسٹنگز کی مرضی کے خلاف جس طرح سے پہل کی اور انگریز وکیلوں کے ساتھ جو ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا اس سے انگریزوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا یا وارن ہیسٹنگز نے اس معاہدہ کو پسند نہیں کیا اور اس میں ایسی تبدیلی کرنی چاہی جس سے ظاہر ہو کہ انگریزوں کا پلہ بھاری رہا ہے لیکن وہ حکومت مدراس کو اس پر آمادہ نہ کر سکا۔ دوسری جنگ میسور کے بعد بھی حکومت مدراس کی بدانتظامیاں جاری رہیں۔ نواب محمد علی والاجاہ سے کرناٹک کی مالگزاری وصول کرنے کا حق اس نے جو حاصل کیا تھا اس سے بھی حالت کچھ سدھری نہیں۔ نواب والاجاہ نے کوشش

کر کے "مجلس نظماء" سے ۱۷۸۵ء میں اس انتظام کو منسوخ کرا دیا جس کی وجہ سے گورنر مدراس لارڈ میکارٹنی نے استعفیٰ دے دیا۔

راجا چیت سنگھ اور وارن ہیسٹنگز۔

وارن ہیسٹنگز کے لیے ۱۷۷۶ء سے ۱۷۸۱ء کے سال بڑی پریشانی کے تھے۔ مرہٹوں اور حیدر علی کے علاوہ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں سے جنگ جاری تھی۔ حکومت بنگال قرضدار ہو گئی تھی۔ لیکن ان تمام لڑائیوں کی کفالت اسی کے ذمہ تھی۔ ہیسٹنگز نے بڑھتے ہوئے مالی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ایسے ذریعے استعمال کیے جو اخلاقی اعتبار سے کسی طرح بھی حق بجانب نہیں کہے جا سکتے۔ چنانچہ راجا چیت سنگھ کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا وہ اسی نوعیت کا ہے۔ راجا چیت سنگھ بنارس کا راجا تھا جس نے کمپنی کی سند حاصل کر لی تھی جس کی رو سے راجا کمپنی کو سالانہ ۲۲ ½ لاکھ روپیہ بطور پیشکش ادا کیا کرتا تھا۔ ۱۷۷۸ء میں ہیسٹنگز نے راجا سے پیشکش کے علاوہ مزید پانچ لاکھ روپیہ کی رقم طلب کی۔ راجا نے چھ ماہ کی مہلت مانگی تو حکم بھیجا گیا کہ پانچ روز کے اندر رقم کی ادائی ہو جانی چاہیئے۔ ورنہ یہ تصور کیا جائے گا کہ اس نے حکم عدولی کی ہے۔ چنانچہ راجا نے بادلِ ناخواستہ رقم ادا کر دی۔ ۱۷۷۹ء میں پانچ لاکھ روپیہ پھر طلب کئے گئے۔ اور ۱۷۸۰ء میں پھر اسی قدر رقم کا مطالبہ کیا گیا اور کہا گیا کہ ایک باجگزار رئیس کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ جب کبھی اصل مالک کو ضرورت پڑے تو غیر معمولی مطالبات کی تعمیل کی جائے۔ راجا نے یہ عذر کیا کہ اس کے اور کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رُو سے وہ ساڑھے بائیس لاکھ روپیہ کے پیشکش کے علاوہ اور کسی مطالبہ کے ادا کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ۵ جولائی ۱۷۷۵ء چیت سنگھ اور کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اس کی صراحت کر دی گئی تھی کہ "مقررہ رقم کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس پر کسی قسم کا اور کوئی مطالبہ عاید نہ کرے گی چاہے وہ کسی صورت میں کیوں نہ ہو اور کوئی شخص اس کا مجاز نہ ہوگا کہ اس کے اختیارات میں دخل دے یا اس کے ملک کے امن میں

خلل ڈالے۔[1] پھر بھی اس نے دو لاکھ روپے کی رقم پیش کر دی جسے وارن ہیسٹنگز نے قبول کر لیا۔ لیکن باقی رقم کا مطالبہ باقی رہا۔ راجا کے وکیل نے کلکتہ جا کر ہیسٹنگز کو ہر چند سمجھایا کہ راجا کی مالی حالت قابل اطمینان نہیں ہے اس لیے مزید مطالبہ نہ کیا جائے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ رقم کے علاوہ ایک ہزار سپاہیوں کی بھرتی کا حکم کلکتہ سے بھیجا گیا۔ راجا نے ۵۰۰ سپاہی بھرتی کئے اور کہلا بھیجا کہ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وارن ہیسٹنگز کو بڑا غصہ آیا۔ وہ خود بنارس گیا اور پچاس لاکھ روپیہ کا مطالبہ پیش کیا۔ بنارس پہنچ کر راجا کو حراست میں لے لیا گیا اور اس کے محل کے چاروں طرف کمپنی کی فوج کے پہرے بٹھا دیے گئے اس پر رعایا میں بڑی برہمی پھیلی۔ بنارس کی عام آبادی کمپنی کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ چونکہ فوج کے پاس کافی سامان نہیں تھا اس لیے لوگوں نے جوش میں بہت سے سپاہیوں اور تین انگریز افسروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہیسٹنگز نے بھاگ کر تیس آدمیوں کے ساتھ چنار کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس گڑبڑ میں راجا چیت سنگھ بھی نکل بھاگا اور گوالیار میں سندھیا کے پاس جا چھپا۔ ہیسٹنگز نے میجر پوپھم کو بنارس پر فوج کشی کا حکم دیا۔ چنانچہ میجر موصوف نے راجا کے محل سے چالیس لاکھ نقد حاصل کیا۔ بنارس کی گدی پر راجا چیت سنگھ کا بھتیجا بٹھا دیا گیا جس نے پیشکش کی رقم میں مزید اضافہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ راجا چیت سنگھ پر ہیسٹنگز نے بڑی زیادتی کی جسے کسی طرح بھی حق بجانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اودھ کی بیگمات کا معاملہ

نواب آصف الدولہ والی اودھ کے ذمہ کمپنی کا ڈیڑھ کروڑ روپیہ بقایا انگریزی امدادی فوجوں کی

---

[1] Selections from the Letters, Despatches, and other state papers in the foreign. Dept. of the Govt., of India, 1772-1785 (ed. by G. W [illegible]rest), Vol. II. p. 402.

تنخواہوں کے ضمن میں نکلتا تھا۔ ہیسٹنگز جب چنار کے قلعہ میں تھا تو نواب اودھ نے خود اس کے پاس جاکر اس کو مطلع کیا کہ اس کا خزانہ بالکل خالی ہوگیا ہے اس لیے انگریزی فوج کی تنخواہوں کی کفالت ممکن نہ ہوسکے گی جب تک کوئی اور انتظام نہ کیا جائے۔ آصف الدولہ نے اشاروں اشاروں میں یہ بھی کہہ دیا کہ اس کی والدہ اور دادی کے پاس کئی کروڑ روپیہ موجود ہے جو شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد ان کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اگر اس خزانہ کو ضبط کرنے کی کوئی صورت ہوسکے تو کمپنی کے مطالبات کی ادائی ہوسکتی ہے۔ ہیسٹنگز کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ چیت سنگھ کی بغاوت میں بیگمات اودھ کی امداد شامل تھی۔ حالانکہ اس الزام کی کوئی اصلیت نہ تھی لیکن ہیسٹنگز کو سہولت اسی میں نظر آئی کہ جو کچھ بیگمات کے خلاف کہا جائے اسے وہ یقین کرے۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی بیوہ بہو بیگم نے انگریز ریزیڈنٹ کے توسط سے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ آصف الدولہ کو ۵۰ لاکھ روپیہ ادا کرے گی بشرطیکہ آئندہ اس سے کسی قسم کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ آصف الدولہ نے ہیسٹنگز کو اس پر آمادہ کرلیا کہ ۱۷۷۵ء کا معاہدہ ختم کرکے بیگمات کے خزانے ضبط کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ ہیسٹنگز کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی چنانچہ اس نے اجازت دے دی۔ انگریز افسروں کی مدد سے آصف الدولہ نے بڑی بے رحمی اور بے دردی سے خزانے چھین لئے جن میں سے ۵۶ لاکھ کی رقم کلکتہ بھیجی گئی۔ خود مجلس نظماء نے یہ تسلیم کیا کہ بیگمات نے چیت سنگھ کی کسی قسم سے نہ مدد کی اور نہ بغاوت پر اکسایا۔ اگر ہیسٹنگز کے پاس اس کے متعلق کوئی ثبوت موجود تھا تو اس کو چاہیئے تھا کہ بیگمات سے اس کی نسبت جواب طلب کرتا تاکہ ان کا نقطۂ نظر بھی اس کو معلوم ہوجاتا۔ لیکن ایسی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ انگریز افسروں کی ماتحتی میں بیگمات سے روپیہ وصول کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ انتہا درجہ سخت اور تہذیب سے گرے ہوئے تھے۔ خواجہ سراؤں کو سلاخیں گرم کرکے چرکے دیئے گئے اور دوسری اذیتیں پہنچائی گئیں اور

بیگمات کی نہایت بے باکی سے بے پردگی کی گئی۔ یہ کہنا کہ یہ طریق کار آصف الدولہ نے اختیار کیا درست نہیں ہے اس لیے کہ یہ سب کچھ انگریزی فوج کی مدد سے اور انگریز افسروں کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ بیگمات اور ان کے متعلقین کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی اس کی ذمہ داری براہ راست ہیسٹنگز پر اس لیے عاید ہوتی ہے کہ لکھنؤ میں جو انگریز رزیڈنٹ تھا وہ برابر گورنر جنرل سے خط و کتابت کے ذریعہ اس کی مرضی معلوم کرتا رہا۔ بلکہ اس زمانے کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریزیڈنٹ برسٹو نہیں چاہتا تھا کہ بیگمات کے ساتھ اتنی بدسلوکی کیجائے لیکن ہیسٹنگز کی تاکید پر وہ مجبور ہوا کہ ایسے سخت اور نازیبا طریق کار کی اجازت دے جو بعد میں اس ضمن میں روا رکھا گیا[1]۔ اصل بات یہ غور طلب ہے کہ آیا بیگمات کا اس جاگیر اور خزانہ پر کوئی حق تھا یا نہیں جو نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ذریعہ وصیت انھیں ملا۔ اگر ان کا کوئی حق نہ تھا تو چھ سال قبل حکومت کلکتہ نے ان کے حق کو کیوں صراحت سے تحریری طور پر تسلیم کیا تھا۔ ہیسٹنگز کا جب پارلیمنٹ میں مواخذہ کیا گیا تو راجا چیت سنگھ اور بیگمات اودھ کے متعلق جو اس نے زیادتیاں کیں ان کا کوئی معقول جواب اس کے پاس موجود نہ تھا۔

پٹ کا قانون ۱۷۸۴ء

۱۷۸۱ء میں پارلیمنٹ نے ہندوستان کے معاملات کی چھان بین کی غرض سے دو کمیٹیاں مقرر کیں۔ ایک مجلس منتخبہ (سلیکٹ کمیٹی) اور دوسری مجلس خفیہ (سیکریٹ کمیٹی)۔ مئی ۱۷۸۲ء میں ان دونوں کمیٹیوں نے رپورٹیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کردیں جن کی بنا پر پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ وارن ہیسٹنگز اور گورنر مدراس دونوں کو ان کے عہدوں سے الگ کردینا چاہیے لیکن کمپنی

---

[1] Selections from the Letters Despatches, etc, Vol. III, p. 969 (ed. by G. W. Forrest).

کی مجلس شرکا (کورٹ آف پروپرائٹرز) نے ہاؤس آف کامنز کے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس اثناء میں ۱۷۸۳ء میں راکنگھم کی وزارت کی جگہ لارڈ نارتھ اور مسٹر فاکس کی ملی جلی وزارت قائم ہوئی۔ چنانچہ فاکس نے کمپنی کے نظم و نسق کی اصلاح کی غرض سے پارلیمنٹ میں اپنے مسودات قانون پیش کئے جن کا مقصد کمپنی کے دستور میں بنیادی تبدیلی کرنا تھا۔ ان مسودات کی رو سے مجلس نظماء اور کمپنی کی مجلس شرکا دونوں کو ختم کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ چار سال کے لیے کمپنی کے تمام سیاسی اور فوجی امور کا انتظام سات کمشنروں کے بورڈ کے ذمہ کرنے کی سفارش کی گئی تھی جنھیں پہلے پہل تو پارلیمنٹ مقرر کرے گی۔ لیکن پھر تاج کی جانب سے ان کی نامزدگی اور کمپنی کی ملازمتوں میں تمام اہم تقررات تاج ہی کی جانب سے ہوا کریں گے۔ ان کمشنروں کے نو (۹) مددگار ہوں گے۔ جن کے ذمہ تجارتی امور ہوں گے اور جنھیں پارلیمنٹ مقرر کرے گی۔ لیکن بعد میں ان کی نامزدگی مجلس شرکاء کمپنی کی جانب سے ہوا کرے گی۔ فاکس نے ان مسودات کو پیش کرتے وقت وارن ہیسٹنگز پر سخت چوٹیں کیں اور کمپنی کے معاملات کی خرابی کا اس کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا "پارلیمنٹ اور مجلس نظماء کی کوششوں کے باوجود اہل ہند اس وقت ایک بے رحم اور بے باک شخص کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں آج صمیم قلب کے ساتھ اس شخص پر لعنت بھیجتا ہوں"[1]

فاکس کے قانونی مسودے ہاؤس آف کامنز میں باوجود پٹ کی سخت مخالفت کے منظور ہو گئے لیکن ہاؤس آف لارڈز میں انھیں رد کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں جارج سوم بادشاہ انگلستان نے نئے پارلیمانی انتخاب کے لئے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا نئے انتخاب میں وہگ پارٹی کو سخت شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور پٹ نے اپنی وزارت کی تشکیل دی آیندہ بیس سال تک حکومت انگلستان کی سیاسی حکمت عملی کی باگ ڈور پٹ کے ہاتھ میں رہی۔ برسر اقتدار آنے کے بعد ۱۷۸۴ء میں اس نے کمپنی کے

ـــــــــــــــــــــــــ

[1] Cambridge History of India, Vol. V, p. 196, p.

انتظام و دستور کے متعلق اپنا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا جو قانون پٹ کے نام سے مشہور ہے ۔ انگلستان کی سیاست کی ایک یہ انوکھی بات ہے کہ کوئی سیاسی جماعت اپنی بے اقتداری کے زمانے میں تو کسی خاص حکمت عملی کی مخالفت کرتی ہے لیکن وہی برسر اقتدار آکر کم و بیش اسی اصول عمل کی سب سے بڑی حامی بن جاتی ہے ۔ پٹ نے مخالف پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے فاکس کے ان مسودات کی سخت مخالفت کی تھی جو اس نے کمپنی کے دستور کی جدید تشکیل کے متعلق پیش کئے تھے لیکن اقتدار پانے کے بعد خود اس نے جو مسودات پیش کئے وہ بڑی حد تک فاکس کے پیش کردہ اصول عمل کے مشابہ تھے ۔ پٹ کے قانون کی رو سے حکومت کے مقرر کیے ہوئے چھ کمشنروں کے ایک بورڈ کی ماتحتی میں کمپنی کے تمام مالی فوجی اور ملکی امور کی انجام دہی کی نگرانی ہوگی ۔ یہ بورڈ آف کنٹرول کہلاتا ہے ۔ اس میں انگلستان کا وزیر مالیات (چانسلر آف دی اکس چکر) ایک وزیر مملکت (سکریٹری آف اسٹیٹ) اور چار ارکان پریوی کونسل شامل ہوں گے جنھیں تاج نامزد کرے گا اور ان کی مدت عہدہ کا انحصار اس کی خوشنودی پر منحصر ہوگا ۔ بورڈ آف کنٹرول کے ارکان اعزازی طور پر کام کریں گے اس کے جلسوں کی صدارت سکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کی غیر موجودگی میں وزیر مالیات کرے گا اور اگر وہ بھی موجود نہ ہو تو پریوی کونسل کے ارکان میں جو سینیر ہوگا اس کے ذمہ صدارت کے فرائض ہوں گے ۔ بورڈ کی ایک خفیہ کمیٹی ہوگی جو بورڈ کے خفیہ اور اہم احکام کو ہندوستان روانہ کیا کرے گی ۔ اس کمیٹی کے ارکان مجلس نظما میں سے مقرر کیے جائیں گے اگر مجلس نظما کی کسی تجویز کو بورڈ آف کنٹرول نے منظور کر لیا ہو تو اس کو کمپنی کی مجلس عمومی کا رد کرنے کی مجاز نہ ہوگی ۔ ہندوستانی مقبوضات کا نظم و نسق گورنر جنرل کے ذمہ کیا گیا جس کی کونسل کے ارکان کی تعداد بجائے چار کے تین کر دی گئی ۔ گورنر جنرل کو سیاسی اور انتظامی امور میں بمبئی اور مدراس کے دونوں احاطوں پر پورے اختیارات دئے گئے ۔ پٹ نے اپنے قانون کی رو سے حکومت انگلستان کی نگرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں

قایم کردی لیکن کمپنی کو ملکیت کے حقوق سے محروم نہیں کیا۔ اس نے کمپنی کے نظماء سے مشورہ کے بعد اپنا مسودہ تیار کیا تاکہ وہ اپنے وجود کو خطرہ میں نہ سمجھیں جس طرح فاکس کے مسودہ قانون کے پیش ہونے کے وقت وہ محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ دونوں پارٹیوں کی یہ غرض تھی کہ حکومت کی نگرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں موثر ہو جائے لیکن پٹ نے جس احتیاط اور دانشمندی سے اپنا مقصد حاصل کیا اس کا اعتراف پارلیمنٹ میں خود برک نے کیا [1]
اس قانون کی وجہ سے وہ خرابیاں جاتی رہیں جو قانون تنظیم کے نافذ ہونے کے بعد کمپنی کے نظم ونسق میں پیدا ہوگئی تھیں۔ اب وہ رکاوٹیں دور ہوگئیں جن کی وجہ سے ہیسٹنگز اور اس کی کونسل اور ماتحت احاطوں اور مرکز میں اکثر تضادم ہوا کرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا حکومت برطانیہ سے براہ راست تعلق قایم ہوگیا اور اس کے معاملات کی جوابدہی بھی پارلیمنٹ کے سامنے ہونے لگی۔ آئندہ ۵۰ سال تک یہی انتظام قایم رہا جو پٹ کے قانون کے نافذ ہونے کے بعد ہندوستان میں رائج ہوا تھا جب کہ ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ سے وابستہ ہوگیا۔

قانون پٹ کے منظور ہونے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے محسوس کیا کہ نئی وزارت متوقع ہے کہ وہ استعفیٰ دے کر اپنی خدمت سے الگ ہو جائے مسٹر پٹ نے اپنا مسودہ پیش کرتے وقت جو تقریر کی اس میں کمپنی کی بد انتظامیوں کا نقشہ کھینچا تھا جن کی اصلاح اس کی تجویزوں سے ہو سکتی تھی ہیسٹنگز سمجھتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام حکومت پر جو نکتہ چینی کی گئی وہ دراصل اس کی ذات پر حملہ ہے [2]۔ حالانکہ پٹ اس کا مخالف نہ تھا۔ ہیسٹنگز فروری ۱۷۸۵ء میں کلکتہ سے انگلستان روانہ ہوگیا۔ اس نے حکومت کا جائزہ سر جان میکفرسن کو دے دیا جو کونسل کا سینیر ممبر تھا تاکہ

[1] Cambridge History of India, Vol. V, p. 202

[2] Gleig, Memoirs of W. Hastings, II, p. 224-26.

نئے گورنر جنرل کے آنے تک وہ اس عہدہ کے فرائض ادا کرے۔

ہیسٹنگز کے انگلستان پہنچنے پر اس کے مخالفوں نے پارلیمنٹ میں اس کے مواخذہ کی تجویز پیش کی۔ برک نے اپنی جادو بیانی سے اپنے بہت سے مخالفوں تک کو رام کر لیا اور پارلیمنٹ کی اکثریت نے اس کی تائید کی۔ چنانچہ پٹ اور ڈنڈس جو اس کے موافق تھے مجبور ہو گئے کہ چیت سنگھ اور بیگمات اودھ والی تجویزوں میں برک کے ساتھ رائے دیں۔ ہاؤس آف کامنز نے ۱۹ ارکان کی کمیٹی مقرر کر دی تاکہ ہیسٹنگز کے خلاف ہاؤس آف لارڈز میں مواخذہ کی کارروائی کرے۔ یہ مقدمہ سات سال تک چلتا رہا۔ ہیسٹنگز نے اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیے انگلستان کے بعض مشہور وکیلوں کی خدمات حاصل کیں اور تقریباً ایک لاکھ پونڈ کی پونجی جو وہ ہندوستان سے سمیٹ لے گیا تھا اس مقدمہ کی بھینٹ چڑھ گئی جب مواخذہ میں اسے بری قرار دیا گیا تو اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی خدمات کے اعتراف میں ۴ ہزار پونڈ سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ اس نے زندگی کے آخری ۲۴ سال اپنے گاؤں ڈیلسفورڈ میں عملی سیاسیات سے الگ تھلگ رہ کر گذارے۔

وارن ہیسٹنگز کے متعلق بعض مورخوں کی یہ رائے ہے کہ وہ بدی کا مجسمہ اور فریب کا پتلا تھا۔ چنانچہ میکالے اور مل اسی خیال کے ہیں۔ دوسروں کے نزدیک وہ بڑی قابلیت کا شخص تھا جس نے اخلاقی احساس کی کمی کی وجہ سے بعض وقت ایسی سخت غلطیاں کیں جن کی وجہ سے انگریز قوم کی ساکھ کو صدمہ پہنچا۔ لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجایش نہیں کہ وہ بڑا مدبر تھا۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ انگریز قوم امریکہ کی سلطنت کھو چکی تھی اس نے ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ اس نے الحاقی اصول کار پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف دیسی حکمرانوں کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔ اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کا کوئی حصہ سلطنت برطانیہ میں شامل نہیں کیا گیا لیکن اس نے اپنے حسن تدبیر سے کمپنی کے اثر و اقتدار

کو ہندوستان کے ہر دربار تک پہنچا دیا۔ وہ کام جسے بعد میں ولزلی نے وسیع پیمانہ پر انجام دیا اسی کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس نے کمپنی کی حکومت کو اس زمانہ کے ہندوستانی حکمرانوں میں سب سے زیادہ قوی اور زبردست بنا دیا۔

ساتواں باب

لارڈ کارنوالس اور سر جان شور کا عہد حکومت

لارڈ کارنوالس ۱۷۸۶ء تا ۱۷۹۳ء

وارن ہیسٹنگز کے انگلستان جانے کے بعد میکفرسن نے ایک سال دس مہینے تک گورنر جنرل کے فرائض ادا کیے اور اس عرصہ میں اس نے کمپنی کے نظم و نسق کے سالانہ اخراجات میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی بچت کی۔ جب مرہٹوں اور ٹیپو سلطان میں لڑائی چھڑ گئی تو میکفرسن نے صلحنامہ منگلور کے خلاف مرہٹوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا جس کی وجہ سے ٹیپو سلطان کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف اور زیادہ نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ انتقامی منصوبے سوچنے لگا۔

وارن ہیسٹنگز کے مستعفی ہونے کے بعد وزارت انگلستان نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ سے ہندوستان کے برطانوی مقبوضات پر حکومت کرنے کے لیے ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں سے تعلق نہ رکھتا ہو تاکہ وہ معاملات پر غیر جانبداری سے نظر ڈالے ورنہ یہ ڈر تھا کہ اگر کمپنی کے ملازموں میں سے اس عہدہ کے لیے کسی کو چنا گیا تو وہ اپنے پرانے تعلقات کی بنا پر برطانوی روایات کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نہیں برت سکیگا۔ پھر پیٹ کے قانون کی رو سے گورنر

جنرل کے اختیارات میں بہت کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ ۱۷۸۶ء میں اس قانون کی ترمیم کے بموجب گورنر جنرل کے عہدہ میں کمانڈر ان چیف کے عہدہ کو ضم کر کے گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی کونسل کی اکثریت کے خلاف فیصلہ کر سکے۔ ان حالات میں لورڈ آف کنٹرول کو گورنر جنرل کے عہدہ کے لیے ملک کے کسی ممتاز شخص کو بھیجنے کا خیال ہوا۔ لارڈ کارنوالس نے اگرچہ واشنگٹن کے ہاتھوں یارک ٹاؤن میں شکست کھائی تھی لیکن اس پر بھی ایک سپہ سالار اور مدبر کی حیثیت سے اس کی بڑی ساکھ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ ہفت سالہ میں اس نے جو خدمات انجام دی تھیں انھیں فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ امریکہ میں اس کی شکست ایسے حالات کا نتیجہ تھی جن پر کوئی سپہ سالار بھی قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس پر وزیر اعظم پٹ کو پورا بھروسا تھا۔ وہ ایک خاندانی افسر تھا اور اس کے تعلقات طبقۂ امراء میں بہت کافی وسیع تھے۔ اس کے تقرر کے متعلق مورخ مارشمین کی رائے ہے کہ "کارکنان قضا و قدر کی یہ ستم ظریفی دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ شخص ہندوستان کی حکومت کے لیے منتخب کیا گیا جس نے "یارک ٹاؤن" پر جنرل واشنگٹن کے سامنے برطانوی فوج سے ہتھیار رکھوا دیئے جس کے نتیجے میں امریکہ ہمیشہ کے لیے انگلستان کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس شخص پر جس نے انتہا سے زیادہ نازک موقعوں پر ہندوستان کو انگریز قوم کے ہاتھ سے نکل جانے سے بچا لیا تھا ہولناک جرموں اور بد کرداریوں کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔"[لہ]

انتظامی اصلاحات

کارنوالس کو اپنے پیشرو کے مقابلہ میں نظم ونسق کی اصلاح کے زیادہ مواقع حاصل تھے۔ وزارت انگلستان پر اس کا اثر تھا اور خود اس کی کونسل کے ارکان جانتے تھے کہ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو وہ اس کو چلنے نہ دے گا۔ اس لیے اب اس طرح ٹکرانے اور جھگڑنے کا کوئی ڈر نہ تھا جو وارن ہیسٹنگز

لہ Marshman, History of India, P 443

اور اس کے ارکان کونسل میں آئے دن پیش آتا رہتا تھا اور جس کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ کارنوالس نے اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے ابتدائی تین سال میں کمپنی کی ملازمت کی اصلاح کی کوشش کی۔ پٹ کے قانون کے مطابق کمپنی کے ملازموں پر لازم کیا گیا کہ وہ آئندہ سے تحفے لینے سے بچیں اور اس کی خلاف ورزی میں سخت سزا کے مستوجب قرار پائیں گے۔ کمپنی کے ہر ملازم کو حکام مجاز کے سامنے حلفیہ بیان کرنا ہوگا کہ اس نے ہندوستان میں کس قدر ملکیت حاصل کی ہے۔ کارنوالس نے پٹ کے قانون کی اس دفعہ کو عملی جامہ پہنایا۔ کمپنی کے ملازموں کے قواعد ملازمت کا تعین کیا گیا۔ ان کی تنخواہوں میں من مانا اضافہ کیا گیا تاکہ اگر وہ دیانت کے ساتھ اپنے فرض منصبی کو بجا لائیں تو مفلس نہ رہیں اور رشوت کا لالچ ان کے پاس نہ پھٹک سکے۔ اس نے مجلس نظماء پر یہ بات واضح کی کہ جن لوگوں کو بڑی ذمہ داری اور بھروسے کے عہدے سپرد کیے جاتے ہیں انھیں ان کے عہدوں کی مناسبت سے تنخواہ زیادہ دیا جانا ضروری ہے تاکہ وہ ناجائز طور سے اپنے اثر اور رسوخ کو استعمال نہ کریں۔ مجلس نظماء نے اس اصول کو تسلیم کر لیا جس کی وجہ سے ملازمت کا حلقہ بہت کچھ کثافت سے صاف ہو گیا۔ مجلس نظماء کے ارکان اور انگلستان کے دوسرے بااثر اشخاص کی سعی و سفارش سے اپنے ایسے عزیزوں کو جو کوئی خاص امتیاز یا قابلیت نہیں رکھتے تھے کمپنی کی ملازمت میں داخل کرا دیا کرتے تھے۔ کارنوالس نے اس کی سخت مخالفت کی اور ایک دفعہ تو اس نے شہزادۂ ولیعہد کی سفارش تک کو نہ مانا۔ اس نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں کا اہل نہ سمجھا۔ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ داروغہ پولیس اور منصف عدالت کے عہدے تھے جن تک وہ پہنچ سکتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ عہدوں پر انگریز رہیں اور ان کے تحت ادنیٰ عہدوں پر ہندوستانی کام کریں۔ حالانکہ مقامی زبانوں اور عام حالات سے واقفیت کی بنا پر ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کے لیے ہر طرح موزوں تھے۔ کارنوالس

نے ہندوستانیوں کے لیے باعزت عہدوں کا دروازہ بند کردیا۔

دیوانی اور فوجداری عدالتوں کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ کلکٹر اور بعض سول جج کے فرائض سے الگ کردیے گئے۔ بورڈ آف ریونیو اور اضلاع کے کلکٹروں کے عدالتی اختیارات چھین لیے گئے۔ ہر ضلع میں دیوانی عدالتیں قائم کی گئیں جن پر انگریز ججوں کا تقرر کیا گیا جن کی مدد کے لیے ہندوستانی افسر ہوتے تھے تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قانون کی وضاحت کریں۔ ان عدالتوں کے حدود سماعت تمام ہندوستانیوں پر حاوی تھے اور برطانوی رعایا کے مقدمات کی سماعت عدالت العالیہ (سپریم کورٹ) میں ہوتی تھی۔ چار اپیل کی عدالتیں کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور پٹنہ میں قائم کی گئیں جن کے فیصلوں کے خلاف کلکتہ کی صدر عدالت میں مرافعہ کیا جا سکتا تھا جس کے رکن گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ارکان ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ چار عدالتیں مقرر کی گئیں جن میں سے ہر ایک پر کمپنی کے دو ملازم متعہد نگرانی کے لیے مقرر تھے جو سال میں دو مرتبہ دورہ کرتے تھے تاکہ ایسے فوجداری معاملات کی تحقیقات کریں جو دورے کے وقت کے لیے مخصوص کردیے گئے ہوں اور اس طرح انھیں براہ راست رعایا سے ربط قائم کرنے کا موقع ملے اور دادرسانی میں سہولت ہو۔ مقامی ججوں کو مجسٹریٹ کی حیثیت سے معمولی نوعیت کے مقدمات کی سماعت کا حق تھا۔ لیکن سنگین مقدمات کی سماعت عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں ہوتی تھی۔ ہر ضلع کو تحصیلوں میں تقسیم کردیا گیا اور ہر تحصیل میں ایک داروغہ مقرر کیا گیا جس کو اختیار تھا کہ ملزموں کو حکمنامہ گرفتاری پر یا بلا حکمنامہ گرفتار کرلے اور ان سے حاضری عدالت کا مچلکہ یا ضمانت لے سکے۔ سر ایلجا امپی نے قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا کارنوالس نے اسی مجموعہ کو دوبارہ ایک ضابطہ کی صورت میں تدوین کرایا جو کارنوالس کوڈ کہلاتا ہے۔ فارسی اور بنگالی زبان میں اس ضابطہ کے ترجمے کرائے گئے تاکہ اہل ملک کو اس سے واقفیت ہو۔ اس میں رعایا کے جان، مال اور حقوق کی حفاظت کے متعلق صراحت کی گئی تھی۔ اس ضابطہ میں وہ طریقے بھی بتا دیے گئے تھے جن کی

بنا بر ہر ذیلی عدالت سے اعلیٰ تر عدالت تک مرافعہ ہو سکتا تھا اور اگر ضرورت ہو تو گورنر جنرل باجلاس کونسل سے بھی دادرسی ہو سکتی تھی جس کے فیصلے عدل گستری کے تمام معاملات نیز ملکی انتظام سے متعلق قطعی ہوتے تھے سوائے ان دیوانی مقدمات کے جن میں پچاس ہزار روپے یا پانچ ہزار آٹھ سو پونڈ سے زیادہ ڈگری کی گئی ہو۔ ایسے مقدمات کے مرافعے ملک معظم بہ اجلاس کونسل میں ہوتے تھے لیکن عدالت کی کارروائی کا جو طریقہ اس ضابطہ میں پیش کیا گیا وہ ہندوستانیوں کے لیے نہایت پیچیدہ تھا جس سے معمولی سوجھ بوجھ کا شہری الجھن میں پڑ جاتا تھا۔[1] انصاف رسانی میں تاخیر ہوتی تھی جس کی وجہ سے ضابطہ کا اصلی مقصد بڑی حد تک فوت ہو جاتا تھا۔ اصولی طور پر ضابطہ کے نافذ ہونے سے رعایا زمینداروں اور احکام کے خلاف اور زمیندار مالگزاری جمع کرنے والوں کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کر سکتے تھے لیکن مقدمات کے فیصلوں میں اتنی تاخیر ہوتی تھی اور ہر معاملہ اصطلاحات کی الجھنوں میں اس طرح الجھا دیا جاتا تھا کہ بعض اوقات لوگوں کو عمر بھر اپنے مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار رہتا تھا۔ لوگوں میں غیر ضروری طور پر مقدمہ بازی کے چسکے سے ان کے اخلاق پر برا اثر پڑا۔ لیکن ضابطہ کے نافذ ہونے سے یہ ضرور ہوا کہ افراد کے مقابلہ میں قانون کا اقتدار مسلم ہو گیا اور اصولاً رعایا کے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ بڑے سے بڑے اعلیٰ عہدہ دار کی زیادتی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکے۔[2]

بندوبست دوامی

بنگال و بہار کے دیوانی حقوق ملنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان علاقوں کے قدیم زمینداروں کے حقوق تلف کر دئے تا کہ کسی نہ کسی طرح مالگزاری کی رقم میں اضافہ ہو۔

---

[1] Mill, History of British India, Vol. V. p. 355,

[2] Ross, Cornwallis Correspondence, Vol. II, p. 558,

نئے انتظام میں ایسے لوگ مالگزاری جمع کرنے کے کام پر مقرر کیے گئے جنھیں زمین سے کوئی مستقل تعلق نہ تھا بلکہ انھوں نے کسی علاقہ پر بقائے کی صورت میں کمپنی کے محاسبوں اور منشیوں کو ملا کر نیلام میں انھیں حاصل کیا تھا۔ ان میں دلال، بنیے اور سیٹھ باز شامل تھے جو نیلام کے وقت اونچی بولی بول کر بڑے بڑے علاقوں کی مالگزاری ادا کرانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے تھے۔ غرضکہ اسی طرح آہستہ آہستہ بنیوں اور سیٹھ بازوں نے پرانے خاندانی زمینداروں کو بے دخل کر کے زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان حالات کے لازمی نتیجہ میں بنگال و بہار کی زرعی معشیت بالکل تباہ ہو گئی تھی۔ اکثر قدیم شریف خاندان جن کا تعلق زمین سے پشتہا پشت سے چلا آتا تھا۔ چند سالوں میں مٹ گئے اور ان کی جگہ نو دولتوں نے حاصل کر لی۔ زمینداروں کے علاوہ قحط سالی کی وجہ سے کسانوں کی حالت بھی بد سے بدتر ہو رہی تھی اور بنگال و بہار کے عوام کی قوت خرید میں ضعف اور کمی پیدا ہو گئی تھی۔ ان حالات کے مدنظر فلپ فرانسس نے سب سے پہلے سنہ ۱۷۷۶ء میں مالگزاری کے انتظامات کو مستقل بنیاد پر قائم کرنے کی تجویز پیش کی جس سے وارن ہیسٹنگز کو اختلاف تھا۔ ؎[1] ہیسٹنگز کے عہد میں کمپنی کی حکومت اور بنگال کے قدیم زمینداروں میں سخت کشمکش رہی۔ ہیسٹنگز کا دعویٰ یہ تھا کہ زمین حکومت کی ملکیت ہے اور زمیندار کہتے تھے کہ قدیم زمانے سے زمین زمیندار کی ملکیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ فلپ فرانسیس زمینداروں کی بات سچ سمجھتا تھا جو مقامی روایتوں کے بموجب بالکل درست تھا۔ لیکن ہیسٹنگز نے سنہ ۱۷۷۲ء میں پنج سالہ بندوبست قائم کیا۔ اس کی میعاد جب سنہ ۱۷۷۷ء میں ختم ہوئی تو آئندہ تین سال تک برابر ہر سال بندوبست ہوتا رہا۔ سنہ ۱۷۸۱ء میں تین سال کے لیے بندوبست ہوا اور مالگزاری کے

Ascoli, Early Revenue History of Bengal and the Fifth Report, - ؎[1]

p. 34.

مطالبہ میں ۲ لاکھ ساٹھ ہزار روپے کا مزید اضافہ عمل میں آیا۔ اس کے بعد پھر سال سال بھر کے لیے بندوبست ہوا اور جو سب سے اونچی بولی بولتا اسے مالگزاری کی وصولی کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا۔ غرضکہ وارن ہیسٹنگز نے اپنے عہد میں برابر یہ کوشش کی کہ زمینداری کے بجائے عارضی اجارہ داری کا طریقہ رائج رہے تاکہ زمین حکومت کی ملکیت تسلیم کی جائے۔ اس انتظام کو بنگال کے سب قدیم زمیندار سخت ناپسند کرتے تھے۔

۱۷۸۴ء کے ایکٹ کے قانون میں اس کی صراحت کر دی گئی تھی کہ "وہ ہندوستانی راجاؤں، زمینداروں، تعلقداروں پولیگاروں اور دوسرے دیسی مالکان آراضی کی رقم مالگزاری اور خدمات کے تعین کے لیے مستقل قاعدے بنانے چاہییں"۔ چنانچہ جب کارنوالس ہندوستان آیا تو اس کو مجلس نظما نے صاف صاف ہدایت کی تھی کہ وہ مالگزاری کے سابقہ انتظام کا مطالعہ کر کے ایک مستقل بندوبست کی بنا ڈالے تاکہ کمپنی کی آمدنی میں تعین اور استحکام کی صورت پیدا ہو۔ لیکن مجلس نظما چاہتی تھی کہ پہلے تھوڑی مدت کے لیے بندوبست کیا جائے پھر تجربہ کی روشنی میں اسی انتظام کو دوامی کر دیا جائے۔ چنانچہ کارنوالس نے ہندوستان پہنچنے کے بعد مشرقی ہند کے مالگزاری کے نظام کے متعلق تفصیلی تحقیق شروع کرا دی۔ ڈنکن اور شور جیسے تجربہ کار افسروں نے اس مسئلہ کے متعلق اچھی طرح چھان بین کی۔ یہ دونوں اس اصول کو مانتے تھے کہ زمینداروں کے زمین کے حق ملکیت کو تسلیم کرنا چاہئے لیکن گرانٹ اس کے خلاف تھا۔ شور کا کہنا تھا کہ زمیندار کے آراضی کے حق ملکیت کو مان لینا چاہیے لیکن اس وقت بندوبست دس سال کے لیے ہو تو اچھا ہے تاکہ اس عرصہ میں جو نیا تجربہ ہو اس کو آئندہ مستقل بندوبست کرتے وقت استعمال کیا جا سکے۔ بغیر اس کے یہ ناممکن تھا کہ ہر ایک گاؤں اور ہر ایک پرگنہ کے حقیقی رقبہ اور مالگزاری کو معین کیا جا سکے۔ دس سال کی مدت زمینداروں کو اپنے علاقوں کی ترقی کی جانب مائل کرنے کے لیے کافی ہوگی اور آئندہ ان خرابیوں کو دور کرنا

ممکن ہوگا جو اس عرصہ میں رونما ہوگی۔ لیکن اگر فوراً دوامی بندوبست کر دیا گیا تو بہت سی خرابیوں کا ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ پر جم جانے کا ڈر رہے گا۔ پھر اس وقت کمپنی کے پاس معلومات بہت ناکافی تھیں۔ ملک قحط کے اثرات سے بالکل آزاد نہیں ہوا تھا۔ بنگال کے ایک تہائی حصہ پر کاشت نہیں کی جا رہی تھی۔ ان حالات میں کوئی ایسا اقدام مصلحت کے خلاف تھا جس کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑنے والے ہوں۔

کارنوالس شروع ہی سے دوامی بندوبست کی خوبیوں کا قائل تھا۔ اس نے وزیر اعظم مسٹر پٹ اور مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) کے صدر مسٹر ڈنڈس کو آمادہ کر لیا کہ دوامی بندوبست کو نافذ کرنے کی اجازت دیدیں۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ میں اعلان کے ذریعے سے یہ انتظام نافذ کر دیا گیا اور دو سال بعد بنارس میں بھی اسی کے مطابق عمل ہونے لگا۔ کارنوالس نے اپنی یادداشت میں شور کے دلائل کا جواب دیا کہ دس سال کا بندوبست درحقیقت اجارے کے مساوی ہوگا اور اس کی وجہ سے زمینداروں کی بے اطمینانی کم نہ ہوگی۔ بنگال کے وسیع رقبوں میں زراعت کی ترقی اور جنگلوں کو صاف کرنے کے لیے یہ مدت ناکافی ہوگی اور زمینداروں کو میعاد کے ختم پر زائد لگان کے عاید ہونے کا خدشہ رہے گا۔ اگر دس سال کے لیے بندوبست کیا گیا تو زمینداروں کی یہ کوشش رہے گی کہ اس مدت میں زمین سے جتنا بھی استحصال کر سکتے ہیں کر لیں اور مقررہ میعاد کے ختم ہونے کے قریب اسے تباہ و ویران چھوڑ دیں۔ اس طرح وہی خرابیاں رہیں گی جو ایک سال یا تین سال کے اجاروں میں تھیں اور جن کی وجہ سے بنگال کی پیداوار اور ملک کی عام ترقی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

اس کے علاوہ کارنوالس نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دوامی بندوبست سے ہندوستان میں امراء کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے گا جو کم و بیش انگلستان کے طبقہ امراء سے مشابہ ہوگا۔ اور چونکہ یہ طبقہ حکومت کا آوردہ ہوگا اس لیے اس کا مفاد یہی ہوگا کہ حکومت کا وفادار رہے۔ لیکن دراصل

یہ ایک طرح کا مغالطہ تھا۔ کارنوالس کو ہندوستانی طبقۂ اُمراء کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جب کہ خود تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے متعلق اس کی رائے نہایت خراب تھی اور وہ انھیں کسی ایسے اعلیٰ عہدہ کے لائق نہ سمجھتا تھا جس میں ذمہ داری عاید ہوتی ہو۔ اگر دوامی بندوبست کا مقصد طبقہ امراء پیدا کرنا تھا تو مالگزاری کے ناواجب مطالبات میں تخفیف ضروری تھی لیکن کمپنی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ اس کی آمدنی میں ذرا سی بھی کمی ہو۔ زمینداروں کو زمین سے وابستہ کر کے اور انھیں زمین کا مالک تسلیم کر کے کمپنی ناواجب مطالبات من مانے طور پر عاید کر سکتی تھی چنانچہ مالگزاری کے بقائے کی نسبت اس قدر سخت احکام نافذ کئے گئے جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس انتظام سے ہندوستانیوں میں طبقہ امراء پیدا کرنا ہرگز اصلی مقصود نہیں ہو سکتا تھا۔

دوامی بندوبست کے تحت جتنے علاقے بنگال بہار اور اوڑیسہ میں تھے ان سے تقریباً ۳۰ لاکھ روپے سالانہ مالگزاری کے علاقے ایک سال میں بقائے کی علت میں فروخت کروئے گئے۔ اس انتظام کے تحت ۲۲ سال کے اندر بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی تقریباً نصف جائدادیں بقایے کے سلسلہ میں فروخت ہوئیں اور اپنے پہلے مالکوں کے ہاتھ سے نکل کر ان سیٹھ ساہوکاروں کے پاس یہ چلی گئیں جو کمپنی کے محاسبوں اور منشیوں سے اچھے تعلقات رکھتے اور انھیں رشوتوں سے خوش کرتے رہتے تھے۔ انھیں محاسبوں اور منشیوں کے ہاتھ میں تھا کہ مقررہ مالگزاری داخل کرنے میں اگر ایک دن کی بھی دیر ہو تو بڑی سے بڑی جائداد کو قرق کر کے نیلام کرادیں۔ اس انتظام سے دیناجپور راجشاہی، بشن پورا اور دوسرے علاقوں کے بعض بڑے بڑے زمیندار ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئے (۱)۔ ان جائدادوں کے خریدنے والے اکثر ایسے لوگ تھے جو کلکتہ میں رہتے اور اپنے کارندوں کے ذریعہ ان کا انتظام کراتے تھے۔ غرضکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر واقعی کارنوالس دوامی بندوبست کے

۱۔ Ascoli, P. 214-223.

ذریعہ ایک نیا طبقہ امرا قایم کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنے اس مقصد میں ناکام رہا اس لیے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ تر سیٹھ باز تھے جنھیں زمین سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ دوامی بندوبست کے ذریعہ کارنوالس ایسے وقت میں جب کہ کمپنی کا قرضہ بڑھ رہا تھا اور اس کا کاروبار مندا ہو گیا تھا، کمپنی کی مالی حالت کو سدھارنا اور آمدنی میں تعین و استحکام پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے یہ نہ دیکھا کہ یہ استحکام محض عارضی ہوگا۔ غالباً اس کا اور اس کی ہم خیال جماعت کا یہ خیال تھا کہ ابھی انگریزی نظم و نسق کو اتنی ترقی نہیں ہوئی کہ حاکم طبقہ براہِ راست محکوموں سے تعلق قایم کرے۔ مالگزاری وصول کرنے اور برطانوی مفاد کو ترقی دینے میں اسی طرح سہولت تھی کہ زمینداروں کو ان کی اپنی زمینوں سے ہمیشہ کے لیے وابستہ کر دیا جائے۔

تعجب ہے کہ رمیش دت کا سا قوم پرست مصنف نہ معلوم کن خاص مصلحتوں سے کارنوالس کے اس کارنامہ کو دل کھول کر سراہتا ہے[۱]۔ رمیش دت نے اسی قسم کے دوامی بندوبست کو ملک کے دوسرے حصوں میں رائج کرنے کی بھی سفارش کی ہے تاکہ زراعت پیشہ طبقہ کی حالت بہتر ہو سکے[۲] حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس انتظام سے کاشتکار کی حالت بد سے بدتر ہو گئی، اگرچہ زمینداروں نے خوب نفع کمایا اس لیے کہ زرعی پیداوار کی قیمت میں پچھلے ڈیڑھ سو برس میں بہت اضافہ ہو گیا ہے جس کی مناسبت سے انھوں نے کاشتکار سے لگان بڑھا دیا ہے لیکن حکومت کو جو مالگزاری ڈیڑھ سو سال پہلے ادا کی جاتی تھی وہی آج بھی ادا کی جاتی ہے۔ دوامی بندوبست کی خرابیوں کو دیکھ کر بہت عرصہ بعد ۱۸۵۹ء اور پھر ۱۸۶۸ء میں حکومت نے قوانین اراضی منظور کیے تاکہ زمیندار من مانے طور پر لگان نہ بڑھا سکیں قیمتوں

۱؎ R. Dutt, Economics of British India p. 94-96.

۲؎ R. Dutt, Famines in India (p. xii Preface)

کے اضافہ کے ساتھ مالگزاری کی رقم میں اضافہ نہ کر سکنے کی وجہ سے حکومت بنگال بغیر حکومت ہند کی مدد کے اپنے میزانیہ کے خسارہ کو پورا نہیں کر سکتی۔ یہ کہنا کہ دوامی بندوبست کی وجہ سے زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوا درست نہیں اس واسطے کہ اس کی وجہ آبادی کا بڑھنا ہے نہ کہ دوامی بندوبست۔ اس انتظام کی وجہ سے زراعت میں کسی قسم کی کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی[1] بلکہ اس کی وجہ سے حکومت کو کم از کم تین کروڑ روپے سالانہ آمدنی کا نقصان اٹھانا پڑا جس کی پابجائی دوسرے ذریعوں سے کی گئی[2]

شاہی منشور ۱۷۹۳ء

۱۷۹۳ء میں پارلیمنٹ نے منشور کے ذریعے کمپنی کے حقوق کی آئندہ بیس سال کے لیے تجدید کی۔ اس قانون کے منظور ہونے سے پانچ سال قبل مجلس نظامت کے لیے لازم کیا گیا تھا کہ سالانہ کمپنی کی آمدنی اور خرچ کی تمام رسیدیں مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول) کے ملاحظہ میں پیش کیا کرے۔

بورڈ آف کنٹرول کو یہ اختیار بھی حاصل ہو گیا تھا کہ جو شاہی فوجیں ہندوستان بھیجی جائیں ان کے اخراجات کمپنی کی آمدنی میں سے منہا کیے جائیں۔ یہ پہلا قدم تھا جس کے موجب ہندوستان میں جتنی بھی انگریزی فوج تھی وہ شاہی قرار دی گئی۔ منشوری قانون جب پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو گلاسگو، برسٹل، مانچسٹر اور دوسرے صنعتی مرکزوں سے بے شمار درخواستیں اس مضمون کی حکومت کو موصول ہوئیں کہ ہندوستان کی تجارت کے منافع سے سارے ملک کو محروم کر کے صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کو اجارہ دار بنا دینا مناسب نہیں ہے۔ مسٹر ڈنڈاس صدر مجلس نگران (بورڈ آف کنٹرول)

---

[1] Chandhri, History and Economics of the Land-system in Bengal, صفحہ 34

[2] Imperial Gazetteer of India (1908, Vol. VIII, p. 301).

نے ارکان پارلیمنٹ کو باور کرایا کہ اگر انگلستان آزادانہ تجارت کے اصول پر عمل کرے گا تو دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ لارڈ کارنوالس نے بھی صدر مجلس نگران کو جتا دیا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی حقوق کا خاتمہ ہوا تو ہندوستان انگریز سٹہ بازوں کا دنگل بن جائے گا۔ بعض نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کی بڑی تعداد آباد ہو گئی تو خطرناک سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی اور امریکہ کی طرح یہ ملک انگلستان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ کمپنی کے اجارے کی بیس سال کے لیے اور تجدید کر دی گئی۔ دوسرے تجارت پیشہ لوگوں کی چیخ پکار دبانے کے لیے کمپنی کو حکم دیا گیا کہ تین ہزار ٹن سالانہ مال کی تجارت نجی کی تجارت کرنے والوں کے لیے چھوڑ دی جائے۔ مسٹر ولبرفورس کی یہ کوشش تھی کہ مسیحی پرچار کرنیوالوں کو ہندوستان جا کے عیسائیت کا پرچار کرنے اور اپنے تعلیمی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے لیکن وزارت اور پارلیمنٹ نے اس تجویز سے اس لیے اختلاف کیا کہ کہیں اس سے ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ غرض کہ قانون منشور سے کمپنی کی حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ گورنر جنرل اگر چاہے تو اپنی کونسل کی اکثریت کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو بھی ان کی کونسلوں کے خلاف عمل کرنے کی اجازت دی گئی۔

نواب اودھ اور کمپنی

نواب اودھ چاہتا تھا کہ جو انگریزی فوجیں اس کے یہاں رکھی گئی ہیں انھیں کمپنی کی حکومت واپس بلا لے اس لیے کہ ان کی وجہ سے اس کا خزانہ بری طرح زیر بار ہو رہا تھا۔ سالانہ ۵۰ لاکھ روپے وہ کمپنی کی حکومت کو ادا کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے نواب نے اپنے وزیر حیدر بیگ خاں کو کلکتہ روانہ کیا۔ کارنوالس اور حیدر بیگ خاں میں کئی ملاقاتیں ہوئیں جن میں یہ طے ہوا کہ اگر انگریزی فوج اودھ سے ہٹا لی گئی تو سکھوں اور مرہٹوں سے نواب کی فوج

مقابلہ نہ کر سکیں گی اور اس طرح خود اس کے ملک اور کمپنی کے علاقے غیر محفوظ رہیں گے۔ کارنوالس نے انگریزی فوج کے خرچ کے لیے بجائے ۲۴ لاکھ کے ۵۰ لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دیا تاکہ نواب کی زیر باری میں کمی ہو۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ کمپنی کی حکومت اودھ کے اندرونی نظم ونسق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔ لیکن سیاسی اور دفاعی نوعیت کے مسائل میں بغیر کمپنی کی مدد کے حکومت اودھ بے بس ہو گی اس لیے ان امور کی انجام دہی کمپنی کی مرضی سے ضروری ہے۔ لارڈ کارنوالس نے ان انگریز قرض خواہوں کے مطالبوں کو ماننے سے انکار کیا جو نواب اودھ کے خلاف پیش کئے گئے اور اس طرح نواب اودھ ان پیچیدگیوں سے بچ گیا جن میں نواب ارکاٹ کو الجھنا پڑا تھا۔ لارڈ کارنوالس نے اس بدنظمی کی طرف نواب کو توجہ دلائی جو اس زمانے میں اودھ میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے ملک کی آمدنی متاثر ہو رہی تھی۔(۱)

سرکار گنتور کا معاملہ

۱۷۸۲ء میں نواب بسالت جنگ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی رو سے جو کمپنی اور نواب میر نظام علیخاں کے درمیان ہوا تھا یہ طے پایا کہ نواب بسالت جنگ کے انتقال پر سرکار گنتور کمپنی کے حوالہ کر دی جائے گی۔ لیکن نواب میر نظام علی خاں نے ایسا کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ سابقہ عہد نامہ کے بموجب شمالی سرکاروں کی جو رقم پیشکش کمپنی پر واجب الادا تھی اس کا بقایا برابر چلا آ تا تھا۔ اگرچہ وارن ہیسٹنگز نے نواب میر نظام علیخاں کی خوشنودی کے لیے صوبیدار دکن کا تعلق بجائے حکومت مدراس کے براہ راست حکومت ہند سے قائم کر دیا تھا لیکن پیشکش کی رقم کی ادائی اب تک حکومت مدراس ہی کے ذمہ تھی۔ حکومت مدراس نے بار بار یہ وعدہ کیا کہ بقایا جلد ادا کیا جائے گا لیکن اس وعدہ کی پابندی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے سرکار نظام کو شکایت کا موقع پیدا ہوا۔

(۱) Ross, correspondence of Marquis Cornwallis, I, p. 300.

جب لارڈ کارنوالس ہندوستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چونکہ ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں اور سرکار نظام نے اتحاد قایم کر لیا ہے اس لیے ٹیپو سلطان کا سرکار نظام سے مل کر جنوبی ہند میں انگریزوں کے مفاد سے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں چنانچہ وہ گنتور کے معاملہ میں برابر ٹال مٹول کرتا رہا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ وہ سرکار گنتور کو دوسری سرکاروں کی طرح کمپنی کے لیے حاصل کرے گا اور مجلس نظماء نے بھی اس کو اسی قسم کی ہدایتیں دی تھیں۔

سرکار گنتور کی اہمیت سرکار نظام کے نزدیک اس لیے تھی کہ اس کے ذریعہ سے سمندر تک رسائی ہو سکتی تھی۔ کمپنی سے بگاڑ کی صورت میں مشرقی ساحلی علاقہ سے فرانسیسیوں سے فوج اور سامان جنگ حاصل کرنا بھی ممکن تھا جیسے کہ سابق میں کیا گیا تھا۔ انگریزوں کے لیے سرکار گنتور کی اہمیت اس لیے تھی کہ اس پر قبضہ کیے بغیر مدراس اور دوسری کاروں میں براہ راست تعلق برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۷۸۸ء میں کارنوالس نے دیکھا کہ اگر سرکار گنتور کا مطالبہ اب اس وقت کیا گیا تو نواب میر نظام علیخاں سے کمپنی کے مفاد کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لیے کہ انگریزوں کے خلاف مرہٹوں اور ٹیپو سلطان سے ان کے ایکے کا بظاہر امکان نہیں تھا اور بغیر اس قسم کے اتحاد کے وہ جانتا تھا نواب میر نظام علیخاں انگریزوں سے لڑائی مول نہیں لے گے ان حالات میں کارنوالس نے کپتان کناوے کو رزیڈنٹ بنا کر حیدر آباد بھیجا اور ہدایت کی کہ وہ گنتور کے متعلق سرکار نظام سے معاملہ طے کرے اور جو پیشکش کمپنی کی طرف سے واجب الادا ہے اس کی جانچ کر لی جائے۔ چنانچہ کناوے نے حیدر آباد پہنچکر گنتور کا مطالبہ پیش کر دیا اور نواب میر نظام علیخاں کو آگاہ کر دیا کہ دو ہفتے کے اندر انگریزی فوجیں گنتور میں داخل ہو جائینگی۔ یہ سب کارنوالس کی ہدایتوں کے بموجب کیا گیا (۱) اس تصفیہ کی اطلاع پیشوا، سندھیا اور بھونسلا کو بھی کر دی

لہ Forrest, selections from the state-papers of the Governers-general of India, Vol. II, p. 178

گئی۔

نواب میر نظام علیخاں کو چونکہ مرہٹوں پر اعتبار نہ تھا اور ٹیپو سلطان سے بھی اتحاد کی کوئی صورت نہ نکل سکی اس لیے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ انگریزی حکومت سے معاملہ کر لیا جائے اور سرکار گنتور کے مسئلے پر جو اس کے مقابلے میں حقیر تھا ریاست کے مستقبل کو قربان نہ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سیف جنگ کو جو گنتور میں سرکار نظام کا مقرر کیا ہوا حاکم تھا ہدایات بھیجدیں کہ سرکار گنتور انگریزوں کے حوالے کر دی جائے۔ شمالی سرکار کے متعلق جو پیشکش واجب الادا تھیں اس کے تصفیہ کے لیے میر عالم کو کلکتہ روانہ کیا گیا اور یہ تصفیہ ہوا کہ کمپنی سرکار نظام کو نو لاکھ سولہ ہزار چھ سو پینسٹھ روپے گیارہ آنے ادا کرے۔ میر عالم نے سرکار نظام کی جانب سے لارڈ کارنوالس سے خواہش ظاہر کی تھی کہ دونوں حکومتوں میں معاہدہ کی تجدید ہو جائے اور اس کی صراحت کر دی جائے کہ جو انگریزی فوج ممالک محروسہ میں رہتی ہے جس کے مصارف کا بار سرکار نظام کے خزانہ پر ہے اس کو سرکار نظام اپنے منشاء کے موافق استعمال کر سکیں۔ چنانچہ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی ترمیم اور سرکار نظام سے معاملات کی یکسوئی کی خاطر نواب میر نظام علیخاں کو ایک خط لکھا جس میں حکومت حیدرآباد کے بنیادی مطالبات تسلیم کر لیئے گئے۔ اس خط کے متعلق پارلیمنٹ نے توثیق کر دی کہ وہ معاہدہ کے مثل تصور کیا جائے گا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ میں یہ دفعہ تھی کہ انگریزی فوج کی دو پلٹنیں اور چھ توپیں یوروپین ماہروں کے تحت ممالک محروسہ میں موجود رہیں گی۔ اس دفعہ کے ساتھ یہ الفاظ بھی تھے "جب کبھی کمپنی کے معاملات اور ضروریات کے مدنظر ایسا کرنا ممکن ہو گا"۔ لارڈ کارنوالس نے اپنے خط میں اس دفعہ کی اس طرح صراحت کر دی کہ جب کبھی سرکار نظام ضرورت محسوس کریں دو پلٹنوں کو جن میں سے ہر ایک آٹھ سو سپاہیوں پر مشتمل ہو گی اور جن کے افسر یوروپین ہوں گے طلب کر سکتے ہیں۔ اس شرط سے کہ انھیں حلیفوں کے خلاف استعمال نہیں کیا جائیگا جن میں نواب اودھ، نواب ارکاٹ، راجا تنجور اور راجا ٹراونکور کا ذکر

کیا گیا تھا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ میں اس کا بھی ذکر تھا کہ حیدر علی سے کمپنی ان اضلاع کو حاصل کرے گی جن پر اس نے کرناٹک بالاگھاٹ کے علاقہ میں قبضہ کرلیا تھا اور ان کے متعلق کمپنی سرکار نظام کو ۷ لاکھ روپے سالانہ پیشکش ادا کرے گی۔ میر عالم نے لارڈ کارنوالس کو اس جانب متوجہ کیا کہ معاہدے کی اس دفعہ پر اب تک عمل نہیں کیا گیا۔ اس پر لارڈ کارنوالس نے یہ جواب دیا کہ ۱۷۶۸ء کے حالات اور تھے اب سیاسی حالات کی نوعیت دوسری ہے۔ اس وقت چونکہ کمپنی اور دربار میسور میں صلح ہے اس واسطے اس ضمن میں کچھ کرنا ممکن نہیں لیکن اگر آئندہ کبھی ان اضلاع پر کمپنی کا قبضہ اور تصرف ہوگیا تو ممکن ہے ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی اس دفعہ پر کمپنی عمل کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کے بعد جو کمپنی نے سرکار نظام کے ساتھ کیا تھا ۱۷۶۹ء اور ۱۷۸۴ء میں کمپنی نے دربار میسور کے ساتھ جو معاہدے کئے ان میں یہ بات صراحت سے تسلیم کرلی تھی کہ کرناٹک بالاگھاٹ کے جن علاقوں پر دربار میسور کا قبضہ ہے وہ برقرار رہے گا۔ اگر سرکارِ نظام کے معاہدہ پر کمپنی عمل کرتی تو ان دونوں معاہدوں کو توڑنا پڑتا جو اس نے دربار میسور سے کئے تھے۔ یہ بات اس ضمن میں قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں کمپنی اور ٹیپو سلطان میں صلح تھی لیکن پھر بھی کارنوالس نے جان بوجھ کر اپنے اس خط میں جو اس نے نواب میر نظام علیخاں کو لکھا تھا اس کا نام حلیفوں میں نہیں شامل کیا جن کے خلاف کمپنی کی فوج استعمال نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس میں ایک اشارہ تھا کہ دربار میسور کے خلاف اگر نواب میر نظام علیخاں چاہیں تو کمپنی کی فوج کو استعمال کرسکیں گے۔ اگرچہ کمپنی اور ٹیپو سلطان میں بظاہر صلح ہوچکی تھی لیکن کارنوالس بخوبی جانتا تھا کہ عنقریب کمپنی کو اس کے خلاف فیصلہ کن جنگ کرنا پڑے گی۔ ٹیپو سلطان نے اپنے سفیر پیرس روانہ کئے اور سولھویں لوئی سے انگریزوں کے خلاف مدد مانگی۔ اس نے گورنر پانڈیچری سے بھی خط کتابت شروع کردی تھی تاکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جب لڑائی چھڑ جائے تو فوراً کرناٹک پر حملہ کردے۔ ٹیپو سلطان کو یہ معلوم کرکے بہت غصہ آیا کہ کارنوالس کا منشاء سلطنت میسور کے حصے بخرے کرنے کا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ سرکار نظام کمپنی کی فوج کو اس کے خلاف استعمال کرے۔

ٹیپو سلطان نے بجا طور پر کارنوالس کے اس تحریری وعدہ کو اپنے خلاف کسی قریبی جارحانہ کارروائی کا پیش خیمہ سمجھا اور وہ بھی لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

میسور کی تیسری جنگ

جب ٹیپو سلطان کو معلوم ہوا کہ ڈچ لوگوں نے راجا ٹراونکور کے ہاتھ دو گاؤں بیچ ڈالے جو اصل میں کوچین کے تھے تو اس نے راجا ٹراونکور کو لکھا کہ چونکہ کوچین کی ریاست اس کی باجگزار ہے اس واسطے ڈچ نے ان دونوں گاؤں کے متعلق اس سے جو معاملہ کیا ہے وہ بغیر اس کی مرضی کے درست نہیں ہے۔ اس مطالبہ کے ساتھ اس نے ۱۷۸۹ء میں ٹراونکور پر حملہ کر دیا۔ اس وقت چونکہ فرانسیسی ٹیپو سلطان کی براہ راست مدد نہیں کر سکتے تھے اور مرہٹے اور نواب نظام الملک انگریزوں کے موافق ہو چکے تھے اس لئے ٹیپو سلطان سے لڑنے کا یہ بہترین موقع تھا جس سے کارنوالس نے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کارنوالس نے حکومت مدراس کو تیاری کا حکم دیا تاکہ ٹیپو سلطان کے خلاف فوج کشی کی جائے۔ اس وقت مدراس میں مسٹر ہالینڈ گورنر تھا۔ اس نے کارنوالس کو لکھا کہ حکومت مدراس ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے کو مصلحت نہیں سمجھتی اور وہ اپنے سابقہ عہدناموں کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتی۔ چنانچہ مسٹر ہالینڈ کو استعفاء دینے پر مجبور کیا گیا اور ٹراونکور کا بہانہ دربار میسور کے خلاف جنگ کرنے کے لیے کافی تصور کیا گیا (۱) اس کی جگہ جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر اور کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا جو کارنوالس کے خیالات کا حامی تھا۔

اتحاد ثلاثہ

اس اثنا میں کارنوالس نے نواب میر نظام علیخاں اور پیشوا سے ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد قائم کر لیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ پیشوا اور سرکار نظام دس دس ہزار سوار سے انگریزوں کے شریک ہو کر ٹیپو سلطان پر حملہ کریں گے اور اگر ضرورت ہوگی تو مزید فوج سے بھی امداد کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ متحدہ افواج جتنے قلعے اور سلطنت میسور کا جس قدر

---

(۱) Wilk's South India, Vol II. p. ۔۸۱

علاقہ فتح کریں گے وہ سب تینوں اتحادیوں میں برابر برابر تقسیم کردیا جائے گا۔ جنگ کے دوران میں پیشوا اور نواب نظام الملک کی فوجوں کے خرچ کا بار انگریزوں پر پڑے گا۔ مسٹر میلٹ نے جو دربار پونا میں انگریزی حکومت کا رزیڈنٹ تھا مرہٹوں اور کمپنی میں معاہدہ کرانے میں بڑی دوڑ دھوپ کی۔ اس کے علاوہ کارنوالس نے جارج فارسٹر کو ناگپور روانہ کیا تاکہ وہ بھونسلا راجا سے موافقت پیدا کرلے۔

مئی سنہ ۱۷۹۰ء میں کارنوالس کے منشاء کے بموجب جنرل میڈوز ترچناپلی سے ۱۵ ہزار فوج لے کر کوئمبٹور کی طرف بڑھا اور کوئمبٹور، پال گھاٹ، اور ڈنڈیگل کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ جنرل میڈوز نے غلطی سے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تاکہ وہ دو طرف سے میسور کی طرف بڑھے۔ ٹیپو نے ماہرانہ نقل و حرکت سے اپنی فوجیں ان دونوں حصوں کے درمیان پہنچا دیں اور انگریزوں کو جان اور مال کا بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ جب کارنوالس کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے زبردست لشکر سمندر کے کنارے بنگال سے مدراس بھیج دیا۔ اس فوج کے مدراس پہنچنے کے بعد بھی ٹیپو سلطان کے خلاف اطمینان کے قابل نتیجے نہ نکل سکے۔ آخرکار کارنوالس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج کی باگ خود اپنے ہاتھ میں لے۔ وہ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۷۹۰ء کو مدراس پہنچا۔ فروری سنہ ۱۷۹۱ء میں کارنوالس نے بنگلور پر قبضہ کرلیا۔ سرکار نظام اور مرہٹوں کی فوج بھی امداد کے لیے پہنچ چکی تھی۔ نواب میر نظام علیخاں بہ نفس نفیس مہم پر تشریف لے گئے اور قلعہ پنگل میں اس وقت تک قیام کیا جب تک کہ جنگ کا خاتمہ نہ ہوگیا۔[1] انگریزی فوج کو رسد کی قلت کی وجہ سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ ٹیپو سلطان کے سبک رو رسالوں نے رسد کو ہر طرف سے روک دیا تھا۔ کارنوالس کو مجبور ہوکر مدراس کی طرف پسپا ہوکر واپس جانا پڑا اور جنرل ایبر کرمبی کو بمبئی جو بمبئی کی طرف سے امدادی فوج لے کر مغربی ساحل کی طرف سے آگے بڑھ رہا تھا

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ (۵۲)

احکام بھیجے گئے کہ وہ بھی ساحل کی طرف پیچھے ہٹ جائے۔ مرہٹوں نے کوئی خاص مدد نہ کی بلکہ یہ لوٹ کھسوٹ میں رہتے۔ کارنوالس سے انہوں نے فوج کے خرچ کے لیے چودہ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا جسے اس لیے منظور کیا گیا کہ کہیں وہ ٹیپو سلطان سے جا کر نہ مل جائیں۔

مدراس واپس آکر کارنوالس فوج کے لیے رسد کا پوری طرح انتظام کر کے پھر جنوری سنہ ۱۷۹۲ء میں بائیس ہزار فوج کے ساتھ میدان میں اُترا۔ سرکار نظام کی دس ہزار فوج اس کے علاوہ تھی۔ مرہٹوں کی بھی پانچ چھ ہزار فوج آکر مل گئی۔ یہ فوج ڈنڈا ناتی لڑتی لڑاتی سرنگاپٹم پہنچ گئی۔ ٹیپو سلطان نے زبردست حملے کیے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ جنرل ایبر کرومبی مغربی ساحل کی طرف سے بڑھتا ہوا سرنگاپٹم کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ٹیپو سلطان نے جب کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھی تو صلح کی درخواست کی۔ ۲۴ فروری سنہ ۱۷۹۲ء صلحنامہ سرنگاپٹم پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے یہ طے ہوا کہ جنگ سے قبل ٹیپو سلطان جس پر قابض تھا اس میں سے نصف حصہ اتحادیوں کے حوالہ کر دے اور تین کروڑ تیس لاکھ روپئے تاوان جنگ ادا کرے۔ یہ رقم فوراً نصف اور باقی تین قسطوں میں ادا کی جائیگی۔ ٹیپو سلطان اپنے دو بیٹوں کو بطور یرغمال انگریزوں کے سپرد کر دے گا۔ دونوں طرف کے تمام قیدی چھوڑ دئے جائیں گے انگریزوں نے مفتوحات کا ایک ثلث اور تاوان کا ایک ثلث اپنے اتحادیوں کو دیا۔ انگریزوں کو مالابار، کرگ، ڈنڈیگل اور بارہ محل کے علاقے ملے جن کی آمدنی تقریباً چالیس لاکھ روپے سالانہ تھی۔ سرکار نظام کو کڑپہ، کرم کنڈہ گوٹی اور دوآب کے علاقے دئے گئے جن پر دربار میسور نے پچھلے زمانے میں قبضہ کر لیا تھا۔ مرہٹوں کی جنوبی سرحد دریائے تنگ بھدرا قرار پائی جو پہلے تھی۔ غرض کہ صلحنامہ سرنگاپٹم نے جنوبی ہند کی قوتوں میں ایک طرح

کا توازن پیدا کر دیا اور انگریزی وقار میں اس سے کافی اضافہ ہوا۔ ٹیپو سلطان کی قوت اتنی کمزور اور اس کے وسائل اس قدر محدود ہو گئے کہ اتحادیوں کے لیے اب اس کی طرف سے زیادہ خطرہ باقی نہیں رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگریزوں کی سیاسی حیثیت جنوبی ہند میں بہت مستحکم ہو گئی لیکن وہ مرہٹوں اور سرکار نظام کے درمیان جو توازن قایم کرنا چاہتے تھے وہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ بعد میں ٹیپو سلطان نے جب اتحادِ ثلاثہ کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو پھر اس کی ہمت بندھی اور اس نے ایک دفعہ پھر انگریزوں سے قسمت آزمائی کی کوشش کی۔ لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اسی کوشش میں وہ اور اس کی سلطنت صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔

انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنروں پر اکثر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ خواہ مخواہ دیسی والیان ملک سے مملکت کی توسیع کے لیے غیر ضروری جنگیں کرتے ہیں اور اپنی ہمسایہ حکومتوں کے علاقوں کو ہڑپ کرنے کی نیت ان کی محرکِ عمل رہتی ہے۔ چنانچہ پٹ کے قانون میں گورنر جنرل کو مملکت کی توسیع کے تمام منصوبوں کو خیرباد کرنے کی تاکید کی گئی تھی سوائے ایسی صورت میں جبکہ انگریز قوم کے خلاف اقدام کیا گیا ہو اور کمپنی کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ کارنوالس نے ٹیپو سلطان کے خلاف اسی بناء پر جنگ کی کہ وہ ایسا نہ کرتا تو ٹیپو سلطان کمپنی کی حکومت پر جنوبی ہند میں کاری ضرب لگاتا۔ لیکن یہ محض جابرانہ حکمت عملی کی ایک طرح توجیہ ہوئی۔

نواب ارکاٹ سے معاہدہ ۱۷۹۲ء

میسور کی تیسری جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد کارنوالس مدراس پہنچا اور نواب محمد علی کو اپنے ملکی انتظام کے متعلق نیا معاہدہ کرنے کی دعوت دی۔ ۱۷۸۷ء میں نواب ارکاٹ نے حکومت مدراس سے یہ طے کیا تھا کہ جنگ کی حالت میں وہ اپنی مالگزاری کا ۴/۵ حصہ کمپنی کو ادا کرے گا جس پر اس کی عملداری کی حفاظت کی ذمہ داری عاید تھی۔ ٹیپو سلطان سے جب لڑائی شروع ہوئی تو نواب ارکاٹ نے اپنے وعدہ کی پابندی نہ کی اور کمپنی نے جن لوگوں کو مالگزاری کی رقم

وصول کرنے کے لیے مقرر کیا تھا ان کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ چنانچہ کارنوالس نے یہ تجویز پیش کی کہ نواب ارکاٹ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں اپنے ملک کی مالگزاری وصول کرنے کا انتظام کمپنی کے ہاتھ میں دیدے۔ کمپنی اس کے اور اس کے گھرانے کے خرچ کے لیے کافی رقم کی علیحدہ نشاندہی کردے گی جو اس کو باقاعدہ ملتی رہے گی اور اس پر جو قرضہ ہے اس کی ادائی کا بھی بندوبست کردیا جائے گا۔ لیکن نواب ارکاٹ نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کردیا۔ چنانچہ کارنوالس نے مناسب سمجھا کہ نواب کو اس قسم کے معاہدہ پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ نرمی اور اعتدال سے کام کیا جائے۔ ۱۲۔ جولائی ۱۷۹۲ء میں نواب ارکاٹ اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا جس کے مطابق کمپنی کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ اگر کبھی کرناٹک میں جنگ ہو تو نواب ارکاٹ کے تمام علاقوں کی مالگزاری کمپنی وصول کرے گی اور امن کی حالت میں نواب اس کا انتظام کرے گا۔ جنگ کی حالت میں جو رقم وصول کی جائے گی اس میں سے ⅘ حصہ جنگ کے اغراض پر صرف کیا جائے گا۔ لیکن نواب پر لازم ہوگا کہ انگریزی فوج کے اخراجات کے لیے وہ سالانہ ۹ لاکھ پگوڈا ادا کیا کرے۔ چھ لاکھ بیس ہزار پگوڈا سالانہ کمپنی کو قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے کے لیے ادا کیے جائیں گے۔ اگر نواب ارکاٹ کی جانب سے ان رقوم کی ادائی باقاعدہ نہ کی گئی تو کمپنی مجاز ہوگی کہ اس کے علاقوں سے جنھیں چاہے اپنے قبضے اور تصرف میں لے کر قرضہ کی ادائی تک ان پر قابض رہے۔ کارنوالس چاہتا تھا کہ اس معاہدہ کے ذریعہ آئندہ کے لیے ایسا انتظام کرے کہ کمپنی کو نواب کی وجہ سے مالی زیرباری نہ اٹھانا پڑے۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر ہنری ڈنڈاس کو ایک خط میں اس معاہدہ کی نسبت کارنوالس نے لکھا کہ "میں نے نواب سے تمام امور کے متعلق تصفیہ کرلیا ہے اور میرا خیال ہے کہ جو صورت اس ضمن میں اختیار کی گئی اس سے بہتر کوئی صورت ممکن نہ تھی سوائے اس کے کہ ہم اس کے پورے ملک پر قبضہ کرلیں لیکن یہ صرف تشدد ہی کے ذریعہ ممکن ہے جسے کسی طرح بھی عقل و انصاف کی

رو سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔"(۱)

سر جان شور سنہ ۱۷۹۳ء تا سنہ ۱۷۹۸ء

سر جان شور کمپنی کے نہایت قابل عہدہ داروں میں سے تھا۔ اگرچہ دوامی بندوبست کے متعلق اس کو کارنوالس سے اختلاف تھا اور وہ چاہتا تھا کہ دس سال سے زائد کے لیے بندوبست نہ ہو لیکن جب دوامی بندوبست نافذ ہو گیا تو اس نے اس کو کامیاب بنانے کی انتھک کوشش کی۔ اس کی قابلیت جانفشانی اور احساس فرض کے جذبہ سے پٹ اور ڈنڈس دونوں بہت کافی متاثر تھے چنانچہ انھوں نے اس کو کارنوالس کا جانشین نامزد کیا۔ حالانکہ کارنوالس نے بورڈ آف کنٹرول کو لکھا تھا کہ گورنر جنرل ہمیشہ ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو کبھی پہلے کمپنی کی ملازمت میں نہ رہا ہو اور ایسے مرتبہ کا ہو جو اپنے ماتحتوں سے عزت و احترام حاصل کر سکے۔ لیکن کارنوالس کا خط پہنچنے سے پہلے مسٹر پٹ سر جان شور کو اس کا جانشین مقرر کر چکا تھا۔

سندھیا اور نانا فرنویس

سر جان شور کو سب سے پہلے مرہٹوں کی ریاست کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس زمانے میں مہادجی سندھیا نے بہت قوت حاصل کر لی تھی۔ معاہدہ سالبائی کے بعد اس نے ایک فرانسیسی افسر کونٹ دے بوئین کو یوروپین طریقے پر اپنی فوج کو تربیت دینے کے لیے نوکر رکھ لیا اس نے دہلی، آگرہ اور علیگڈھ پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ شاہ عالم اس کی حراست میں تھا۔ مغل شہنشاہ نے مہادجی کو اپنا وکیل مطلق مقرر کر دیا تھا۔ اپنی بڑھتی ہوئی فوج کے اخراجات کے لیے مہادجی کو روپے کی ضرورت رہتی تھی۔ چنانچہ اس نے راجپوتانہ کی ریاستوں اور دوآبہ کے زرخیز علاقوں سے رقم وصول کرنے کا انتظام کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ راجا جے پور نے اسمٰعیل بیگ اور محمد بیگ کی مغل فوج کی مدد سے سندھیا کو اپنے ہاں سے بے دخل کر دیا۔ ادھر روہیلکھنڈ میں غلام قادر نے زور پکڑا اور دہلی اور علیگڈھ

۱؎ Beveridge, A comprehensive History of India I, p. 626.

پر قبضہ کر لیا۔ اس نے شاہ عالم کو شاہی محل میں گھس کر گرفتار کر لیا اور اسے اندھا کر دیا۔ لیکن مہادجی سندھیا نے ۱۷۸۹ء میں دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا اور غلام قادر کو شکست دے کر قتل کروا دیا۔ راجپوتانہ میں بھی اس نے پھر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لیا۔ مہادجی سندھیا نے اپنی فوج کے بل پر جو یورپین طریق جنگ سے واقف تھی رانی اہلیہ بائی کے سپہ سالار تکوجی ہلکر کو شکست دی اور راجپوتانہ کے خراج میں اب کوئی مرہٹہ سردار اس کا شریک نہ رہا۔

غرضکہ شمالی ہند میں اس وقت مہادجی کی قوت سب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اس کی نانا فرنویس سے سخت رقابت تھی اس لیے کہ وہ پونا دربار کی سیاست پر بھی چھا جانا چاہتا تھا۔ لیکن پیشوا مادھوراؤ کو اپنے وزیر نانا فرنویس پر ایسا بھروسا تھا کہ اس میں مہادجی بھی اپنی پوری کوشش پر بھی خلل نہ ڈال سکا۔ جس وقت لارڈ کارنوالس نے پیشوا مادھوراؤ اور نواب میر نظام علیخاں سے اتحاد ثلاثہ کی شرطیں طے کیں تو مہادجی سندھیا نے گورنر جنرل کو کہلا بھیجا کہ اگر کمپنی اس کے شمالی ہند کے مقبوضات کی اسی طرح سے ذمہ دار ہو جائے جس طرح سے وہ نواب میر نظام علیخاں کی ریاست کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کی ذمہ دار بن گئی تو وہ بھی ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد میں شریک ہونے کو آمادہ ہے لیکن کارنوالس اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس پر مہادجی کمپنی کا مخالف ہو گیا اور ۱۷۹۲ء میں پونا آیا تاکہ پیشوا کو انگریزوں کے خلاف اکسائے۔ پونا آنے سے قبل اس نے بادشاہ شاہ عالم سے پیشوا کے لیے خلعت اور سند حاصل کر لی تاکہ وہاں پہنچ کر اپنی اہمیت جتلائے چنانچہ سند اور فرمان کے استقبال کے لیے پونا میں بڑا دربار ہوا۔ نانا فرنویس اگرچہ سندھیا کے سب داؤں گھات سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اندور کے تکوجی ہلکر کو اکسایا کہ سندھیا کے علاقے پر حملہ کر دے تاکہ سندھیا پونا سے اپنے علاقے کو واپس چلا جائے لیکن ڈے بوئن نے تکوجی کو نیچا دکھلا دیا۔ آہستہ آہستہ مہادجی نے پیشوا مادھوراؤ پر اپنا اثر قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس نے پیشوا کو یقین دلایا کہ اگر انگریزوں کو شکست دے دی

جائے تو پورا شمالی ہند اس کے قبضے میں آجائے گا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ٹیپو سلطان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہییں تاکہ وہ جنوبی ہند سے انگریزوں کو بے دخل کر دے۔ لیکن یہ منصوبے پورے نہ ہونے پائے کیونکہ ۱۲ر فروری سنہ ۱۷۹۴ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ دولت راؤ سندھیا اس کا جانشین ہوا۔ مادھوجی سندھیا نے ۲۵ سال حکومت کی۔ اس کو ورثہ میں چھوٹی سی ریاست ملی تھی لیکن اس نے مرتے وقت ستلج سے الہ آباد تک وسیع مقبوضات چھوڑے جن میں دو ثلث مالوہ اور دکن کے نہایت زرخیز ضلع بھی شامل تھے۔

مہادجی سندھیا کے انتقال کے بعد نانا فرنویس پھر مرہٹہ سیاست پر چھا گیا۔ اس نے اپنے اثر کو بڑھانے کے لیے سرکار نظام کے خلاف جنگ کے منصوبہ میں دوسرے مرہٹہ سرداروں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا اور یقین دلایا کہ چوتھ اور سردیشمکھی کی بقایا رقم وصول ہوگی اس میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے گا۔ چنانچہ دولت راؤ سندھیا، تکوجی ہلکر، راگھوجی بھونسلا اور گووند راؤ گیکواڑ نے اپنے اپنے حصے کی فوجیں دکن پر چڑھائی کیلئے روانہ کیں۔

کھرڈلا کی جنگ

سنہ ۱۷۹۳ء کے بعد جب نانا فرنویس نے پیشوا کی طرف سے چوتھ اور سردیشمکھی کا سختی سے مطالبہ کیا تو سرکار نظام نے انگریزی حکومت سے حسب وعدہ امداد طلب کی۔ لیکن جان شور عدم مداخلت کی حکمت عملی کا حامی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریزوں میں ابھی اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ مرہٹوں کی متحدہ افواج کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر اس کو یہ ڈر بھی تھا کہ اگر وہ سرکار نظام کی مدد کا وعدہ کرے تو کہیں پیشوا اور دوسرے مرہٹہ سردار ٹیپو سلطان سے انگریزوں کے خلاف ایکا نہ کر لیں۔ غرض کہ سرکار نظام اور مرہٹوں کی کشیدگی برابر بڑھتی گئی۔ کئی مہینے تک گفت و شنید ہوتی رہی لیکن جب دونوں میں سے کوئی سمجھوتے پر آمادہ نہ ہوا تو سوائے جنگ کرنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ انگریزی ریذیڈنٹ کپتان کرک پیٹرک نے صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ انگریزی پلٹنوں کو ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے استعمال کرنے کی اجازت دے سکتا ہے تاکہ اس وقت

جب کہ سرکارِ نظام کی فوجیں مرہٹوں سے نبرد آزما ہوں تو ملک میں اندرونی ابتری نہ پیدا ہو۔ نواب میر نظام علیخاں نے جب دیکھا کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے انگریزی فوج کو نہیں استعمال کر سکتے تو انھوں نے ریزیڈنٹ کرک پیٹرک کو کہلا بھیجا کہ ممالک محروسہ میں جس قدر انگریزی فوج ہے اس کو واپس بھیج دیا جائے۔ نواب موصوف نے اپنی فوج کی تربیت کا کام ایک فرانسیسی افسر موسیو ریموں کے سپرد کر دیا جس نے بیدر کو اپنا فوجی مرکز قرار دیا۔ چونکہ اس زمانے میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں زبردست جنگ چھڑی ہوئی تھی اس لیے انگریزی ریزیڈنٹ کرک پیٹرک نے ہر چند کوشش کی کہ سرکار نظام فرانسیسی اثر میں نہ آئیں لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ موسیو ریموں کی وجہ سے دربار حیدرآباد میں فرانسیسی اثر کا بڑھنا بالکل قدرتی بات تھی۔

۱۷۹۵ء کے شروع میں مرہٹوں کی تقریباً ایک لاکھ ۲۵ ہزار متحدہ فوج دولت آصفیہ کے شمال مغربی علاقوں کی طرف بڑھی۔ اس فوج میں سے ۲۵ ہزار فوج دولت راؤ سندھیا کی بھیجی ہوئی تھی جس کی تربیت ڈی بوائن اور پیرون کے سے قابل فرانسیسی افسروں نے اعلیٰ پیمانہ پر کی تھی۔ اس میں ناگپور کے بھونسلا راجا کی ۱۵ ہزار اور ہلکر کی دس ہزار فوج بھی شامل تھی۔ سرکار نظام کی طرف سے ۱۰ ہزار بے قاعدہ اور موسیو ریموں کی ۱۵ ہزار باقاعدہ فوج تھی۔ لطف یہ کہ مرہٹوں کی فوج کے ساتھ پونا کا انگریز ریزیڈنٹ مسٹر میلٹ اور سرکار نظام کی فوج کے ساتھ حیدرآباد کا انگریز ریزیڈنٹ کرک پیٹرک بھی تھا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ دریائے مانجرا کے قریب ہوا۔ پیروں اور ریموں کی فوجوں کا ٹکراؤ پڑا۔ سرکار نظام کی فوج سے پہلے مرہٹوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن مرہٹوں نے سرکار نظام کے بعض افسروں کو رشوت دے کر ملا لیا جس کے سبب سے دولت آصفیہ کو زک اٹھانی پڑی (۱) نواب میر نظام علیخاں مارچ ۱۷۹۵ء

(۱) گلزار آصفیہ ـ صفحہ ۱۸۹

میں کھرڈلا کے قلعہ میں ٹھیر گئے جس کا مرہٹوں نے محاصرہ کرلیا۔ کئی ہفتے تک محاصرہ جاری رہا اور رسد کی قلت کی وجہ سے سرکار نظام کو بڑی پریشانی ہوئی۔ آخر میں راؤ رمبھا کے توسط سے مصالحت ہوگئی۔ سرکار نظام کو اپنی سلطنت کے مغربی ضلعوں کا بہت سا حصہ دریائے تاپتی سے قلعہ پرینڈہ تک مرہٹوں کے حوالہ کرنا پڑا جس میں دولت آباد، احمد نگر اور شولاپور کے ضلعے شامل تھے۔ ان علاقوں کی مجموعی آمدنی ۳۵ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ اسکے علاوہ تین کروڑ روپے کا تاوان جنگ پیشوا کو اور رگھوجی بھونسلا کو ۲۹ لاکھ کا چوتھ کا بقایا ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ تین کروڑ میں سے ایک کروڑ کی رقم فوراً اور باقی قسطوں سے ادا کرنا طے ہوا۔ اس رقم کی ادائی کی ضمانت میں اعظم الامراء ارسطو جاہ کو بطور یرغمال پونا بھیجنا پڑا۔

سر جان شور کی حکمت عملی یعنی عدم مداخلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ انگریزی اثر کا دربار حیدرآباد میں خاتمہ ہوگیا۔ موسیو ریموں نے سرکار نظام کی فوجوں کی از سر نو تنظیم شروع کردی۔ نواب میر نظام علیخاں نے کڑپہ کے قریب اس کو فوج کے اخراجات کی بابجائی کے لیے ۱۸ لاکھ روپیے سالانہ کی جاگیر عنایت کی اور اژدر الدولہ کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا۔ جب موسیو ریموں نے کڑپہ میں فرانسیسی فوج رکھی تو انگریزی حکومت بہت برہم ہوئی اس واسطے کہ یہ مقام احاطۂ مدراس کی سرحد پر واقع تھا۔ انگریزی ریزیڈنٹ کرک پیٹرک نے ہر چند کوشش کی کہ انگریزی اثر کو دربار حیدرآباد میں پھر سے قائم کرے لیکن کچھ عرصہ تک کامیابی نہیں ہوئی اس کی پوری ذمہ داری سر جان شور کی حکمت عملی پر تھی جو اس کے لیے تو تیار تھا کہ اگر ٹیپو سلطان سرکار نظام کے خلاف حملہ آور ہو تو سرکار نظام کی مدد کرے لیکن اگر مرہٹے حملہ کریں تو عدم مداخلت کی آڑ لے کر غیر جانبدار رہے۔ کارنوالس نے تیسری جنگ میسور ٹیپو سلطان کے خلاف اس بناء پر شروع کی تھی کہ اس نے انگریزوں کے حلیف راجا ٹراونکور کے علاقوں پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا تھا۔ سرکار نظام بھی انگریزوں کے حلیف تھے کیا اسی قسم

کا استدلال ۔ مرہٹوں کے سرکار نظام کے علاقوں پر حملہ کرنے کی صورت میں حق بجانب نہ ہوتا ۔ لیکن سر جان شور کے پیش نظر اصول سے زیادہ اپنی سہولت تھی ۔ کمپنی اس وقت مرہٹوں سے الجھنا نہیں چاہتی تھی ۔ اور نانا فرنویس کو سرکار نظام کے خلاف مرہٹہ اتحاد قائم کرتے وقت پورا یقین تھا کہ کمپنی غیر جانبدار رہے گی ورنہ وہ ریاست حیدرآباد پر حملہ کی جراءت نہ کرتا ۔

۱۷۹۵ء میں پیشوا مادھو راؤ کے بے وقت انتقال پر دربار پونا میں آپس کے جھگڑے زور شور سے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ کہا جاتا ہے کہ پیشوا نے جو ان پابندیوں کو عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا تھا جو نانا فرنویس نے اس پر عاید کر رکھی تھیں اپنے بالاخانہ پر سے گر کر جان دی ۔ اس کے مرنے کے بعد رگھوبا کے لڑکے باجی راؤ دوم کو مرہٹہ سرداروں نے پیشوا بنا دیا ۔ نانا فرنویس نے نوجوان باجی راؤ کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ باجی راؤ نے دوسرے مرہٹہ سرداروں سے مل کر نانا فرنویس کو قید کرا دیا ۔ مگر اس کے بعد بھی دربار پونا میں سازشوں کا جال بچھا رہا اور مرہٹوں کی قوت آپس کے جھگڑوں سے کمزور ہو گئی ۔ ارسطو جاہ نے اپنے پونا کے قیام کے دوران میں ان اختلافات سے پورا فائدہ اٹھایا ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھیں اسی لیے رہا کر دیا گیا کہ مرہٹہ سرداروں کو شبہ ہو گیا تھا کہ ان اختلافات کی تہ میں ارسطو جاہ کا بھی ہاتھ ہے جن کے تعلقات دولت راؤ سندھیا سے بہت گہرے ہو گئے تھے ۔ انھیں تعلقات کے اثر سے اور کچھ پیشوا اور بھونسلا کی مخالفت کے باعث دولت راؤ سندھیا نے کوشش کر کے محمد آباد بیدر کے چوتھ کی معافی ارسطو جاہ کو دلوا دی ۔ نواب ارسطو جاہ اعظم الامراء تین سال پونا میں رہے اور اس کے بعد رہا کر دئے گئے ۔ نواب میر نظام علیخاں نے دربار پونا اور دوسرے مرہٹہ حکمرانوں کے اختلافات سے خوب فائدہ اٹھایا اور جو علاقے کھرڈلا کی جنگ کے بعد ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے وہ اپنی حکمت عملی سے پھر حاصل کر لیے اور تین کروڑ کے تاوان میں سے صرف ۵۷ ہزار روپے ادا کئے ۔

اودھ کارنوالس کے عہد میں نواب اودھ اور کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں نواب کو یقین دلایا گیا تھا کہ کمپنی کی حکومت اس کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ دے گی اور نہ فوجی اخراجات کے ضمن میں مطالبات کیے جائیں گے لیکن شور نے دو رجمنٹوں کے خرچ کا مزید بار اودھ کے خزانہ پر ڈالا۔ ۱۷۹۷ء میں شور خود لکھنؤ گیا اور ریاست کی بدنظمی کی اصلاح کی ضرورت نواب آصف الدولہ کے ذہن نشین کرائی اور تفضل حسین خاں کو جو انگریزوں کا موافق تھا وزیر اعظم مقرر کیا۔ نواب نے بادل ناخواستہ اس مداخلت کو برداشت کیا شور کے کلکتہ واپس ہونے کے چھ ہفتے بعد نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوگیا اور وزیر علی اس کا جانشین ہوا جس کی گدی نشینی حکومت ہند نے بھی تسلیم کرلی۔ لیکن اودھ میں عام طور پر وزیر علی کی جانشینی کو ناپسند کیا گیا۔ اگرچہ آصف الدولہ نے اپنی کوئی اولاد نہ ہونے سے اس کو اپنا بیٹا بنایا تھا لیکن اس کی طینت خراب تھی۔ سعادت علی خاں نے جو نواب آصف الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا اور بنارس میں رہا کرتا تھا کلکتہ کی حکومت کو اپنے موافق کرنے کی کوشش کی تاکہ وزیر علی کو گدی سے الگ کرکے اس کو نواب بنایا جائے۔ اس نے کمپنی کو مزید مراعات دینے کا بھی وعدہ کیا۔ چنانچہ سر جان شور دوبارہ لکھنؤ گیا اور انگریزی سنگینیوں کے بل پر وزیر علی کو الگ کرکے سعادت علیخاں کو اودھ کی گدی پر بٹھایا۔ نئے نواب سے گدی نشینی کے وقت نئے معاہدے پر دستخط کرائے گئے جس کی رو سے طے ہوا کہ ملک کی حفاظت کی ذمہ دار کمپنی ہوگی۔ انگریزی فوج کے اخراجات کے لیے وہ سالانہ ۷۶ لاکھ روپے کمپنی کو ادا کیا کریگا۔ معمولاً دس ہزار کمپنی کی فوج اودھ میں رہے گی لیکن ضرورت کے وقت اس کی تعداد میں اضافہ کیا جاسکے گا۔ اگر اضافہ ہوگا تو اخراجات کے لیے مزید رقم کی ادائیگی اودھ کے خزانہ سے ادا کی جائے گی۔ نواب اندرونی نظم و نسق کے لیے ۳۵ ہزار سے زاید فوج نہ رکھے گا۔ قلعہ الٰہ آباد جو ممالک مغربی و شمالی کی کنجی سمجھا جاتا تھا کمپنی کے حوالے کردیا جائے گا۔ نواب نے

یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ کسی دوسری حکومت کے ساتھ نامہ و پیام نہیں کرے گا اور بغیر کمپنی کی اجازت کے نہ کسی یوروپین کو اپنی فوج میں ملازم رکھے گا اور نہ اپنے ملک میں اجازت دے گا۔ وزیر علی کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور بنارس میں رہنے کی اس کو اجازت دے دی گئی۔ معاہدہ کی رو سے نظم و نسق کی عام نگرانی بھی کمپنی نے اپنے ذمہ کرلی تاکہ آئندہ انتظامی ابتری نہ پیدا ہو۔ غرضکہ تمام عملی اغراض کے مدنظر اس معاہدہ کے موجب ریاست اودھ کی رہی سہی آزادی کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ انگریز مورخوں کا بیان ہے کہ سرجان شور کو یہ ڈر تھا کہ کابل کے حکمران زمان شاہ نے اگر اودھ کا رخ کیا تو نواب اودھ کی فوج میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اس کے حملہ کی تاب لا سکے۔ زمان شاہ نے لاہور تک کے تمام علاقے پر قبضہ کرلیا تھا لیکن افغانستان کی اندرونی گڑبڑ اور اپنی مغربی سرحد پر ایرانیوں کے حملے کی وجہ سے اس کو واپسی پر مجبور ہونا پڑا۔ اب انگریزی مفاد اسی میں تھا کہ وہ اودھ کی ریاست کو اس طرح برقرار رکھے کہ بجائے خطرہ کے وہ ضرورت کے وقت مددگار ثابت ہو۔ اس کی صورت یہی تھی کہ وہ وہاں کے نظم و نسق کی عام نگرانی اپنے ذمے لے لے اور نواب کی فوج کو جو بالکل ناکارہ تھی کم کرکے کمپنی کی فوج کو بڑھا دے جو اودھ کی حفاظت کی ذمہ دار ٹھہرے۔

سرجان شور کی حکومت کے آخری زمانے میں بنگال کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج اور شاہی فوج کے افسروں میں اپنے رتبے اور تنخواہ کے متعلق سخت اختلافات شروع ہوگئے۔ چنانچہ کمپنی کے افسروں نے کھلم کھلا حکومت کی حکم عدولی شروع کردی۔ ڈنڈاس اور کارنوالس چاہتے تھے کہ کمپنی کی فوج اور شاہی فوج کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے لیکن اس خیال کو پورے طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ سرجان شور کمزور شخص تھا۔ فوجی افسروں کے ان اختلافات سے گھبرا گیا۔ اس میں کلائیو کی سی ہمت اور جوانمردی نہیں تھی کہ اپنی قوت ارادی سے حالات پر قابو پاتا۔ اس نے کمپنی کے افسروں کی تنخواہ اور بھتہ میں اضافہ کرکے انھیں رضامند کرنے کی

کوشش کی۔ شور کی اس کمزور پالیسی سے فوج کے نظم و ضبط پر بہت برا اثر پڑا۔ چنانچہ بورڈ آف کنٹرول نے اس کے طرز عمل کو ناپسند کیا۔ اس کی جگہ لارڈ ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا جس نے ۱۷۹۸ء میں اپنی خدمت کا جائزہ حاصل کیا۔ سر جان شور کو اس کی خدمات کے صلہ میں لارڈ ٹیگن ماؤتھ کا خطاب دیا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے وارن ہیسٹنگز کی طرح اس کا مواخذہ کرنے کی بھی تجویز پیش کی لیکن پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

آٹھواں باب

لارڈ ولزلی اور عہدِ معاونت

ہندوستان آنے سے پہلے مارکوئس ولزلی (لارڈ مارنگٹن) چار سال تک بورڈ آف کنٹرول کا رکن رہ چکا تھا اور اس لیے ہندوستانی معاملات کا اس کو پورا علم تھا۔ مسٹر پٹ سے اس کے شخصی تعلقات تھے اور مسٹر ڈنڈاس کو اس کی قابلیت پر پورا بھروسا تھا۔ انگلستان سے ہندوستان آنے وقت وہ راس امید (کیپ آف گڈ ہوپ) پر اترا اور یہاں اسے لارڈ ہبرٹ اور میکارٹنی سے ملنے کا موقع ملا جو دونوں مدراس کے گورنر رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ یہیں اس کی میجر کرک پیٹرک سے بھی ملاقات ہوئی جو سندھیا اور سرکار نظام کے دربار میں ریزیڈنٹ رہ چکا تھا اور دیسی والیان ملک کے معاملات کا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ ان سب سے ولزلی کو ہندوستان کے نئے حالات معلوم ہوئے۔ ولزلی نے ارادہ کر لیا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے وہ ٹیپو سلطان اور اس کی سلطنت کا خاتمہ کرے گا اس لیے کہ اس سے بڑھ کر اس وقت انگریزوں کا اور کوئی دشمن ہندوستان میں نہیں۔ ولزلی نہایت حوصلہ مند شخص تھا۔ وہ انگریزی حکومت کی سیادت کو سارے ملک میں منوانا چاہتا تھا تاکہ کمپنی کی حکومت کا کوئی حریف باقی نہ رہے اور جو دیسی

والیان ملک باقی رہیں بھی تو وہ کمپنی کی طاقت کے آگے سر جھکا دیں۔ جب وہ ہندوستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ہر طرف کمپنی کے خلاف بے اعتمادی پھیلی ہوئی ہے۔ سر جان شور کی عدم مداخلت کی حکمت عملی سے دیسی والیان ملک کو کمپنی کے وعدوں پر اعتبار نہیں رہا تھا اور جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف جوڑ توڑ کر رہا تھا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف زمان شاہ والی افغانستان اور سلطان ترکی سے فوجی امداد طلب کی۔ اس زمانے میں نپولین بوناپارٹ شہنشاہ فرانس نے سارے یورپ پر اپنی دھاک بٹھا دی تھی اور وہ مشرقی ملکوں کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ مصر میں تھا تو ٹیپو سلطان نے اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ نپولین چاہتا تھا کہ ایران کی طرف سے بڑھ کر خشکی کے راستے سے ہندوستان پر حملہ کرے لیکن بعض ضروری کاموں کی وجہ سے اسے فرانس واپس جانا پڑا۔

میسور کی تیسری لڑائی کے بعد ٹیپو سلطان اپنی قوت کو بڑھانے اور انگریزوں سے مقابلہ کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دارالحکومت کی قلعہ بندی میں اضافہ کیا۔ فوج کی جدید تنظیم کی اور اپنے سفیر ماریشس روانہ کیے تاکہ انگریزوں کے خلاف امداد حاصل کرے۔[1] ولزلی چاہتا تھا کہ ہندوستان پہنچنے کے بعد فوراً ٹیپو کے خلاف جنگ شروع کر دے تاکہ مالابار کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر کے سرنگا پٹم پر چڑھائی کر دی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے ہاں ایک برٹش ریزیڈنٹ رکھے اور جتنے فرانسیسی اس کی ملازمت میں ہیں انہیں الگ کر دے۔ لیکن حکومت مدراس نے اس منصوبہ کی مخالفت کی اور کہا کہ اس کی فوجیں چھ مہینے سے پہلے لڑائی کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں۔ جنرل ہیرس نے بھی فوری جنگ کی مخالفت کی اور کہا کہ ٹیپو سلطان کو موقع دینا چاہیے کہ اگر وہ چاہے تو انگریزی حکومت کے معاملات کی یکسوئی کر لے۔ چنانچہ ولزلی اس وقت خاموش ہو گیا اگرچہ اس کو افسوس رہا کہ وہ فوراً اپنے منصوبہ کو

Martin, Wellesley's Despatches, Vol. 1, p. 55, - [1]

عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔

اس دوران میں ولزلی نے مرہٹوں اور نظام سے اتحادِ ثلاثہ کی تجدید کی کوشش شروع کردی۔ سر جان شور کی عدم مداخلت کی حکمت عملی کے سبب سے نواب میر نظام علیخاں انگریزی حکومت سے آگتا گئے تھے اور انھوں نے اپنی فوج کی تربیت اور تنظیم کا پورا کام موسیو ریموان کے سپرد کردیا تھا۔ لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں موسیو ریمون کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ موسیو پیرون فرانسیسی فوج کا قائد مقرر ہوا۔ اس میں ریمون کی سی قیادت کی صفتیں موجود نہ تھیں اور نواب میر نظام علیخاں کو بھی اس پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے پیرون کی سرکردگی میں دکن کے سیاسی معاملات میں جو دخل اندازی شروع کردی تھی وہ امرائے دکن کو سخت ناگوار تھی۔ خاص طور پر اعظم الامرا ارسطو جاہ فرانسیسیوں کے سخت مخالف ہوگئے تھے[1]۔ غرضکہ یہ سب حالات ایسے تھے جن سے ولزلی پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ولزلی کو اس کی بھی اطلاع تھی کہ ٹیپو سلطان نے سرکار نظام سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کردیا ہے اور نواب میر نظام علیخاں کے بھتیجے امتیاز الدولہ کے توسط سے وہ دولت آصفیہ کے ساتھ سیاسی تعلقات قایم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ولزلی کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ ریاست حیدرآباد میں جو فرانسیسی فوج ہے وہ انگریزوں کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے نواب میر نظام علیخاں سے صلح و صفائی کرنی چاہی اور یقین دلایا کہ سر جان شور کی حکمت عملی سے انھیں جو شکایتیں پیدا ہوگئی ہیں آئندہ کبھی ان کی نوبت نہ آئیگی

سرکار نظام سے معاہدہ

ٹیپو سلطان کے خلاف فوجی اقدام کرنے سے پہلے ولزلی نے یہ ضروری خیال کیا کہ سرکار نظام سے نامہ و پیام کے ذریعہ معاملات کی یکسوئی کرلے۔ نواب ارسطو جاہ اور

---

[1] ۔ حدیقۃ العالم۔ جلد ۲ صفحہ ۴۱۴

سر عالم فرانسیسی اثر کے بیحد مخالف تھے جو پچھلے دنوں سر جان شور کی ناعاقبت اندیش حکمت عملی کی وجہ سے انھیں دربار حیدرآباد میں حاصل ہو گیا تھا۔ دراصل ارسطو جاہ[3] نے سر جان شور سے نامہ و پیام کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ فرانسیسی پلٹنوں کی جگہ ایک انگریزی امدادی فوج ریاست حیدرآباد میں رہے لیکن سر جان شور اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ ولزلی نے حیدرآباد کے انگریز ریزیڈنٹ کپتان جیمس کرک پٹرک کو ہدایات بھیجیں کہ وہ ارسطو جاہ سے فوراً گفت و شنید شروع کر دے۔ چنانچہ یکم ستمبر ۱۷۹۸ء سرکار نظام اور کمپنی میں ایک معاہدے کی رو سے طے ہوا کہ فرانسیسی افسروں کو جو ممالک محروسہ میں ہوں انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ اور فرانسیسی پلٹنوں کو الگ کر کے ان کی جگہ انگریزی چھ پلٹنیں فی پلٹن ایک ہزار جوان اور ایک رجمنٹ پانچ سو سواروں کی اور توپ خانہ ممالک محروسہ میں رہے گا۔ اس اعانتی فوج اور توپ خانہ کا خرچہ چوبیس لاکھ سترہ ہزار روپے سالانہ قرار پایا جس کا بار دربار حیدرآباد پر رہے گا[1]۔ یہ بھی طے ہوا کہ سرکار نظام آیندہ کسی یورپین کو اپنے ہاں کمپنی سے بے پوچھے ملازم نہیں رکھے گی۔ سرکار نظام اور مرہٹوں میں جو اختلافی مسائل ہوں گے اُن کا انگریزی حکومت پنچ بن کے تصفیہ کر دے گی۔ اگر مرہٹے کمپنی کے تصفیے کو ماننے سے انکار کریں تو انگریزی حکومت دولت آصفیہ کی حفاظت کی ذمہ دار ہو گی[2]۔

ولزلی نے یہ محسوس کیا کہ اگر سرکار نظام نے فرانسیسی سپاہ کو برطرف کر دیا اور مرہٹوں نے اس کے بعد میدان خالی پاکر ممالک محروسہ سرکار عالی کے سرحدی علاقوں پر چڑھائی کی تو کمپنی کی طرف سے سرکار نظام کو اس بات کا اطمینان دلانا ضروری ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے گی۔ جس کی ذمہ داری کو اپنے اوپر لینے کی جرأت سر جان شور میں نہ تھی اس کی تکمیل ولزلی نے کر دی۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ جب تک سرکار نظام کو اس کی حفاظت

۱۔ Aitchison, Vol. IX, p. 49.

۲۔ Aitchison, Vol. IX, p. 50.

۳۔ Fraser, Our faithful Ally the Nizam, p. 216.

کا یقین نہ دلا دیا جائے وہ کمپنی کے ساتھ ٹیپو سلطان کے خلاف کسی مہم میں دل کھول کر حصہ نہیں لے سکتی۔ اُس کا امکان تھا کہ سرکار نظام اپنی فوجیں کمپنی کی فوجوں کے ساتھ ٹیپو سلطان کے خلاف بھیج دے اور ادھر مرہٹے ممالک محروسہ کی شمالی مغربی سرحد پر چڑھائی کر دیں۔ اس معاہدہ میں اگرچہ مرہٹوں کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا لیکن ممالک محروسہ کے تحفظ کا یقین دلا یا گیا۔ اس معاہدہ کی تمہید میں وضاحت کی گئی کہ کمپنی اور سرکار نظام کی حکمت عملی اور مفاد ایک ہے اور دونوں کی دوستی کا اقتضا یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی وقت پر مدد کرے[1]

پیشوا اور ولزلی

ولزلی جانتا تھا کہ جس طرح سرکار نظام سے معاہدہ کے ذریعہ یکسوئی ہو گئی ہے اسی طرح پیشوا باجی راؤ سے بھی صلحنامہ ہو جائے۔ پیشوا نے بھی ولزلی کے ہندوستان آنے سے پہلے سر جان شور سے سندھیا کے خلاف فوجی امداد طلب کی تھی لیکن شور نے مرہٹوں کے آپس کے جھگڑوں میں کسی کا بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ پیشوا نے نواب میر نظام علیخاں سے اتحاد کر لیا جس کی رو سے آٹھ لاکھ سالانہ کا علاقہ سرکار نظام کو واپس دیدیا گیا تھا۔ اس پر سندھیا نے ٹیپو سلطان سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور اُس کو ممالک محروسہ پر حملہ کرنے کے لیے ابھارا۔ ولزلی کے ہندوستان پہنچنے کے وقت پیشوا اور سندھیا کے تعلقات میں ظاہری طور پر یکسوئی ہو گئی تھی۔ اس لیے پیشوا کو جب ولزلی نے عہد معاونت کی شرطیں پیش کیں تو اس نے انھیں غیر ضروری بتایا اور وعدہ کیا کہ اگر کمپنی کی حکومت ٹیپو سلطان کے خلاف لڑے تو اتحاد ثلاثہ کے بموجب مرہٹے اسکی امداد کرینگے۔

میسور کی چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء

جب ولزلی کو یہ اطلاع پہنچی کہ حیدرآباد کی فرانسیسی فوج کو ناکم اور کرک پیٹرک

---

[1] Martin, Wellesly's Despatches, Vol. II. p. 70

نے بڑی خوبی سے بغیر ایک قطرہ خون بہائے نہتا کر دیا تو اس نے اپنا پہلا مراسلہ ٹیپو سلطان کے نام روانہ کیا جس میں اس سے اس سفارت کے متعلق شکایت کی گئی تھی جو اس نے ماریشیس کے فرانسیسی گورنر کے پاس امداد طلب کرنے کے لیے روانہ کی تھی۔ ولزلی نے لکھا کہ چونکہ اس نے برطانوی قوم کے دشمنوں سے میل ملاپ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے اس نے اس اتحاد کی خلاف ورزی کی جو کارنواس کے عہد میں ہوا تھا۔ اس مراسلہ میں ولزلی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ میجر ڈوٹن کو ٹیپو سلطان کے دربار میں بہ حیثیت وکیل بھیجا جائے گا تاکہ دونوں حکومتوں کے درمیان شکوک اور شبہے آسانی سے رفع ہو جایا کریں اور معاملے طول نہ کھینچا کریں۔ اس مراسلہ کے لکھنے کے بعد ولزلی خود مدراس گیا تاکہ تمام سیاسی اور فوجی معاملات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے اور گورنر مدراس کے ذمہ صرف مقامی انتظامات رہیں۔ یہ اس نے اس واسطے کیا کہ اسے ڈر تھا کہ حکومت مدراس اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں پوری طرح سے مدد نہیں کرے گی۔ ولزلی کے خط کا ٹیپو سلطان نے یہ جواب دیا کہ جو جہاز مغربی ساحل سے ماریشیس گیا ہے وہ تجارتی تھا۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں کہ اس نے اس میں سفارت بھیجی تھی۔ واپسی پر ۴۰ ماریشیس کے باشندے اس سلطنت میں ملازمت کی تلاش میں آئے تھے جن میں سے دس بارہ کو ملازمت دیدی گئی۔ میجر ڈوٹن کے میسور بھیجے جانے کو ٹیپو سلطان نے بے ضرورت بتایا۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد ولزلی نے ۹ر جنوری ۱۷۹۹ء دوسرا مراسلہ بھیجا جس میں میجر ڈوٹن کے میسور بھیجے جانے پر اصرار کیا اور فوراً جواب کا مطالبہ کیا۔ جب اس کا جواب نہ ملا تو ولزلی نے ۲۲ فروری ۱۷۹۹ء ٹیپو سلطان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ لڑائی بہت دنوں تک نہیں چلی۔ صرف تین مہینوں میں اس کا فیصلہ ہو گیا۔ کمپنی کی فوج جنرل ہیرس کی کمان میں بیس ہزار سے اوپر تھی جس نے مشرق کی طرف سے حملہ کیا۔ اس کے ساتھ دس ہزار سوار حیدرآباد کی امدادی فوج کے اور چھ ہزار حیدرآباد کی انگریزی

حمایتی فوج تھی جو کپتان جان مالکم کے تحت اور کرنل آرتھر ولزلی کی نگرانی میں تھی جو گورنر جنرل کا چھوٹا بھائی اور بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا۔ مغربی سرحد کی طرف سے بمبئی کی فوج نے جنرل اسٹورٹ کی ماتحتی میں حملہ کیا۔ بمبئی کی فوج نے پہلے سدیسور کے مقام پر ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ اسی دوران میں جنرل ہیرس نے منگلور پہنچ کر سرنگا پٹم کا رخ کیا۔ ملولی کے مقام پر جنرل ہیرس نے ٹیپو سلطان کی فوج کو پیچھا دکھایا اور دریائے کاویری کو پار کر کے بمبئی کی فوج سے مل گیا۔ مدراس اور بمبئی کی فوجوں نے جن کے ساتھ سرکار نظام کی فوج بھی تھی سرنگا پٹم کا محاصرہ ۶ اپریل ۱۷۹۹ء کو کر لیا۔ ٹیپو سلطان نے صلح کے نامہ و پیام شروع کیے لیکن ولزلی نے جو شرطیں پیش کیں وہ ایسی کڑی تھیں کہ انھیں قبول کرنا اس کی حمیت نے گوارا نہ کیا۔ ولزلی چاہتا تھا کہ ٹیپو سلطان اپنی رہی سہی سلطنت میں سے نصف انگریزوں کے حوالے کر دے اور دو کروڑ روپے تاوان ادا کرے اور اپنے چار بیٹوں کو یرغمال کے طور پر حوالے کر دے۔ سلطان نے ان شرطوں کو نہ مانا اور آخری وقت تک مقابلہ کی ٹھان لی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو انگریزی فوج نے بڑے زور شور سے گولے برسائے اور فصیل میں شگاف ڈال کر قلعہ کے اندر داخل ہو گئی۔ ٹیپو سلطان آخری وقت تک بڑی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۶ سال تھی اس کو حیدر علی کے مقبرہ کے قریب دفن کیا گیا۔

سرنگا پٹم کی تسخیر کے بعد انگریزوں نے تمام سلطنت میسور کے حصے بخرے کر دئے۔ مرہٹے اگرچہ انگریزوں کے اتحادی تھے لیکن چونکہ انھوں نے جنگ میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا اور پیشوا عہد معاونت کے لیے تیار نہ تھا اس لیے انھیں کوئی علاقہ نہیں دیا گیا۔ پیشوا کے حصے میں سے دو ثلث سرکار نظام کو اور ایک ثلث کمپنی کو ملا۔ سلطنت میسور کا تقریباً نصف علاقہ کرشنا راج وڈیار کو دیا گیا اور اس کو معاہدے کے ذریعے انگریزی حکومت نے اپنے تحت لے لیا۔ ایک تجربہ کار برہمن پورنیا کو اس کا دیوان مقرر کیا گیا۔ میسور کی یہ نئی ریاست کمپنی نے کرشنا راج وڈیار کو بطور عطیہ دی اور اس

شرط کا بھی اظہار کر دیا گیا کہ یہ عطیہ شخصی ہے خاندانی نہیں۔ چنانچہ جو معاہدہ کیا گیا اس میں جانشینوں اور وارثوں کا جان بوجھ کر کوئی ذکر نہیں۔ باقی علاقے میں سے کمپنی نے کنارا اور کوئمبٹور کے اضلاع کے علاوہ مالابار اور کرناٹک کا درمیانی علاقہ پر قبضہ جمایا۔ کمپنی نے جو علاقے حاصل کیے ان سب کی آمدنی تیس لاکھ روپیے سالانہ تھی۔ سرکار نظام کو گوٹی اور گرم کنڈہ کے اضلاع ملے[1] جن میں چتل درگ، نندی درگ اور کولار کے قلعے شامل تھے۔ سرنگاپٹم کی لوٹ میں ایک کروڑ سے زائد مالیت کا سامان اور زر و جواہر ولزلی نے فوج میں تقسیم کرا دیے۔ ٹیپو کے خاندان کے لوگوں کے لیے جنھیں ویلور میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ آٹھ لاکھ سالانہ کے وظیفے مقرر کیے گئے جن کی ادائی کمپنی نے اپنے ذمہ لی۔ چوتھی جنگ میسور کے بعد جنوبی ہند میں انگریزی تسلط قایم ہو گیا اور گزشتہ تیس سال سے انگریزی حکومت کو میسور کے حکمرانوں سے جو خدشہ لگا ہوا تھا وہ جاتا رہا۔ اس خدشہ کے مٹ جانے سے انگریزوں کے خلاف جنوبی ہند میں فرانسیسی سازش کا کوئی مرکز باقی نہ رہا جس کی آڑ لے کر وہ اپنے تسخیر ہند کے منصوبوں کو آگے بڑھا سکتے۔

عہد معاونت کا اصول میسور کی طرف سے اطمینان کے بعد ولزلی نے عہد معاونت کے اصول پر عمل کرنے اور مختلف دیسی ریاستوں کو برطانوی سیادت کے تحت لانے کی کوشش شروع کی۔ دراصل عہد معاونت کا اصول ولزلی نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں رائج نہیں کیا۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد حکومت میں اودھ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا وہ اسی طرح کا تھا۔ چنانچہ اس کے بموجب اودھ میں انگریزی فوج رہتی تھی جس کے ذمہ ملک کی حفاظت اور مدافعت تھی اور جس کے اخراجات کا بار نواب وزیر کے خزانہ پر تھا۔ اس کے علاوہ وارن ہیسٹنگز کے زمانے ہی میں انگریز ریذیڈنٹ بھی لکھنؤ

[1] Owen. The Wellington Despatches, p 136; Briggs. The Nizam, appendix, p. 267-297).

میں مقرر کر دیا گیا تھا جو نواب وزیر کو کمپنی کی حکومت کے منشاء سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن وارن ہیسٹنگز نے جس طریق کار کی ابتدا کی تھی اس کی تکمیل ولزلی نے کی۔ اس اصول کو رواج دینے سے ایک فائدہ یہ تھا کہ ولزلی کمپنی کی فوجی حدود کو اس کی سیاسی حدود سے آگے بڑھا دینا چاہتا تھا تاکہ ہندوستان کا ہر ایک حصہ انگریزی سیادت اور بالادستی کو تسلیم کر لے۔ اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ کمپنی کی بے اجازت دیسی والیان ملک آپس میں کوئی سیاسی اتحاد نہیں کر سکتے جو آئندہ کبھی کمپنی کے مفاد کے لیے مضر ہو۔ چنانچہ آئندہ وہ کمپنی کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قایم نہ کر پائے اس لیے کہ ہر ایک ان میں سے الگ الگ کمپنی کی حکومت سے تعلق رکھتا تھا اور اکثر ہر ایک کے تعلق کی نوعیت میں فرق ہوتا تھا جسے انگریز حکمران اپنی عام سیاسی مصلحتوں کے مطابق پیش نظر رکھا کرتے تھے۔

عہد معاونت سے ایک یہ بھی مقصد تھا کہ فرانسیسی نفوذ اور اثر کا دروازہ بند کر دیا جائے اس لیے کہ وہ والی ملک جو اس قسم کا معاہدہ کرتے تھے یہ بھی وعدہ کرتے تھے کہ وہ بغیر کمپنی کی اجازت کے کسی یورپین کو اپنے ہاں ملازم نہیں رکھ سکیں گے۔ دیسی ریاستوں میں کمپنی کی جو فوج رکھی جاتی تھی اسے کمپنی اپنے تسخیر ہند کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتی تھی اور کمپنی کی سیاسی حدود کے باہر اس کے فوجی مرکز قایم ہو جاتے تھے۔ کمپنی کے مقبوضات کے امن و امان میں کسی طرح کا خلل ڈالے بغیر اس فوج کو ان مرکزوں سے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجا جا سکتا تھا۔ اس طرح حکومت ہند کو ایک بڑی فوج مل جاتی تھی جسے وہ اپنے اغراض کے لیے استعمال کر سکتی تھی بلا کسی قسم کی مالی زیر باری کیے۔[1]

لیکن اصول عہد معاونت میں یہ خرابی تھی کہ دیسی والیان ملک سے انگریزی فوج کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے جو رقم طلب کی جاتی تھی وہ ان کی مجموعی آمدنی کے تناسب سے بہت زیادہ ہوتی تھی جس کی وجہ سے متعلقہ

[1] Martin, the Wellesly Despatches, Vol. IV, p. 176-7.

ریاست کا معاشی توازن درہم وبرہم ہو جاتا تھا۔ انگریزی فوجوں کی تنخواہیں جو عہد معاونت کی ہوئی ریاستوں میں رکھی جاتی تھیں ان فوجوں کی تنخواہوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھیں جو برطانوی ہند میں رہتی تھیں۔ خود ڈیوک آف ویلنگٹن (آرتھر ولزلی) نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ انگریزی حکومت عہد معاونت کے سلسلے میں فوجی اخراجات کی تکمیل کے لیے جو رقم لیتی ہے وہ وقت پر نہیں ادا ہو سکتی اس لیے کہ متعلقہ ریاست کی آمدنی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی[1]۔ ایک برا اثر اصول عہد معاونت کا یہ ہوا کہ جس ریاست کے ساتھ اس پر عمل کیا گیا اس کا حکمران طبقہ اپنی حفاظت کے لیے انگریزی سنگینوں کا آسرا لینے لگا اور رعایا کی بھلائی اور خوشحالی کے مطالبات کی طرف سے بے توجہی برتنے لگا۔ چونکہ ان والیان ملک کو یقین ہوتا تھا کہ انگریزی حکومت ان کی حفاظت کر رہی ہے اس لیے رعایا ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی[2]۔ عہد معاونت کے انتظام سے بقول منرو "خود مختاری اور قومی کردار کے علاوہ ہر وہ چیز قربان کر دی جاتی تھی جو کسی قوم کو عزت واحترام کا مستحق ٹھہراتی ہے"[3]۔

ولزلی نے عہد معاونت کے ذریعہ انگریزی حکومت کی بالادستی ہندوستان کے بیشتر حصے پر تسلیم کرا دی۔ اس ضمن میں جو معاہدے کئے جاتے تھے ان کی شرطوں سے دیسی ریاستوں کو ایسے ذریعوں سے محروم کر دیا جاتا تھا جن کی بدولت وہ کوئی ایسا طریق کار اختیار کر سکیں جو سلطنت برطانیہ کے مفاد اور منصوبوں کے خلاف پڑتا ہو۔ اس طرح حکومت ہند کی نگرانی ایسے وسیع علاقوں پر قایم ہو گئی جو سیاسی اعتبار سے براہ راست کمپنی کے ماتحت نہیں تھے۔ معاہدہ کرنیوالی ریاستوں کی فوج میں تخفیف کر دی جاتی تھی اور اس اندرونی حفاظت اور خارجی مدافعت کی ذمہ داری کے لیے انگریزی فوج کا دست نگر ہونا پڑتا تھا۔ اس قسم کے انتظام کی ولزلی نے اس واسطے بھی ضرورت محسوس کی کہ کمپنی کو گزشتہ زمانے

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. IV, p. 15.
[2] Roberts, India under Wellesley, p. 37.
[3] Gleig, Life of Sir Thomas Munro. Vol II. p. 7.

میں مختلف لڑائیوں میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ اس کی حلیف ریاستیں امداد کے لیے جو فوج بھیجتی تھیں اس کا طرزِ عمل اپنے حکمران کی حکمت عملی کے تابع ہوتا تھا اور اگر کہیں عین لڑائی میں حکمران نے علیحدہ ہو جانے کے اصول کو اپنے لیے مناسب سمجھا تو فوج بھی لڑائی میں ساتھ چھوڑ کر چل دیتی تھی۔ چنانچہ ولزلی چاہتا تھا کہ دیسی ریاستوں میں جو انگریزی فوج رہے اس کی تربیت بالکل انھیں اصولوں پر کی جائے جن کے مطابق برطانوی ہند کی فوجوں کی تربیت کی جاتی تھی اور انھیں براہِ راست انگریز افسروں کے ماتحت رکھا جائے تاکہ وہ لڑائی کے وقت یا کسی اور وقت بھی کمپنی کے مفاد کے خلاف اقدام نہ کر سکیں اور اپنے افسروں کا حکم ماننے کے عادی ہوں۔ ان کی تنخواہیں اور بھتّے بھی انگریز افسروں کے ذریعہ سے دلوائے جاتے تھے تاکہ وہی ان کی وفاداری اور اطاعت کا مرکز بن جائیں اگرچہ انگریزی حکومت ان تنخواہوں کی رقم کو براہ راست متعلقہ ریاست کے خزانہ سے حاصل کر لیتی تھی۔ ان فوجوں کی کارکردگی اور تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی اور وہ چند روز کی اطلاع ملنے پر لڑائی کے میدان میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر پہنچ سکتی تھیں۔ چونکہ ان تنخواہوں کی رقم کے ضمن میں جس رقم کی ادائی کا تعین کیا جاتا تھا وہ اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ اس کی باقاعدہ ادائی ممکن نہ تھی اس لیے کچھ عرصے کے بعد یہ طریقہ نکالا گیا کہ بجائے نقد زرِ معاوضہ ادا کرنے کے ریاست متعلقہ بعض علاقے کمپنی کے حوالے کر دے۔

سرکار نظام سے عہد معاونت کی تجدید ۱۸۰۰ء

۱۷۹۸ء میں سرکارِ نظام اور کمپنی میں جو عہد معاونت ہوا تھا اس کی رو سے انگریزی

فوج کے اخراجات چوبیس لاکھ ستر ہزار روپے سالانہ قرار پائے تھے جس کی دو سال سے پابجائی نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۰۰ء میں سرکار نظام اور کمپنی میں ایک جدید معاہدہ ہوا جس کی دفعہ ۵ کے مطابق یہ طے ہوا کہ ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی تیسری اور چوتھی جنگ میسور کے بعد سرکار نظام کو جو علاقے ملے ہیں وہ سب کے سب دائمی طور پر حکومت برطانیہ کے حوالے کر دئے جائیں ان میں بلاری۔ کڑپہ کرنول اور اننت پور کے زرخیز اضلاع شامل تھے جن کی سالانہ آمدنی تقریباً ۶۳ لاکھ روپے تھی۔ ان علاقوں کو حوالے کرنے کے بعد انگریزی حکومت ممالک محروسہ کی حفاظت کی ہمیشہ کے لیے ذمہ دار ٹھہرے گی اور اس ضمن میں آئندہ کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ حمایتی فوج کی تعداد میں دو پلٹنوں اور ایک رجمنٹ کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ اس امر کی بھی صراحت کی گئی کہ انگریزی حکومت سرکار نظام کے علاقوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ یہ شرط صراحت کے ساتھ اس واسطے رکھی گئی کہ پیشوا نے اپنے اور سرکار نظام کے معاملات میں انگریزوں کو ثالث بنانا منظور نہیں کیا تھا۔ سرکار نظام نے اپنے آپ کو بلا کمپنی کی اجازت کے دوسرے والئ ملک سے سیاسی تعلق رکھنے یا نامہ و پیام کرنے کے حق سے دستبردار کر لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان شرائط سے ریاست حیدرآباد کی سیاسی آزادی کو سخت صدمہ پہنچا لیکن مرہٹوں سے جو خطرہ تھا اس کا سد باب ہو گیا۔ کمپنی اور سرکار نظام کے علاقوں میں دریائے تنگ بھدرا کو سرحد قرار دیا گیا۔ دریائے تنگ بھدرا کے جنوب میں ادھونی اور اس کے نواح کے علاقے سرکار نظام کی ملکیت تھے وہ کمپنی کو دیدیئے گئے اور ان کے عوض کمپنی نے کم و بیش اسی آمدنی کے علاقے دریائے تنگ بھدرا کے شمال میں سرکار نظام کو حوالہ کر دیئے۔ ان میں ضلع اناگنڈی کے وہ گاؤں تھے جو دریائے تنگ بھدرا کے شمال میں واقع ہیں اور کپل کے آٹھ علاقے بھی شامل تھے لے جہاں تک کہ سرکار نظام کے اندرونی معاملات کا تعلق تھا۔

لے (Aitchison, Vol. IX, p. 63-68-

کمپنی ان میں مداخلت کی مجاز نہ تھی۔ لیکن دولت آصفیہ کے خارجی اختیارات کا کمپنی کی صوابدید پر انحصار سرکار نظام کے شاہی حقوق پر تحدید عاید کرنے کے مرادف تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی مملکت کے حدود کے اندر دوسرے ملک کی فوج کے مستقل طور پر رہنے سے چاہے وہ حفاظت ہی کے لیے کیوں نہ رہے اس مملکت کے مقتدرانہ حقوق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کمپنی اور سرکار نظام میں ۱۸۰۲ء میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا اور یہ طے ہوا کہ برطانوی اموال درآمد و برآمد کے لیے ۵ فی صدی محصول کے ما بدار ہی اور دوسرے مقامی محصول نہیں لئے جائیں گے لیکن جو انگریزی فوج ممالک محروسہ میں مقیم ہے اس کے سامان کو اس محصول سے مستثنیٰ کیا جائے گا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو مجاز کیا گیا کہ وہ بندرگاہ سولی پٹم میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کرے اور وہاں اپنے کارندوں کو ان شرائط کے تحت رکھے جو کمپنی کی حکومت نے وضع کیے ہوں اور جن کے متعلق سرکار نظام اور گورنر جنرل با اجلاس کونسل میں باہمی رضامندی حاصل کر لی گئی ہو۔ اگر ممالک محروسہ سے انگریزی علاقے میں کوئی مال بھیجا جائے گا تو وہاں بھی پانچ فی صدی محصول مال کی قیمت پر لیا جائے گا۔ ممالک محروسہ سے انگریزی علاقوں کو غلے کی درآمد سرکار نظام سے خاص اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد کی جا سکے گی۔ انگریزی حکومت ممالک محروسہ میں صرف اس قدر غلہ خریدنے کی مجاز ہوگی جو ماتحتی فوج کی ضروریات کے لیے درکار ہوگا۔

الحاق کرناٹک　۱۷۹۲ء میں کارنوالس نے نواب محمد علی سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بموجب قطعی طور پر طے ہو گیا تھا کہ اگر نواب انگریزی حکومت کو مقررہ رقم نہ ادا کرے جو اس کے علاقوں کی فوجی حفاظت کے ضمن میں طے ہوئی ہے تو کمپنی کو اختیار ہوگا کہ نواب کے ملک پر قابض ہو جائے۔ نیز یہ کہ جنگ کے زمانے میں رسد اور فوجی نقل و حرکت کی سہولت کے مدنظر کرناٹک کے نظم و نسق پر کمپنی کی نگرانی قائم ہو جانی چاہیئے۔ لیکن نواب محمد علی نے مقروض ہونے کے سبب سے کمپنی کے مالی مطالبہ کو پورا کرنے میں ٹال مٹول کی اور وہ اضلاع جن کی آمدنی کمپنی کے رقمی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے

مختص کر دئے گئے تھے، اپنے مختلف قرض خواہوں کو مکفول کر دئے۔ اس زمانے میں کمپنی کے انگریز ملازمین نجی تجارت اور ساہوکارہ کا لین دین کیا کرتے تھے اور نواب سے من مانی شرح سود وصول کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض ۳۶ فی صدی شرح سود پر رقم قرض دیتے تھے۔ اس قرض کی ادائی کے لیے نواب اپنے مختلف علاقے مکفول کر دیتے تھے اور ان علاقوں کی مالگزاری قرضخواہ براہ راست وصول کرکے اپنے قرض کی بابجائی کرتے تھے۔ اس طرح کمپنی کے ملازموں نے جو اس قسم کا لین دین کرتے تھے تھوڑے سے عرصے میں خوب دولت سمیٹی۔ نواب نے مدراس کے قریب جو عالیشان محل تعمیر کرایا تھا اس میں داد عیش دیتا اور انگریزوں کی اعلیٰ سوسائٹی کی خاطر مدارات میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ ملک کی عام زندگی سے وہ کچھ عرصے سے بے تعلق سا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان قرض خواہوں کو من مانے طور پر نظم و نسق کے معاملات میں بھی مداخلت کا موقع حاصل ہو گیا۔ پال بین فیلڈ نے جو حکومت مدراس کی ملازمت میں تھا اپنے لین دین کے تعلق کی وجہ سے نواب پر بڑا اثر قایم کر لیا تھا۔ پال بین فیلڈ کو کمپنی کی ملازمت سے بعض بدعنوانیوں کے سبب سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کو اب ملازمت کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ ہندوستان چھوڑنے سے قبل اس نے ۵ لاکھ پونڈ جمع کر لئے تھے۔ انگلستان پہنچ کر وہ پارلیمنٹ کا رکن بن گیا۔ غرضکہ کمپنی کے ملازمین اور دوسرے ساہوکاروں کا اس قدر قرضہ نواب پر ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی کمپنی کے ان مطالبوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا جن کی بابجائی کا اس نے بذریعہ معاہدہ وعدہ کیا تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ کمپنی کے ملازمین اپنے قرض کے ذریعہ جو نواب پر تھا خوب روپیہ سمیٹ رہے تھے اور کمپنی کو نواب سے ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ پٹ کے قانون (۱۷۸۴ء) میں اس قرض اور نواب کی مالی حالت کے متعلق حکومت مدراس کو تحقیق کرنے کا حکم دیا گیا۔ کارنوالس نے بھی سختی کے ساتھ کمپنی کے ان ملازمین کی روک تھام کرنی چاہی جو نواب کے ساتھ لین دین کے تعلقات رکھتے تھے اس واسطے کہ ان کی

وجہ سے کمپنی کی بدنامی ہو رہی تھی[1]۔ قرضہ کے متعلق تحقیق اور چھان بین کا سلسلہ عرصے تک برابر جاری رہا۔ ایک قرضہ ادا ہو جاتا تھا تو دوسرا اس سے بڑا قرضہ موجود ہوتا تھا غرضکہ پورے طور پر قرضوں سے چھٹکارا ممکن نہیں ہوا۔

۱۷۹۵ء میں نواب محمد علی کے انتقال پر عمدۃ الامرا گدی پر بیٹھے۔ گورنر مدراس لارڈ ہیوبرٹ نے نئے نواب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ تمام علاقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبے پورے کرنے کے لیے خاص کیے گئے ہیں وہ حکومت مدراس کے تصرف میں دے دیئے جائیں تو مناسب ہے۔ لیکن نئے نواب نے اس انتظام کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ نواب پر سب سے زیادہ زور اس کے انگریز قرض خواہوں نے ڈالا کہ وہ لارڈ ہیوبرٹ کی تجویز کو کبھی بھی نہ مانے[2]۔ ظاہر ہے کہ ان قرض خواہوں کو اندیشہ تھا کہ اگر یہ علاقے نواب کرناٹک کے ہاتھ سے نکل کر کمپنی کے تصرف میں چلے گئے تو ان کی آمدنی ختم ہو جائے گی۔ لارڈ ہیوبرٹ نے اپنی تجویز کو بہ جبر نہیں منوانا چاہا اس لیے کہ ایسا کرنے سے سیاسی گتھیاں پڑ جاتیں۔ غرضکہ جب ولزلی ہندوستان آیا تو کرناٹک میں نواب کے انگریز قرض خواہوں کے پو بارہ تھے۔ ملک میں چو طرف ابتری اور انتشار کی کیفیت تھی۔ نواب کے مقروض ہونے کے سبب سے کمپنی کی مقررہ رقم کی ادائی ممکن نہ تھی۔ ولزلی نے محسوس کیا کہ کرناٹک کے معاملے میں کمپنی اور اس کے مقامی ملازمین کے مفاد میں ایک طرح کا تضاد پیدا ہو گیا ہے جسے دور کرنے کی صرف یہ صورت ہے کہ پورے کرناٹک کے نظم و نسق کو براہ راست کمپنی کے تحت کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اس نے جو طریق کار استعمال کیا وہ یقیناً قابل اعتراض تھا۔ اس نے کہا کہ قلعہ سرنگا پٹم کی فتح کے بعد بعض ایسے کاغذات ملے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے کمپنی کے مفاد کے خلاف ٹیپو سلطان سے ساز باز کیا تھا۔

---

[1] Ross, Correspondence of Marquis Corronwallis, Vol. II, p. 482.

[2] Malcolm, History of India, I. p. 164.

یہ کاغذات بورڈ آف کنٹرول کے ملاحظہ کے لیے انگلستان بھیجے گئے۔ بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرز (مجلس نظماء) کے مشورہ کے بعد ولزلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ نواب عمدۃ الامرا سے گدی چھین لی جائے لیکن اسی اثناء میں ۱۵ جولائی ۱۸۰۱ء کو نواب عمدۃ الامرا کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا نواب علی حسین تاج الامرا مسند نشین ہوا۔ ولزلی کے حکم کے بموجب گورنر مدراس نے نواب عمدۃ الامرا کی عین حالت نزع میں نواب کے محل کا انگریزی فوج سے محاصرہ کرا لیا تھا۔ نواب عمدۃ الامرا کے گذر جانے کے بعد اور نواب تاج الامراء اور اس کے مشیروں کے سامنے گورنر مدراس کے چیف سکرٹری نے لارڈ ولزلی کے حکم کے بموجب یہ شرطیں پیش کیں کہ نواب کرناٹک کا نظم و نسق کمپنی کے حوالے کر دے اور کمپنی جو وظیفہ مقرر کرے اس کو قبول کرے۔ اس طرح اگر نواب حقوق ملک سے ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو جائیں تو ان کی جانشینی کو کمپنی تسلیم کر لے گی۔ لیکن نواب تاج الامرا اور اس کے مشیروں نے ان شرطوں کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر گورنر مدراس نے نواب عمدۃ الامراء کے بھتیجے نواب عظیم الدولہ سے گفت و شنید شروع کی جس نے کمپنی کی شرطیں مان لیں اور اس کو نواب کرناٹک تسلیم کر لیا گیا۔ نواب عظیم الدولہ نے کمپنی سے معاہدہ کیا جس کی رو سے کرناٹک کا فوجی اور دیوانی انتظام کمپنی کے تصرف میں آ گیا اور کل مالگزاری کا ۱/۵ نواب کے لیے بطور پنشن مقرر کر دیا گیا۔ اپریل ۱۸۰۲ء نواب تاج الامراء نے رحلت کی۔ عظیم الدولہ کی گدی نشینی کو وراثتی استحقاق کی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ محض کمپنی کی عنایت کی۔ غرضکہ یہ تمام معاملہ جس طریقے سے پیش آیا وہ قابل اعتراض ہے۔ مورخ مل کے بقول یہ کاغذات جو سرنگاپٹم میں ملے ان میں صرف ان وکیلوں کے بیانات درج تھے جو ٹیپو سلطان کے لڑکوں کے ساتھ کرناٹک بھیجے گئے تھے وکیلوں کا بیان کہ نواب محمد علی یا نواب عمدۃ الامرا نے یہ کہا کس حد تک ان کے خلاف بطور ثبوت و شہادت استعمال کیا جا سکتا ہے" قانونی لحاظ سے غور طلب ہے۔ اس قسم کی شہادت جو مشاہدے یا تحقیق پر مبنی نہ ہو صرف اسی وقت کسی فریق کے خلاف استعمال کی جا سکتی

ہے جب کہ اس کا استعمال کرنے والا قوت و اختیار رکھتا ہو ورنہ اس کو کسی حالت میں بھی عادلانہ اصول پر مبنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان کاغذات میں بعض بیانات میجر ڈوٹن کی طرف منسوب کیے گئے ہیں جو یقیناً میجر موصوف کے نہیں تھے۔ اسی طرح جو بیان نوابان کرناٹک کی طرف منسوب کئے گئے ہیں انھیں بھی مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے[1]۔ بعد میں ان وکیلوں نے تحقیقات کے سلسلے میں جو زبانی بیان دئے ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے مختلف موقعوں پر ٹیپو سلطان کی خیر خواہی کا اظہار کیا وہ محض رسمی تھا۔ اس تمام معاملہ کے متعلق مل کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ سرنگاپٹم کے کاغذات کے ضمن میں جو تحقیقات کی گئی اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے انگریزی مفاد کے خلاف ٹیپو سلطان سے مراسلت کی۔ اگرچہ دربار میسور کا پورا دفتر انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور جن وکیلوں کے بیان پیش کیے گئے وہ انگریزوں کے قابو میں تھے اور کمپنی سے وظیفہ پاتے تھے پھر بھی شہادت سے نوابوں کا قصور ثابت نہیں ہوتا[2]۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ نواب محمد علی اور نواب عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان سے انگریزوں کے مفاد کے خلاف مراسلت کی تو بھی یہ بات کس طرح حق بجانب ہو سکتی ہے کہ عمدۃ الامرا کے بیٹے یا بھتیجے کو حقوق حکمرانی سے ان مفروضہ قصوروں کی بنا پر محروم کیا جائے جو انھوں نے خود نہیں کیے۔ ولزلی کا یہ کہنا ہے چاہے کہ چونکہ تاج الامرا کا والد (یعنی عمدۃ الامرا) کمپنی کے مفاد کا دشمن تھا اس لیے انگریزی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی جانشینی کے متعلق جو نقطۂ نظر چاہے اختیار کرے۔ اور ان حالات میں کمپنی پر جو سابقہ معاہدے کی پابندی تھی وہ ساقط ہو گئی[3]۔ یہ نقطۂ نظر عدل و انصاف کی رو سے حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔

۱؎ Mill, History of India, Vol. VI, p. 213.

۲؎ Mill, History of India, Vol. II, p. 516.

۳؎ Martin, Wellesley's Despatches. Vol. II, p 558; Robert's, India under Wellesley, p. 109.

الحاق تنجور

تنجور کے راجا تلجا جی نے سنہ ۱۷۸۷ء میں وفات پائی تو جانشینی کا جھگڑا پیش آیا اور انگریزی حکومت کو دخل دینے کا موقع ہاتھ لگا۔ حکومت مدراس نے تنجور کے پنڈتوں کے مشورہ کے مطابق تلجا جی کے سوتیلے بھائی امر سنگھ کی گدی نشینی کو پہلے تو مان لیا لیکن بعد میں تلجا جی کے متبنیٰ سرفوجی نے اپنے حقوق کے متعلق گورنر جنرل کارنوالس کو اپیل کی۔ کارنوالس نے اس معاملے کو دوبارہ بنارس اور کلکتہ کے پنڈتوں کے غور کے لیے پیش کیا جنھوں نے سرفوجی کے حق میں تصفیہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنارس اور کلکتہ کے جن پنڈتوں سے یہ تصفیہ کرایا گیا وہ انگریزی افسروں کے تحت تھے۔ انگریز مورخ بیورج[1] کی یہ رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ اگر امر سنگھ نے کمپنی کے مالی مطالبات مان لیے ہوتے تو یہ معاملہ دوبارہ نہیں اٹھایا جاتا۔ بہرنوع امر سنگھ اور سرفوجی کا جھگڑا کارنوالس اور سر جان شور کے عہد حکومت میں برابر جاری رہا اور حکومت ہند اس باب میں کوئی قطعی فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچاتی رہی۔ لیکن ولزلی ہچکچانے والا شخص نہ تھا اس نے سرفوجی کو تنجور کا جائز راجا مان لیا اور راجا نے اس کے بدلے میں اپنی پوری ریاست کا انتظام کمپنی کے حوالے کر دیا۔ صرف تنجور کے قلعہ اور اس کے مضافات پر راجا کا براہ راست قبضہ قائم رہا۔ اس کے گزارے کے لیے چار لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا اور اس کے علاوہ مالگزاری میں سے ۱/۵ حصہ منظور کیا گیا۔ سرفوجی سنہ ۱۸۳۲ء تک زندہ رہا۔ اس کی وفات کے وقت چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے مجلس نظمار کے تصفیہ کے بموجب اس کے خاندانی اعزاز و مراتب کا خاتمہ کر دیا گیا۔

کرناٹک، تنجور، کنارا اور مفوضہ ضلعوں سے جو سرکار نظام سے ملے تھے احاطۂ مدراس بہت کافی وسیع ہو گیا اور شمالی سرکار کو ملا کر جو پہلے حاصل

[1] Beveridge, Comprehensive History of India, Vol II, p. 715.

کر لیئے گئے تھے موجودہ صوبہ مدراس کی تشکیل ولزلی کے عہد میں عمل میں آچکی تھی۔ ان تمام علاقوں میں مالگزاری اور عدالت کے نظم و نسق کی اصلاح ریڈ اور منرو جیسے قابل عہدہ داروں کی نگرانی میں عمل میں آئی۔ سرکش زمینداروں اور پولی گاروں پر قابو حاصل کیا گیا زمینوں کی نئی تشخیص کی گئی۔ ولزلی بنگال کے زمینداری نظام اور دوامی بندوبست کو مدارس میں بھی رائج کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ منرو نے ولزلی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد رعیت واری انتظام کو نافذ کیا جس سے کاشتکاروں کو بہت فائدہ ہوا۔

الحاق سورت

سورت کے نواب کا ۱۷۹۹ء میں انتقال ہوا تو اس کا بھائی اس کی جانشینی کا دعویدار ہوا۔ اس معاملے میں ولزلی نے یہ اصول پیش کیا کہ چونکہ عملی طور پر کمپنی کی حکومت ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی جانشین ہوگئی ہے اس لیے ان سب ریاستوں کے جانشینی کے معاملات میں جو سلطنت مغلیہ کے تحت ہیں کمپنی کو مداخلت کا حق پہنچتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ نئے نواب کی مسند نشینی کو کمپنی تسلیم کرے نواب معاہدے کے ذریعے وعدہ کرے کہ جو انگریزی فوج اس کی حفاظت کے لیے رکھی جائے اس کے اخراجات کی باقاعدہ ادائی ہوا کرے گی۔ چنانچہ نواب نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سے زیادہ وہ ادا کر ہی نہیں سکتا تھا جیسا کہ انگریز ریذیڈنٹ مقیم سورت نے لکھا تھا کہ اگر نواب کے پاس وسائل ہوتے تو وہ بلا شبہہ اور زیادہ رقم کمپنی کو خوشی سے ادا کرتا۔ ابھی یہ گفت و شنید ہو ہی رہی تھی کہ ولزلی نے حکم دیدیا کہ سورت کی پوری ریاست کے نظم و نسق کو براہ راست کمپنی کے تحت کر لینا چاہیے۔ نواب کو ایک لاکھ روپے سالانہ پنشن دی جائے اور کل مالگزاری کا ⅕ حصہ اس کے لیے مقرر کر دیا جائے۔ اس معاملے میں ولزلی

لہ Mill, History of India, Vol. p. 207

نے سخت زیادتی سے کام لیا۔ سورت کی ریاست کو احاطہ بمبئی میں شامل کر دیا گیا۔

اودھ

سر جان شور نے نواب اودھ سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ کمپنی تیرہ ہزار فوج تک اودھ میں رکھ سکے گی جس کے خرچے کے لیے ۷۶ لاکھ روپے سالانہ دربار اودھ ادا کرے گا۔ اگر اس سے زیادہ فوج کی ضرورت ہوگی تو رقم میں اسی تناسب سے اضافہ کرنا ہوگا۔ چونکہ اس زمانے میں والئ افغانستان زمان شاہ سے اودھ کی شمال مغربی سرحد پر ڈر لگا ہوا تھا اس لیے اودھ میں کمپنی کی فوج میں اضافہ ضروری تھا۔ زمان شاہ نے نواب اودھ اور کمپنی کی حکومت کلکتہ کو لکھا تھا کہ وہ دونوں شاہ عالم کو مرہٹوں کے پنجے سے چھڑانے اور مغل علاقوں میں سے مرہٹوں کو بے دخل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان کی یہ بے توجہی دشمنی سمجھی جائیگی۔[1] چنانچہ انگریزی فوج کی تعداد میں جو اودھ میں رہتی تھی مزید سات ہزار سپاہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اب اودھ میں انگریزی فوج کی تعداد بیس ہزار ہوگئی لیکن جب اس فوج کے خرچ کی ادائی کا وقت آیا تو نواب اودھ ٹال مٹول کرنے لگا اور آمدنی کی کمی کا عذر پیش کیا۔ ولزلی نے کہا کہ جو بے قاعدہ فوج نواب نے رکھی ہے اس کو برطرف کر دیا جائے اس لیے کہ اس کے رکھنے سے خزانہ پر فضول بار پڑتا ہے۔ نواب اودھ کا کہنا یہ تھا کہ جو مزید فوج اودھ میں رکھی گئی ہے وہ کمپنی نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے رکھی ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے خرچ کے لیے اس کو زیر بار کیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کمپنی کی حکومت کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے وفادار حلیف نواب اودھ کو جس کی مالی حالت پہلے سے خراب تھی مزید فوج رکھ کر مجبور کرتی کہ اس کے خرچ کے لیے کہیں سے بھی رقم مہیا کرو۔ کیا اس مزید فوج کا خرچ خود کمپنی کو نہیں

---

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. I. p. 262.

اٹھانا چاہیئے تھا ؟ - مورخ مل نے اس ضمن میں ولزلی کی حکمت عملی پر جو اعتراض کئے ہیں وہ بہت ٹھیک ہیں - وہ لکھتا ہے کہ امن کے زمانے میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اودھ میں اس قدر فوج رکھی جاتی جو محاذ جنگ قایم کرتے وقت ہی ضروری ہو سکتی تھی پھر زمان شاہ کے اودھ پر حملہ کرنے کا بہت کم امکان تھا - زمان شاہ کے خطرے سے اودھ میں انگریزوں کی فوجی تیاری کرنا ویسا ہی تھا جیسے انگلستان میں ترکوں کے حملے کے خوف سے جنگی تیاری کی جائے - ولزلی نواب کی فوج کو گھٹا کر جو فوجی اصلاح اودھ میں کرنا چاہتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ نواب کا ایک دوسری مملکت کی فوج پر دار و مدار رہتا جو کوئی حکمران پسند نہیں کر سکتا[۱]

جب ولزلی کی شرطیں نواب اودھ کے سامنے پیش کی گئیں تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر یہ شرطیں منوانے کی کوشش کی گئی تو وہ تخت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشیں ہو جائے گا - ریزیڈنٹ نے ولزلی کو اسکی اطلاع دی تو اس نے جواب میں لکھا کہ "اگر نواب گدی سے الگ ہو جائیں تو اس سے نہ صرف کمپنی کو بلکہ اودھ کے باشندوں کو بھی فائدہ ہوگا - نواب کی اس قسم کی خواہش کی ہر طرح سے ہمت افزائی کرنی چاہیئے" اس معاملے کے متعلق اس نے مجلس نظماء کو لکھا کہ " میں اس واقعہ سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا[۲] - ولزلی نے ریزیڈنٹ کو ہدایات بھیجدیں کہ اگر نواب واقعی حکومت کی ذمہ داری سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ خود اس کا کوئی اعلان کرے ہمیں ایک خفیہ معاہدہ اس ضمن میں کر لینا چاہیئے

۱ - Mill, History of India, Vol. VI, p.

۲ - Martin, Wellesly's Despatches, Vol. II, p.

جس میں اس کی جانشینی وغیرہ کے مسائل کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ نواب کے بیٹوں کا اس معاہدہ میں ذکر اس طرح ہونا چاہیے جس سے ظاہر ہو کہ ان کے گزارے کے لئے انضمام کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی حکومت اپنے تئیں جانشینی وغیرہ کے جھگڑوں میں پھنسائے بغیر پورے اودھ پر اپنا قبضہ اور تصرف منوا لینا چاہتی تھی۔ ولزلی نے دوسری ریاستوں کے متعلق جو الحاقی حکمت عملی اختیار کی تھی وہی وہ اودھ کے متعلق بھی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نواب نے جب ریزیڈنٹ کو دست برداری کا خط لکھا تھا، تو اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ چونکہ اس کے بیٹوں میں سے ایک اس کے بعد مسند نشین ہو جائے گا اس لئے اس کے خاندان کا اور اس کا نام برابر چلتا رہے گا۔ جب ولزلی کی تحریر پہنچنے پر ریزیڈنٹ نے کہا کہ جانشینی کا مسئلہ اس وقت نہ چھیڑا جائے تو نواب نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسی حالت میں وہ دستبرداری کے وعدہ سے دستبردار ہوتا ہے اور اس ضمن میں کسی معاہدے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جب ولزلی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت برافروختہ ہوا اور نواب کو لکھ بھیجا کہ چاہے وہ حکومت کے اختیارات سے دستبردار ہو یا نہ ہو انگریزی فوج کا مزید خرچ اس کو اٹھانا ہوگا اور اس کی فوج کی اصلاح کا انگریزی حکومت نے تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ مزید انگریزی فوج نواب کی منظوری کا انتظار کئے بغیر اودھ روانہ کر دی گئی۔ نواب نے ہر چند اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا اور بتایا کہ سر جان شور نے ۱۷۹۸ء میں اس سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بموجب کمپنی کی حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اودھ کے اندرونی نظم و نسق میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی لیکن اب جب کہ اس کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی فوج کو برطرف کرے تو یہ معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ لیکن جب نواب سے کہا گیا کہ اگر اس معاملے کو زیادہ طول دیا گیا تو

ل Martin. Wellesley's Despatches, Vol. II, P. 156

اس کے لیے اچھا نہ ہوگا تو وہ بیچارہ خاموش ہو گیا۔ نواب کی سب فوج برطرف کر دی گئی۔ ہاں اتنا ضرور کیا گیا کہ جن افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہ کا بقایا چلا آتا تھا اس کی ادائی کر دی گئی۔ نواب اودھ نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے ملک میں ایسا نظم و نسق رکھے گا جس سے رعایا کی فلاح و بہبود کی ترقی ہو اور وہ کمپنی کے نمائندے کے مشورے سے تمام اہم امور انجام دیا کرے گا۔[۱] لیکن ولزلی نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ اس لئے نواب سے عہد معاونت کے شرائط تسلیم کرائے۔ یہ معاہدہ ۱۰ ر نومبر ۱۸۰۱ء میں لکھنو میں ہوا جس کی رو سے روہیلکھنڈ اور دوابہ کے زرخیز اضلاع نواب نے کمپنی کے حوالے کر دیئے تاکہ آئندہ انگریزی فوج کے اخراجات کے لیے اپنی مالگزاری میں سے سالانہ رقم ادا کرنے کے بجائے ان علاقوں کی آمدنی میں سے کمپنی کی فوج کے اخراجات محسوب ہو جایا کریں۔ ان ضلعوں کی آمدنی ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپے سالانہ تھی۔ ان اضلاع کو کمپنی کے حوالے کرنے سے اودھ کی ریاست چاروں طرف برطانوی علاقوں سے گھر گئی سوائے شمال کے جہاں ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور اہل نیپال کی سرحد چھوتی تھی۔ وارن ہسٹنگز چاہتا تھا کہ اودھ کو حجابی مملکت کے طور پر برقرار رکھے تاکہ اگر بنگال کی طرف مرہٹے رخ کریں تو پہلی ٹکر اودھ سے ہو اور اس دوران میں انگریزی حکومت مقابلے کی تیاری کر لے۔ لیکن ولزلی کی حکمت عملی اس کے بالکل خلاف تھی وہ چاہتا تھا کہ اودھ کو ہر طرف سے برطانوی مقبوضات سے گھیر لیا جائے تاکہ اگر اس طرف مرہٹے یا والیِ افغانستان زمان شاہ کبھی رخ کریں تو انگریزی فوجیں مقابلے کے لیے موجود رہیں۔ نواب اودھ نے ۱۷۹۸ء کے معاہدے کے بموجب انگریزی فوج کے خرچ کے ضمن میں جس رقم کی ادائی کا وعدہ کیا تھا اس کو پابندی سے ادا کیا تھا۔ اس لئے اس کے علاقوں پر قبضہ کرنا کسی طرح بھی

Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, p. 601. ؎۱

حق بجانب نہیں کہا جا سکتا۔ پھر نواب پر یہ پابندی عاید کرنا کہ وہ کمپنی کے حکام سے اندرونی نظم و نسق کے معاملات میں بھی مشورہ کرے ۱۷۹۷ء کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اسکے علاوہ معاہدے پر دستخط کرا لینے کے لیے جو طریق کار ولزلی نے اختیار کیا وہ قرین انصاف نہیں کہا جا سکتا۔

روہیل کھنڈ اور دوآبہ کے ضلعوں کے الحاق کے بعد ان کا انتظام

ایک بورڈ آف کمشنرز کے سپرد کر دیا گیا جس کا صدر ہنری ولزلی تھا جو گورنر جنرل کا چھوٹا بھائی تھا۔ ہنری ولزلی کو بورڈ آف کمشنرز کے علاوہ نئے صوبے کا لفٹیننٹ گورنر بھی مقرر کیا گیا۔ اس بورڈ کو نظم و نسق کے تمام معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ان اضلاع میں جو افسر مقرر کئے گئے انھیں انتظامی، عدالتی اور مالیاتی اختیارات حاصل تھے۔ بورڈ کو نظم و نسق کے لیے قاعدے اور ضابطے بنانے کا بھی اختیار تھا جن کی منظوری گورنر جنرل سے لی جاتی تھی۔ دو سال بعد ان اضلاع میں بنگال کا طریق حکومت رائج کیا گیا اور تمام علاقوں کو سات ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر ضلع میں مالگزاری جمع کرنے کے لیے ایک کلکٹر اور مقدمات کے تصفیہ کے لیے ایک جج مقرر ہوا۔ زمینوں کا پہلے سہ سالہ اور پھر چار سالہ بندوبست کیا گیا۔ دوامی بندوبست کو رائج نہیں کیا گیا اس لیے کہ ان ضلعوں کے حالات بنگال کے حالات سے مختلف تھے۔

الحاق فرخ آباد

فرخ آباد کی ریاست دریائے گنگا کے مغربی کنارہ پر ڈیڑھ سو میل لمبی پٹی پر پھیلی ہوئی تھی جہاں بنگش خاندان کے پٹھان نوابوں کی حکومت قایم تھی۔ اگرچہ شروع میں یہ نواب خود مختار تھے لیکن بعد میں اودھ کا اقتدار ماننے لگے تھے اور انھوں نے کمپنی سے بھی دوستانہ تعلقات قایم کر لیے تھے۔ ناصر جنگ ولزلی کے عہد حکومت میں فرخ آباد کی گدی پر بیٹھا تو اس کی عمر ۱۴ سال تھی۔ اس کے وزیر امین الدولہ نے ملک کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نواب کو ۰ ہزار روپے سالانہ گزارے کے لیے مقرر کر دیئے۔ نواب فرخ آباد بریلی چلا گیا جو ہنری ولزلی کا صدر مقام تھا اور اس سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ چنانچہ ولزلی نے نواب سے

۴ جون سنہ ۱۸۰۲ء ایک معاہدہ کر لیا جس کے بموجب فرخ آباد کی ریاست کا نظم و نسق کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے صلے میں کمپنی نے نواب کی ایک لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی بنگش خاندان کے نواب سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر تک برائے نام باقی رہے۔

نواں باب

ولزلی اور مرہٹے

معاہدہ بسین دسمبر ۱۸۰۲ء

ولزلی نے ۱۷۹۸ء اور ۱۷۹۹ء میں پیشوا باجی راؤ کو عہد معاونت کے اصول کو تسلیم کرنے کے متعلق لکھا تھا لیکن نانا فرنویس نے پیشوا کو اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ پیشوا باجی راؤ اپنی خود مختاری باقی رکھنے پر اڑ گیا اور سلطنت میسور کے خاتمہ پر جب اتحادیوں کو حصے بخرے بانٹے جا رہے تھے تو نانا فرنویس نے کوئی حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا اس واسطے کہ ولزلی اس سلسلہ میں دربار پونا سے عہد معاونت کے اصول کو بھی تسلیم کرانا چاہتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حکومت بمبئی نے رگھوبا کے ذریعے سے دربار پونا پر اثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے پہلی جنگ مرہٹہ کی نوبت آئی اور کمپنی کو چھ سال تک جھگڑے میں پڑنا پڑا اور معاہدہ سالبائی کے بعد کم و بیش وہی سیاسی صورت حال کمپنی اور مرہٹوں کے درمیان برقرار رہی جو اس جنگ سے پہلے تھی۔

مرہٹے سیاسی حیثیت سے زیادہ حساس اس واسطے اور بھی تھے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر کمپنی کی سیادت کسی طرح بھی مان لی گئی تو چوتھ اور سر دیسمکھی کے

بقائے کے بہانے سے آئے دن جو وہ سرکار نظام کے خلاف یورشیں کرتے رہتے ہیں ان کا سلسلہ ختم کرنا پڑے گا۔ سرکار نظام نے کمپنی سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں خاص طور پر اس شرط پر زور دیا تھا کہ کمپنی کی فوج کو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف استعمال کیا جا سکے گا اور اس باب میں کمپنی کو کوئی تامل نہ ہوگا جیسا کہ سرجان شور کے عہد میں ہوا۔

۱۸۰۰ء میں نانا فرنویس نے تقریباً ایک چوتھائی صدی تک مرہٹہ سیاست کا اصلی کرتا دھرتا رہنے کے بعد وفات پائی۔ بقول کپتان پامر جو اس زمانے میں پونا میں انگریزی ریزیڈنٹ تھا "نانا فرنویس کی وفات سے مرہٹہ حکومت کا تدبر اور اعتدال رخصت ہو گیا[1]"۔ مرہٹوں میں ہر طرف انتشار پھیل گیا۔ دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر میں سخت کشمکش شروع ہو گئی اس واسطے کہ دونوں دربار پونا کی سیاست کو اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ دراصل دربار پونا کی قوت اور اثر برائے نام رہ گیا لیکن تاہم مرہٹوں میں اسکی اخلاقی حیثیت اب بھی بلند تھی۔ اس دربار کے نام سے دوسرے با اثر سردار بہت کچھ من مانی کارروائیاں کر سکتے تھے۔ نانا فرنویس نے بڑی دانشمندی اور سیاست کاری سے دربار پونا کا بھرم قایم رکھا تھا اور مرہٹوں کے معاملات میں اسکے ذریعے سے ایک طرح کی یک جہتی قایم کر دی تھی۔ نانا فرنویس کی وفات کے بعد دولت راؤ سندھیا نے پیشوا باجی راؤ کو پہلے تو اپنے قبالو میں کر لیا۔ لیکن اس کا اثر بہت دنوں تک قایم نہ رہ سکا جسونت راؤ ہلکر کو سندھیا کا یہ اثر ناگوار ہوا اور اس نے پیشوا اور سندھیا دونوں کی متحدہ فوجوں کو اکتوبر ۱۸۰۲ء میں پونا کے قریب شکست دیکر خود پونا پر قبضہ کر لیا۔ پیشوا باجی راؤ نے ایک انگریزی جہاز کے ذریعے فرار ہو کر بسین میں پناہ لی۔ ہلکر نے رگھوبا کے خاندان کے ایک لڑکے ونائک راؤ کو پیشوائی کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس زمانے میں پونا میں انگریز ریزیڈنٹ بیری کلوز تھا۔

[1] Grant Duff, History of the Mahrattas, Vol. III, p.135

ہلکر نے اس کو اپنے ساتھ ملانے کی پوری کوشش کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ سب کچھ اس کے مشورے کے مطابق کرے گا بشرطیکہ وہ اس کے امیدوار کو کمپنی سے پیشوا تسلیم کروا دے۔ لیکن انگریز ریزیڈنٹ کو حکومت ہند کی ہدایات پہنچ چکی تھیں کہ وہ پونا سے ترک سکونت کر کے چلا جائے تاکہ وہاں جو نئی صورت حالات پیدا ہو رہی ہے اس سے بے تعلق رہے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

ادھر پیشوا باجی راؤ نے بسین سے ولزلی کو مدد کے لیے لکھا اور وعدہ کیا کہ وہ عہد معاونت کی ان تمام شرطوں کو ماننے کے لیے تیار ہے جو کچھ عرصہ قبل پیش کی گئی تھیں اس سے پہلے بھی ۱۸۰۱ء میں جبکہ دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر کی کشمکش خطرناک شکل اختیار کر رہی تھی تو پیشوا نے ولزلی کو لکھا تھا کہ اگر انگریزی فوج اس کی حفاظت کے لیے خاص کر دی جائے تو وہ اس کا خرچ اٹھانے کو تیار ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ فوج اسکے علاقے میں نہیں رکھی جائے گی بلکہ کمپنی کے علاقے میں رہے گی اور اسوقت بھیجی جائے گی جبکہ وہ اس کو طلب کرے۔ پیشوا نے اپنی ریاست میں اس فوج کے اخراجات کی پابجائی کے لیے بعض علاقے بھی کمپنی کو حوالے کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ علاقے ایسے تھے جنھیں کمپنی حاصل کرنے کی تمنی نہیں تھی۔ اس طرح سے پیشوا اپنا مقصد تو حاصل کر لینا چاہتا تھا لیکن ولزلی کے پیش نظر جو مقاصد تھے انھیں پورا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ولزلی نے ان شرطوں پر اسے کسی قسم کی مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔

اب جبکہ پیشوا اپنے صدر مقام سے بے دخل کر دیا گیا اور انگریزی علاقے میں اس نے پناہ لے کر کمپنی کی حکومت سے مدد کی درخواست کی تو گورنر جنرل کے سامنے اس وقت تین راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صاف کہہ دیتا کہ ہم مرہٹوں کے آپس کے جھگڑے میں کسی کی طرفداری نہیں کریں گے۔ یا یہ کہ وہ ہلکر کی تائید کرتا اور ہلکر نے جس کو پیشوا بنایا تھا اس کو پیشوا ہی کو مان لیتا۔ ایک یہ صورت تھی کہ گورنر جنرل

پیشوا باجی راؤ کو اس کی کھوئی ہوئی گدی واپس دلوائے اور اس سے ایسا معاہدہ طے کرے جس سے کمپنی کے مفاد کو ترقی ہوتی ہو۔ ولزلی شور کی طرح عدم مداخلت کا قائل نہ تھا۔ یہ اصول اس کی طبیعت کی افتاد کے بالکل خلاف تھا اور اس کو وہ کمپنی کے حقیقی مفاد کے بھی خلاف سمجھتا تھا اس کو یقین کہ برطانوی حکومت نے مرہٹوں کے معاملات میں مداخلت نہ کی تو ان کے جھگڑے بہت طول کھینچیں گے اور لازمی طور پر سرکار نظام ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ اور چونکہ سرکار نظام کی حفاظت کا ذمہ کمپنی نے اپنے اوپر لیا ہے اس لیے بالواسطہ طور پر کمپنی کو بھی اس کشمکش میں مبتلا ہونا پڑے گا اور ایسی حالت میں مبتلا ہونا پڑے گا جبکہ پہل دوسروں کی طرف سے ہو چکی ہوگی اور اس کے سارے فائدوں سے وہ بہرہ مند ہو چکے ہوں گے۔ ولزلی نے سوچا کہ مرہٹوں کی آپس کی پھوٹ سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اسکی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ ان سبھوں سے عہد معاونت کے اصول کو تسلیم کرواتا۔ اس وقت جو مرہٹہ حکمران کشمکش میں مبتلا تھے ان میں سے ہر ایک انگریزوں سے مدد کا خواہاں تھا۔ پیشوا باجی راؤ چاہتا تھا کہ انگریزوں کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی راج گدی پھر حاصل کر لے۔ سندھیا چاہتا تھا کہ انگریزوں کی مدد سے پیشوا باجی راؤ کو پونا کی گدی پر بٹھائے اور اس پر اپنا اثر قائم کر لے۔ ہلکر چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت اس کے نامزد کئے ہوئے پیشوا کو مان لے تاکہ دربار پونا میں اس کی بات رہے ناگپور کا بھونسلا راجا چاہتا تھا کہ پیشوائی کے اس جھگڑے میں انگریزوں کی مدد سے ستارا کا راج اس کے خاندان کو مل جائے اس لیے کہ حقیقت میں وہ اس کا ستحقاغ تھا۔ ان حالات میں ولزلی نے سوچا کہ مرہٹہ حکمرانوں سے برطانوی مفاد کو منوانے کا بہترین موقع ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مرہٹہ حکمرانوں سے عہد معاونت کے اصول کو اسی طرح سے منوایا جا سکتا ہے جیسے کہ سرکار نظام سے [1]

[1] Roberts, India under Wellesley, p. 192.

تسلیم کرایا گیا تھا۔[1]

ولزلی صورت حالات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مرہٹہ حکمرانوں میں پیشوا باجی راؤ سے من مانے ڈھب سے شرطیں منوائی جا سکتی ہیں اس واسطے کہ اس وقت وہ بالکل بے دست و پا ہے اور کمپنی کے رحم وکرم پر اس کے آئندہ کا پورا انحصار ہے۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۸۰۲ء بسین کے مقام پر پیشوا اور کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے انگریزی فوج کی پانچ پلٹنوں کو ہمیشہ پیشوا کے علاقے میں رکھنا طے ہوا۔ اس فوج کے خرچ کی پابجائی کے لیے پیشوا اپنی ریاست میں سے ایسے علاقے دے گا جنھیں کمپنی موزوں خیال کرے اور جن کی مجموعی آمدنی ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں سے پیشوا کمپنی کی بے اجازت کسی قسم کے سیاسی تعلقات نہیں رکھے گا۔ اگر آئندہ کبھی پیشوا کا سرکار نظام یا گیکواڑ سے جھگڑا ہو تو کمپنی بطور ثالث تصفیہ کرے گی جس کی پابندی لازمی ہوگی۔ پیشوا نے اپنے اوپر یہ پابندی بھی عاید کر لی کہ وہ آئندہ کسی یورپین کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھے گا۔

معاہدہ بسین سیاسی اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ پیشوا کی حکومت مرہٹہ برادری میں عرصہ سے اپنی اگلی ساکھ کھو چکی تھی لیکن اب بھی وہ مرہٹوں کے قومی ایکے کا اڈا سمجھا جاتا اور ان کا سب سے بڑا سردار مانا جاتا تھا۔ ولزلی کا خیال تھا کہ اس معاہدے میں قدرتی طور پر یہ پوشیدہ ہے کہ جن شرطوں کو پیشوا نے مانا ہے انھیں کچھ دنوں بعد دوسرے مرہٹہ حکمران بھی مان لیں گے۔ لیکن ولزلی نے یہاں سخت دھوکا کھایا۔ اب تک حکومت انگلستان نے ولزلی کا ہر معاملے میں پوری طرح سے ساتھ دیا تھا لیکن معاہدہ بسین کے متعلق بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) نے ولزلی سے جواب طلب کیا اور ان نازک اور پیچیدہ حالات کی طرف اسے توجہ دلائی جو لازمی طور پر

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. III, p. 7.

اس معاہدے کے بعد ظاہر ہونے والے تھے اس معاہدے کو احتیاط اور اعتدال کے اصول کے منافی اور قانون پٹ کی ہدایتوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ بورڈ آف کنٹرول کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ اس معاہدے کے بعد انگریزوں کو مرہٹوں سے الجھنا پڑے گا۔ مرہٹہ حکمرانوں نے اس معاہدے سے یہ سوچا کہ ان سب کی خود مختاری خطرے میں پڑ گئی ہے اس لیے انھیں آپس کے اختلافات کو بھلا کر کمپنی کے خلاف متحد محاذ بنانا چاہیے۔

۲۰ راپریل ۱۸۰۳ء کو آرتھر ولزلی ۸ ہزار پیدل اور سترہ سو سواروں کے ساتھ پونا میں داخل ہوا۔ کرنل اسٹیونسن پیشوا کی سرحد پر ۸ ہزار انگریز فوج اور ۱۵ ہزار سرکار نظام کی فوج کے ساتھ پڑا ہوا تھا کہ اگر ہلکر آرتھر ولزلی کا مقابلہ کرے تو وہ پرینڈہ سے پونا کی طرف بڑھے۔ لیکن ہلکر کی فوج پونا سے بلے لڑے بھڑے پیچھے ہٹ گئی۔ ۱۳ رمئی ۱۸۰۳ء پیشوا باجی راؤ بسین سے آکر پونا میں داخل ہوا اور پھر سے اپنی حکومت کا ڈول ڈالا۔ اس دفعہ اس کی مسند نشینی پر انگریزی توپوں نے سلامی دی۔

سندھیا اور بھونسلا کا ایکا

پونا میں انگریزی سیاسی اثر قایم ہو جانے سے مرہٹہ حکمرانوں کو اپنی خود مختاری خطرہ میں نظر آنے لگی۔ چنانچہ سندھیا اور بھونسلا نے آپس میں ایکا کیا تاکہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی کی تیاری کریں ہلکر مالوہ میں بیٹھ کر واقعات کی رفتار کو جانچتا رہا۔ سندھیا اور بھونسلا نے ہر چند کوشش کی کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی میں انکے ساتھ شریک ہو جائے لیکن اسکو سندھیا پر ایسی بے اعتباری تھی کہ اس نے اسوقت الگ رہنا ہی مناسب سمجھا ادھر پیشوا باجی راؤ نے اپنے قاصد سندھیا اور بھونسلا کے پاس بھیجے تاکہ معاہدہ بسین کی چھپی ہوئی باتوں کو ان پر واضح کریں تاکہ مرہٹہ برادری میں جو اس کی سبکی ہوئی اس کی تھوڑی بہت تلافی ہو سکے۔ سندھیا کی فوجوں نے نربدا کو پار کر کے برہان پور کو اپنا مرکز بنا لیا۔ بھونسلا کی فوج یہاں آکر مل گئی۔ اس مقام سے سرکار نظام اور پیشوا دونوں کے علاقوں پر آسانی سے فوج کشی کی جا سکتی تھی۔ ولزلی نے عہد معاونت کی شرطیں منظور

کرنے کی سندھیا کو دعوت دی لیکن اس نے انھیں رد کر دیا۔ جنرل ولزلی (آرتھر ولزلی) نے سندھیا کو کہلا بھیجا کہ اگر وہ اپنی فوج کو بھونسلا کی فوج سے الگ کر کے نربدا پار کر کے نہ چلا گیا تو جنگ شروع کر دی جائے گی۔ لیکن سندھیا اور بھونسلا دونوں اڑے رہے کہ پیشوا کو ان کے بے مشورے کے کوئی حق نہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے معاہدہ کرتا۔ چنانچہ سندھیا اور بھونسلا دونوں کا ارادہ تھا کہ وہ پونا آکر پیشوا کے نظام حکومت کو باقاعدہ کریں۔ سندھیا نے یہ بھی کہا کہ برہان پور اس کی سرحد میں ہے اس لئے وہاں اپنی فوج رکھنے کا اس کو حق ہے۔ غرضکہ ۳۔ اگست ۱۸۰۳ء کو برطانوی ایلچی واپس آگیا اور سندھیا اور بھونسلا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ جنرل ولزلی کو دکن کے مرہٹوں کے معاملات میں کامل ملکی، فوجی اور سفارتی اختیارات سپرد کر دیئے گئے اس لیے کہ اگر کلکتہ سے ہر معاملے کی نسبت پوچھ گچھ کی جاتی تو بڑی دشواری ہوتی۔ کلکتہ سے دکن کو کوئی جواب چھ ہفتے سے کم میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

لارڈ ولزلی چاہتا تھا کہ سندھیا اور بھونسلا کے مقبوضات پر ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں سے بھرپور وار کیا جائے۔ چنانچہ جنرل لیک کو شمال میں، جنرل ولزلی کو دکن میں اور کرنل مرے کو مغربی ہند میں مرہٹوں کے خلاف فوج کشی کے اختیارات دیدیئے گئے لارڈ ولزلی چاہتا تھا کہ سندھیا کی قوت کو خاص طور پر اتنا کمزور کر دیا جائے کہ وہ برطانوی شہنشاہیت کے لیے آئندہ کوئی خطرہ نہ پیش کر سکے۔ سندھیا کی فوج موسیو پیرون کی سرکردگی میں تھی اس لیے اس کو یہ بھی ڈر تھا کہ ممکن ہے کہ نپولین کی حکومت مشرق میں اس فوج کو اپنے مقصدوں کے لیے استعمال کرے۔ انگلستان اور فرانس کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت پیرون کی قوت کو گوارا نہیں کر سکتی تھی جس سے راجپوتانہ اور مشرقی پنجاب تک کے علاقے فرانسیسی فوجی برتری اور کارکردگی کی بدولت سندھیا کے تحت آگئے تھے۔ ولزلی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ کمپنی کی سرحد کو دریائے جمنا تک پہنچا دے تاکہ دہلی اور آگرہ براہ راست انگریزی حکومت

کے تحت آجائیں۔ اور مغل بادشاہ شاہ عالم بجائے سندھیا کے انگریزوں کے زیر اثر آجائے[1] وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ دریائے جمنا کے جنوب اور مغرب میں جو راجپوت ریاستیں تھیں انھیں عہد معاونت کے حلقے میں شریک کرلے۔ اس کے علاوہ وہ بندھیل کھنڈ کا بھی الحاق کرنا چاہتا تھا[2]۔

سب سے پہلے جنرل ولزلی نے دکن کے اس علاقے کی طرف چڑھائی کی جہاں پیشوا سندھیا اور سرکار نظام کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اس نے یہ سوچا کہ برہان پور میں سندھیا اور بھونسلا کی فوجوں نے جو اڈا بنایا ہے اسے جب تک بے اثر نہ بنایا جائے کسی دوسری طرف پیشقدمی کرنا بیکار ہوگا۔ چنانچہ اس نے سندھیا کے دکن کے سب سے بڑے اسلحہ خانہ اور قلعہ احمد نگر پر حلہ بول دیا اور اس پر قبضہ کر کے دریائے گوداوری کے جنوب میں سندھیا کا جتنا بھی علاقہ تھا چھین لیا۔ احمد نگر پر قبضہ ہو جانے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ انگریزوں نے پونا سے براہ راست اپنی مراسلت کا سلسلہ قایم کرلیا اور دوسرے یہ کہ احمد نگر سندھیا کی رسد کا بڑا مرکز تھا اس سے وہ محروم ہوگیا۔ سندھیا اور بھونسلا نے اپنی فوجوں کا رخ سرکار نظام کے شمالی ضلعوں کی طرف پھیر دیا اور اجنٹا کے پہاڑی سلسلے میں سے گزر کر جالنہ پر قبضہ کرلیا۔ جنرل ولزلی نے جب ان کا پیچھا کیا تو وہ شمال کی طرف فوج لیکر نکل گئے۔ برہان پور کے قریب اسٹیونسن کی فوج جنرل ولزلی کی فوج سے آکر مل گئی۔ لیکن پھر دونوں کی فوجیں دشمن کو مشرقی اور مغربی جانب سے گھیر لنے کے لیے الگ الگ ہوگئیں اور نگ آباد سے ۵ ہیل شمال کی جانب اسائی کے مقام پر جنرل ولزلی نے سندھیا اور بھونسلا کی متحدہ فوج سے مقابلے کا ارادہ کرلیا۔ اگرچہ مرہٹوں کی فوج کی تعداد پچاس ہزار تھی اور جنرل ولزلی کی فوج صرف پانچ ہزار تھی لیکن اسے شاندار کامیابی

---

[1] Martin, Wellesley's Despaches, Vol. III. p. 214.

[2] Roberts India under Wellesley,

ہوئی۔ لارڈ ولزلی نے اس کامیابی پر اپنے بھائی کو ان الفاظ میں تہنیتی پیام بھیجا۔ "سرکاری حیثیت سے میں جو تم سے توقع رکھتا تھا اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تم نے اپنے فرائض ادا کئے۔ میرے دل میں جو تمھاری محبت ہے اور ہمارے مشترک خون سے ہونے کا جو مجھے فخر ہے اس کا احساس نہایت بلند نقطہ پر پہنچ گیا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے جس کی محبت کے ساتھ میں عزت بھی کرتا ہوں جو امیدیں قایم کی تھیں وہ پوری ہوئیں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ آج تمھاری نیک نامی کی ہر طرف دھوم ہے تمھاری ۲۳ ستمبر والی شاندار کامیابی کی مثال نہیں ملتی لیکن مجھے جو تم سے توقع تھی وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی"[1]

۱۵۔ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو اسٹیونسن نے برہان پور پر قبضہ کر لیا اور ایک ہفتہ بعد اسیر گڈھ کا مشہور قلعہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ ۲۳۔ نومبر ۱۸۰۳ء سندھیا نے التوائے جنگ کی درخواست کی۔ جنرل ولزلی نے سندھیا پر اس شرط کی پابندی لگائی کہ وہ ایلچپور کے مشرق میں چالیس میل پر اپنا پڑاو ڈال دیگا اور وہاں سے کسی قسم کی نقل و حرکت نہیں کرے گا۔ جنرل ولزلی نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس شرط کی پابندی کرے گا تو انگریزی فوجیں اس کے علاقے میں زیادہ نہیں بڑھیں گی۔ لیکن سندھیا نے اپنے وعدے کی پابندی نہیں کی اور بھونسلا راجا کو مدد پہنچائی جبکہ اس کی فوج سرکار نظام کے علاقے میں گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن جنرل ولزلی نے ارگاؤں پر جو برہان پور سے پچاس میل مشرق میں واقع ہے بھونسلا راجا کی فوج کو شکست دی۔ اس نے ۱۷۔ دسمبر ۱۸۰۳ء دیوگاؤں کے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے کٹک کا ضلع اور دریائے وردھا کے مغرب کے سب علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔ کٹک کے علاقوں کے مل جانے سے بنگال اور مدراس کے احاطوں میں خشکی کے راستے سے ایسا سلسلہ قایم ہو گیا جس کی عرصے سے مجلس نظماء

[1] Owen, Wellington's Despatches. p. 306.

کو تمنا تھی اور جس کے معاوضے میں وہ ایک زمانے میں راجا ناگپور کو معاوضہ دینے کو بھی تیار تھی کمپنی کو اختیار مل گیا کہ اگر بھونسلا کے پیشوا یا سرکار نظام سے اختلافی معاملے پیش آئیں تو کمپنی بطور ثالث تصفیہ کرے گی۔ برار کا علاقہ سرکار نظام کو دے دیا گیا جس کی وجہ سے راجا ناگپور کی حیثیت بہت گھٹ گئی۔

جس طرح جنرل ولزلی کو دکن میں فوجی اور سیاسی اختیارات گورنر جنرل نے سپرد کئے تھے اسی طرح جنرل لیک کو شمالی ہند میں اختیارات عطا کئے گئے تھے۔ شمالی ہند میں سندھیا کا سب سے بڑا اسلحہ خانہ اور رسد کا مرکز علیگڈھ کا قلعہ تھا جس کا جنرل لیک نے محاصرہ کر کے قبضہ کر لیا۔ پیرون نے جو پہلے سے سندھیا سے بددل تھا اس لئے کہ مرہٹہ سرداروں نے جو اس سے جلتے تھے اس کے خلاف سندھیا کے کان خوب بھرے تھے، لیک کو لکھا کہ اس نے سندھیا کی ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ چنانچہ اس کو لکھنو جانے کی اجازت دیدی گئی۔ پیرون چاہتا تھا کہ اس نے پچھلے چند سالوں میں جو زر و جواہر جمع کئے تھے انھیں حفاظت سے لے کر نکل جائے اور لڑائی کی کھکھیڑ میں نہ پڑے چنانچہ وہ فرانس بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ لوئی بورکین سندھیا کی شمالی ہند کی افواج کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ بورکین اور لیک میں دہلی کے قریب مقابلہ ہوا یہ جھڑپ بہت سخت تھی لیکن جنرل لیک کو کامیابی ہوئی۔ بورکین نے ہتھیار ڈال دیئے اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ شاہ عالم کو جنرل لیک نے اپنے قابو میں کر لیا۔ لارڈ ولزلی کو ویسے تو شاہ عالم سے کوئی خاص خطرہ نہیں تھا لیکن جب سے کہ فرانسیسی افسروں کی سرکردگی میں سندھیا کی فوج نے شمالی ہند میں موثر حیثیت اختیار کر لی تھی اس وقت سے اس کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں فرانسیسی شہنشاہ دہلی کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لئے نہ استعمال کریں۔ شاہ عالم کو دہلی کے قریب کے چند گاؤں پر مقتدرانہ حقوق حاصل رہے لیکن اصلی اختیارات انگریز ریذیڈنٹ کے ہاتھ میں

آ گئے۔ شاہ عالم کو یہ اختیار تھا کہ وہ اپنا دیوان مقرر کرے۔ اس کے نام سے مالیہ جمع کیا جاتا تھا اور عدل وانصاف کا نفاذ ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے اس کو ۹۰ ہزار روپے ماہوار گزارے کے لیے ملتے تھے۔ مغل بادشاہوں کو یہ برائے نام اختیارات ۱۸۵۷ء کی شورش تک قائم رہے۔ ولزلی چاہتا تھا کہ شاہ عالم دہلی کی سکونت ترک کر کے مونگھیر چلا جائے لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ گورنر جنرل نے بھی اپنی اس تجویز پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

دہلی کی فتح کے بعد جنرل لیک نے آگرہ کے قلعہ پر قبضہ کیا جہاں اس کو سندھیا کا ۲۸ لاکھ روپے کا خزانہ ہاتھ آیا جسے انگریز افسروں اور سپاہیوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ سندھیا کی پندرہ ہزار فوج ایک فرانسیسی افسر دودرنش کی ماتحتی میں آگرہ سے ۶۵ میل پر پڑاو ڈالے پڑی تھی۔ اس کے ساتھ اعلیٰ درجے کا توپ خانہ تھا۔ یہ سندھیا کی آخری تربیت یافتہ فوج باقی رہ گئی تھی۔ چنانچہ لیک نے اس سے لسواڑی کے مقام پر یکم نومبر ۱۸۰۳ء مقابلہ کیا۔ سندھیا کی اس فوج نے بڑا سخت مقابلہ کیا لیکن اس کو شکست ہوئی۔ لیک نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کو کبھی اپنی عمر میں اتنا سخت مقابلہ نہیں کرنا پڑا[1]۔ گجرات میں سندھیا کے جتنے مقبوضات تھے ان پر کرنل مرے نے قبضہ کر لیا تھا۔ بروچ سندھیا کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اسی طرح اڑلیسہ میں جگن ناتھ اور بالاسور پر کمپنی کی افواج قابض ہو گئی تھیں۔ غرضکہ ان حالات میں سندھیا کے لیے سوائے دب کر معاہدہ کر لینے کے اور کوئی مفر نہ تھا۔ اس کی فرانسیسی افسروں کی ترتیب پائی ہوئی فوجیں فنا ہو چکی تھیں۔ راجا ناگپور کے صلح نامہ اڑگاؤں پر دستخط کر دینے کے بعد آخر سندھیا نے بھی گورنر جنرل کی پیش کی ہوئی شرطوں کو تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور سرجی ارجن گاؤں کے مقام پر ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء صلح نامہ پر دستخط کر دیئے جس کے بموجب سندھیا

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. IV, p. 153

نے اپنے وہ تمام علاقے کمپنی کے حوالے کر دیئے جو دریائے گنگا اور دریائے جمنا کے درمیان واقع تھے۔ جے پور۔ جودھ پور اور گوہد کے شمال میں جو اس کے مقبوضات تھے ان سے بے دخل ہونا پڑا۔ پیشوا سے انگریزوں نے جو معاہدہ بسین کیا تھا اس کی شرطوں کو بھی سندھیا نے تسلیم کیا۔ احمد نگر پیشوا کو دیا گیا۔ گجرات میں بروچ اور دوسرے علاقے کمپنی کے تصرف میں آئے۔ سندھیا نے ان تمام دعووں سے دست برداری کا اعلان کیا جو سرکار نظام، گیکواڑ اور پیشوا کے خلاف اس کو حاصل تھے۔ اس نے راجپوتانہ کے ان راجاؤں اور جاگیرداروں سے بے تعلقی کا اظہار کیا جو کمپنی سے ساتھ معاہدے کر چکے ہیں۔ سندھیا نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ فرانسیسوں کو ملازمت سے علحدہ کر کے اپنے خرچ پر انگریزی فوج سرحد کے قریب رکھے گا۔ سندھیا کے دربار میں انگریز ریزیڈنٹ رہا کرے گا۔ شمال میں نواب اودھ سے جو ضلعے ملے تھے اور اب معاہدہ سرجی ارجن گاؤں کی رو سے جو دوآبہ میں علاقے حاصل ہوئے انھیں ملا کر ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا جو صوبہ شمالی مغربی کہلاتا تھا اور جس کو اب صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (یو۔پی) کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کے بعد سندھیا کا وہ تمام نظم و نسق جس پر اس کے اقتدار کا دارومدار تھا پاش پاش ہو چکا تھا۔ دربار مغلیہ سے جو اس کے تعلقات تھے اور جن تعلقات کو اپنے غلبہ کے استحکام کے لیے استعمال کرتا تھا توڑ ڈالے گئے۔ دربار پونا میں اس نے جو اثر قایم کر لیا تھا اور جس کی وجہ سے مرہٹہ برادری میں اس کی اہمیت تھی وہ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ جنرل لیک نے بھرت پور، جے پور، جودھپور، گوہد اور بوندی کے راجاؤں سے جو معاہدے کئے ان کی رو سے یہ سب ریاستیں سندھیا اور ہلکر کی باجگذاری سے آزاد ہو گئیں اور انگریزی حلقۂ اثر میں شامل ہو گئیں۔

ہلکر سے جنگ سندھیا اور بھونسلا نے شروع میں کوشش کی تھی کہ ہلکر ان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف ملجائے لیکن وہ الگ رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سندھیا کی کمزوری سے وہ آئندہ فائدہ

اٹھائے گا۔ لیکن بعد میں اس نے دیکھا کہ انگریزوں نے جس طرح سندھیا اور بھونسلا کو زیر کر لیا ہے اور انھیں ان کے دیرینہ چوتھ کے حقوق سے راجپوتانہ اور دوسرے علاقوں میں محروم کر دیا ہے اسی طرح وہ اسے بھی محروم کر کے رہیں گے۔ اب اس نے سندھیا سے نامہ و پیام شروع کیا جس کی اطلاع انگریزی حکومت کو کر دی اس لئے کہ وہ ہلکر پر خار کھائے ہوئے تھا۔ اس نے لیک کے پاس اپنے وکیل بھیجے اور کہلا بھیجا کہ راجپوتانہ، دوآب اور بندیلکھنڈ میں قدیم سے اس کو چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل ہے، اس میں کسی طرح مزاحمت نہ کی جائے اسی طرح کا ایک خط اس نے جنرل ولزلی کو بھیجا کہ دکن کے بعض علاقے جو اس کے خاندان کے تحت عرصے سے رہے ہیں ان پر انگریزی فوجیں قابض و متصرف ہوگئی ہیں۔ اگر ان علاقوں کو فوراً حوالے نہ کیا گیا تو سینکڑوں کوس تک ملک کے ملک لوٹ لئے جائیں گے اور مرہٹہ فوج انھیں روند کر رکھ دیگی اور لاکھوں خدا کی مخلوق پر مصائب نازل ہو جائیں گے۔[1] اس کے کچھ عرصے بعد ہلکر نے راجا جے پور کے علاقے میں یورش کر دی۔ اس پر لارڈ ولزلی نے جنرل ولزلی اور جنرل لیک کو ۱۶۔ اپریل ۱۸۰۴ء ہلکر کے خلاف جنگ کرنے اور اس کی یورشوں کی روک تھام کرنے کو لکھا۔ جنرل لیک نے فوراً جے پور کا رخ کیا اور ہلکر کا پیچھا کر کے اسے جے پور کے علاقے سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد جنرل لیک نے بجائے اس کے کہ خود ہلکر کا پیچھا جاری رکھتا کرنل مانسن کو اس کام پر مامور کیا۔ کرنل مانسن اگرچہ دلیر اور جانباز تھا لیکن فن حرب سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ صرف ڈھائی ہزار فوج لے کر ہلکر کے علاقے میں گھستا چلا گیا اور نہ رسد کا کوئی انتظام کیا اور نہ دریاؤں اور ندیوں کو پار کرنے کا سامان ساتھ لیا جو بارش کی وجہ سے طغیانی کی حالت میں تھیں۔ جنرل ولزلی نے کرنل مرے کی جو فوج گجرات

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. p. 107

سے مانسن کی کمک کے لئے بھیجی تھی وہ کہیں راستہ میں رک گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہلکر نے مانسن کی فوج کو گھیر لیا اور اس کی رسد کے راستے بند کر دیئے۔ مانسن کو پسپائی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ ہلکر نے مانسن کی بھاگتی ہوئی فوج کا پیچھا کیا۔ بہت سی سپاہ کو گولی کا نشانہ بنایا اور سارے ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ مانسن آگرہ کی طرف جان بچا کر بھاگ گیا۔ ہلکر نے آگے بڑھ کر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ وہ چاہتا تھا شاہ عالم کو انگریزوں کے قابو سے نکال کر اپنی حراست میں اس طرح سے لے لے جس طرح سندھیا نے لے لیا تھا اور اس کے ذریعہ سے اپنی قوت مضبوط کرے۔ لیکن کرنل آکٹرلونی نے بڑی بہادری سے دہلی کی مدافعت کی اور نو دن تک ایسے دشمن کے مقابلے میں بچائے رکھا جس کے ساتھ بیس ہزار فوج تھی اور ایک سو سے زائد بڑی توپیں تھیں مایوس ہو کر ہلکر نے دہلی کا محاصرہ اٹھا لیا اور اپنی پیدل فوج اور توپوں کو راجا بھرت پور کے علاقے میں بھیجدیا اور سواروں کو لے کر دوآبہ کا رخ کیا تاکہ اس زرخیز علاقے کو خوب لوٹے۔ راجا بھرت پور نے اگرچہ انگریزوں کی فتح مندی کے زمانے میں جنرل لیک سے اتحاد کا معاہدہ کیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہوا کا رخ دوسری طرف ہے تو یہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر ہلکر سے مل گیا۔

جنرل لیک دیسی اور انگریزوں سواروں کے چھ رسالے اور توپ خانہ لے کر ہلکر کا پیچھا کرنے دوآبہ کی طرف روانہ ہوا اور منزل پر منزل طے کر کے فتح گڈھ (فرخ آباد) کے قریب اس کو آلیا۔ ہلکر مقابلے کی تاب نہ لا کر اپنی پیدل فوج سے ملنے کے لئے بھرت پور کی طرف بھاگا۔ اس اثناء میں جنرل فریزر نے اس کی پیدل فوج کو ڈیگ کے مقام پر سخت شکست دیدی تھی جنرل لیک ہلکر کے تعاقب میں بھرت پور تک پہنچ گیا اور ہلکر مالوہ کی طرف نکل گیا۔ چونکہ بھرت پور کے راجا سے ہلکر کو برابر ہر قسم کی مدد ملتی رہی تھی اس واسطے جنرل لیک نے فیصلہ کیا کہ بھرت پور کے قلعہ کو فتح کرنا چاہئے۔ اس قلعہ کے گرد نہایت اونچی اور موٹی مٹی کی دیوار تھی جسکی

حفاظت کے لئے تھوڑی تھوڑی دور پر بُرجیاں بنی ہوئی تھیں اور دیوار کے چاروں طرف ایک گہری خندق تھی جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ قلعہ میں راجا بھرت پور کی آٹھ ہزار فوج کے علاوہ ہلکر کی پیدل فوج کی بھاگی ہوئی ٹکڑیاں بھی تھیں۔ جنرل لیک نے بغیر قلعہ شکن توپوں اور کسی ماہر انجینیر کے مشورہ کے محاصرہ بڑی سرگرمی سے شروع کر دیا۔ ہر قسم کی تیاری کے بعد چار مرتبہ قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی آخر محاصرہ اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا جس کی وجہ سے انگریزوں کو سخت ذلت اٹھانا پڑی۔ لیکن راجا بھرت پور نے دیکھا کہ ہلکر اب اس کی زیادہ عرصے تک مدد نہ کر سکے گا تو اس نے جنرل لیک سے صلح کا نامہ و پیام شروع کر دیا اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ انگریزی فوج کی قوت مزید جنگی سامان اور کمک پہنچنے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ معاہدے کی رو سے طے ہوا کہ راجا چار قسطوں میں بیس لاکھ روپے بطور تاوان جنگ انگریزوں کو ادا کرے اور کمپنی کے دشمنوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھے۔ کمپنی کی بے اجازت کسی یورپین کو اپنے ہاں ملازم نہ رکھ سکے گا۔ ان شرطوں کے منظور ہو جانے کے بعد محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

سندھیا، ہلکر کی اس ساری لڑائی کے زمانہ میں، اپنی حکمت عملی کو برابر بدلتا رہا۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ ہلکر کو کامیابی ہو رہی ہے تو گورنر جنرل سے اس کے خطوط کا لہجہ سخت اور اس کے مطالبات کی فہرست طویل ہو جاتی تھی لیکن جب وہ انگریزوں کا پلہ بھاری دیکھتا تو فوراً نرم لہجہ اختیار کر لیتا تھا۔ لیکن اس اثناء میں اس کو برابر یہ شکایت رہی کہ سرجی ارجن گاؤں کے معاہدے کی جو توجیہ پیش کی گئی ہے جس کی رو سے اس کو قلعہ گوالیار راجہ گوہد کے حوالے کرنا پڑا، درست نہیں۔ گوالیار کا قلعہ صرف اپنے استحکام کی وجہ سے سندھیا کو عزیز نہ تھا بلکہ عظمت شاہی کی وجہ سے اس کی بڑی قدر تھی۔ خود جنرل ولزلی نے لارڈ ولزلی کو لکھا کہ معاہدہ کی رو سے قلعہ سندھیا ہی کے تحت رہنا چاہئے۔ معاہدہ کی دفعہ ۹ میں اس کی صراحت تھی کہ جے پور

جودھپور اور گوہد کے جنوب کے جن علاقوں میں سندھیا کے عامل مالگزاری وصول کرتے رہے ہیں وہ اسی کے تحت رہیں گے۔ اس بنا پر گوالیار سندھیا کو واپس دینا چاہئے تھا۔ لیکن گورنر جنرل نے یہ استدلال کیا کہ دفعہ ۹ کا اطلاق ان علاقوں کے لیے ہے جو سندھیا سے کمپنی نے چھینے ہیں اور جو جے پور، جودھپور اور گوہد کے جنوب میں واقع ہیں۔ لیکن چونکہ گوالیار کو کمپنی کی فوج نے سندھیا سے نہیں لیا بلکہ امباجی سے چھینا ہے اس واسطے دفعہ ۹ کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ جنرل ولزلی نے اس بات کی تصدیق کی کہ معاہدہ کے وقت سندھیا نے اس صراحت کے بعد دستخط کیے جو اگرچہ زبانی تھی، کہ گوالیار ان علاقوں میں شامل ہوگا جو اس کو واپس کئے جائیں گے۔ جنرل ولزلی نے اپنے ایک مراسلہ میں اپنے بھائی لارڈ ولزلی کی حکمت عملی پر اس طرح سے تنقید کی ہے۔ "میں جانتا ہوں کہ گورنر جنرل اپنے من گھڑت استدلال سے گوالیار کے قلعہ کا دعویدار ہوگا۔ لیکن یہ استدلال نرا من گھڑت ہوگا اور اصلی واقعات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا میں گوالیار کو یا برطانوی ہند کے کسی دوسرے سرحدی مقام کو دس مرتبہ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں تاکہ ہماری دیانت داری کی ساکھ برقرار رہے پچھلی جنگ اور اس کے بعد کی صلح سے ہمیں جو فائدے اور نیک نامی حاصل ہوئی ہے انھیں بحث و مباحث میں ضائع نہ کرنا چاہئے جو بین الاقوامی قوانین کی کھینچ تان کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور جنھیں اس ملک میں کوئی نہیں سمجھتا۔ جنگ کی دشواریوں اور صلح کی گفت و شنید میں مجھے جس چیز سے سب سے زیادہ مدد ملی وہ بھروسے کا جذبہ تھا جو ہماری بات پر کیا جاتا ہے"[1]۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار جنرل ولزلی نے اپنے چھوٹے بھائی ہنری ولزلی والے خط میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ سندھیا کو غیر مطمئن رکھنے سے انگریزوں کے لئے الجھنیں پیدا ہوں گی۔ وہ لکھتا ہے "مجھے گورنر جنرل سے

لہ[1] Gurwood, The Duke of Wellington's Indian Despatches Vol. III, p. 150

قلعہ گوالیار پر قبضہ کرنے کے متعلق اختلاف ہے۔ میرا یہ اختلاف حق اور حکمت عملی دونوں پر مبنی ہے۔ گورنر جنرل نے معمول کے موافق مین گڑھت استدلال سے کام لیا ہے لیکن مجھے پھر بھی اس سے اختلاف ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے مرہٹوں سے جو معاہدے کئے ان میں اعتدال اور مصالحت کے اصول کو برتا تھا جس کی ہر طرف تعریف کی گئی تھی۔ اب چاہے یہ اصول صحیح ہو یا درست لیکن یہ واقعہ ہے کہ اب اس اصول کو ترک کیا جارہا ہے۔ ہمارے دشمن ہم سے بیزار ہیں اور بد دیانتی کی کھلم کھلا شکایت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس ملک کا امن و امان خطرہ میں نظر آرہا ہے۔ پیارے ہنری! ہمیں کلکتہ میں ایک ایسے شخص کی سخت ضرورت ہے جو گورنر جنرل کو صاف صاف تمام باتیں بتائے۔ جب سے تم اور مالکم وہاں سے چلے آئے اس کے قریب کے لوگوں میں کوئی ایسا نہیں جو ان مسائل کو سمجھ سکے اور اس میں اتنی جرات ہو کہ ان کے متعلق اس سے بحث کرسکے اور اسکے خیالات غلطی پر مبنی ہوں تو انھیں غلط کہہ سکے۔ گوالیار کے متعلق میں اور مالکم اور جنرل لیک اور وب سب ہی کا یہ خیال ہے کہ سندھیا سے جو معاہدہ ہوا ہے اسکی رو سے گوالیار اسکو واپس دینا چاہئے[1]۔

لیکن لارڈ ولزلی اپنی اس ضد پر اڑا رہا کہ گوالیار گوہد کے رئیس کو دیا جائیگا جو پہلے سندھیا کا باجگذار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھیا نے بالکل مایوس ہو کر چالیس ہزار کی سپاہ فراہم کی اور انگریزوں کے خلاف ہلکر راجا بھرت پور اور امیر خاں سے اتحاد کیا۔ مسٹر وب کے انتقال پر مسٹر جنکنس سندھیا کے دربار میں انگریزی ریزیڈنٹ مقرر ہوا۔ اس نے جب سندھیا کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو اس نے اس سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی اور ۲۳ جنوری ۱۸۰۵ء میں وہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ لیکن سندھیا کے پروانہ پر وہ راستہ سے دربار پھر واپس آیا تو اس کا سامان لوٹ لیا گیا اور اس کو نظر بند کر دیا گیا۔ اب اس نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ بھرت پور کی طرف اس بہانے سے

[1] Owen >Wellington's Despatches, p. 395-7.

پیشقدمی کی کہ وہ راجا بھرت پور اور انگریزی حکومت میں صلح و صفائی کرا رہے جارہا ہے۔ سندھیا نے یہ بھی صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ چونکہ اس کی مالی حالت بالکل خراب ہو گئی ہے اس لئے وہ حملہ کر کے انگریزوں کے اتحادیوں سے روپیہ وصول کرے گا۔ چنانچہ اس نے ساگر (بھوپال) کی طرف کوچ کیا۔ لارڈ ولزلی کو جب سندھیا کی نقل و حرکت اور ریزیڈنٹ کی حراست کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت بگڑا لیکن وہ اس وقت اس سے کھلم کھلا بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ گورنر جنرل کی حکمت عملی کو سندھیا نے اس کی کمزوری پر محمول کیا۔ جب سندھیا کی فوجیں بھرت پور کی طرف بڑھنے لگیں تو ولزلی نے جنرل لیک کو حکم دیا کہ اس کو دریائے چنبل سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ لیکن بھرت پور کے محاصرہ کی وجہ سے انگریزی فوجوں کی اخلاقی حالت ایسی پست تھی کہ وہ سندھیا کا غالباً اچھی طرح سے مقابلہ نہ کر سکتیں۔ چنانچہ جنرل ولزلی کے مشورہ کے مطابق لارڈ ولزلی نے سندھیا کو واپس جانے کے لیے سرکاری خزانہ سے معقول رقم دلوا دی۔

اس اثنا میں راجا بھرت پور اور انگریزوں میں صلح ہو جانے سے جنرل لیک کو یکسوئی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس نے دریائے چنبل کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا جس کے دوسری طرف ہلکر اور امیر خاں اپنے تیس ہزار سواروں کے ساتھ سندھیا سے آکر مل گئے تھے۔ جنرل لیک نے سندھیا کو لکھا کہ اگر انگریزی حکومت کے ریزیڈنٹ مسٹر جنکنس کو دس روز کے اندر حراست سے نہ چھوڑا گیا تو انگریزی حکومت اور سندھیا کے دوستانہ تعلقات منقطع سمجھے جائیں گے۔ سندھیا نے ریزیڈنٹ کو حراست سے رہا کر دیا اس لئے کہ اس کو امید دلائی گئی کہ اگر وہ ہلکر سے تعلقات نہ رکھے تو انگریزی حکومت اس کو گوالیار واپس دینے کے مسئلہ پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ سندھیا کو ہلکر سے اتحاد کر لینے میں جب زیادہ فائدہ کی امید نہ رہی تو اس نے اس کی طرف سے بے رخی اختیار کر لی۔ لارڈ ولزلی نے جواب مرہٹہ سیاست کی پیچیدگیوں سے بیزار ہو چلا تھا مصلحت کی خاطر گوالیار سندھیا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن

اسے ایسا کرنے سے پہلے استعفیٰ دینا پڑا۔ ہلکر اس کے ساتھی امیر خاں کی فوج اب بھی وسط ہند اور مالوہ میں انگریزوں کے اتحادیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دے رہی تھی۔ ولزلی نے مجلس نظماء کو یقین دلایا کہ ہلکر سے لڑنے کے سبب سے سیاسی تعلقات کا وہ نظام مطلق متاثر نہ ہوگا جو برطانوی حکومت اور ہندوستان کے مختلف والیان ریاست کے درمیان وجود میں آگیا ہے بلکہ ان تعلقات سے ہمارے وسائل کو ایسا استحکام حاصل ہوگا کہ اسے ہمارے دشمن ہلا نہیں سکیں گے۔ لیکن مانسن کی شکست اور بھرت پور کے محاصرہ کی ناکامی سے انگلستان میں ولزلی کے مخالفوں کو اس پر نکتہ چینی کا اچھا موقع مل گیا۔ فلپ فرانسس نے پارلیمنٹ میں لارڈ ولزلی پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ جب سے ۱۷۸۴ء کا انتناعی قانون (قانون پٹ) منظور ہوا ہے اس وقت سے ہمیں سوائے جنگ اور الحاق کے اور کوئی خبر نہیں ملی۔ میں ایوان سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ مجھے بتائے کہ اس کے سوا ہم نے اور کیا سنا۔ بہت سی فتحیں ہوئیں۔ نئے نئے ملک سلطنت برطانیہ میں شامل کئے گئے۔ کبھی کبھی کچھ عرصے کے لئے ستانے کا وقفہ آیا تاکہ دم لے کر پھر وہی لڑائی بھڑائی چھیڑ دی جائے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ان سب جنگوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کمزور نے طاقتور پر حملہ کیا۔ اس دعوے کو یقین کرنے کے لئے نہایت واضح شہادت کی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت ہمیشہ جہاں تک ہوسکا امن و امان کے قیام کے لئے کوشاں رہی ہے۔ لیکن برطانوی حکومت اپنے اس نیک ارادے کو کبھی بروئے کار نہ لاسکی اسواسطے کہ ہندوستانی والیان ملک نہایت بے چین اور سرکش واقع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اپنے ساتھ بڑی بے انصافی کریں گے اگر ہم ان پر حملہ کرنے سے بچیں۔ یکایک قصہ یہ ہے کہ خونخوار اور سرکش بھیڑ حلیم، نرم مزاج اور اعتدال پسند بھیڑئیے کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔"[1]

[1] Hansard parliarventary Debats Vol I p. 886-7

فرانسس کے علاوہ پارلیمنٹ کے دوسرے ارکان بھی لارڈ ولزلی کی الحاقی حکمت عملی کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ خود وزارت وقت نے دشواری محسوس کی کہ وہ ارکان پارلیمنٹ کے اعتراضوں کا معقول جواب دے سکے۔ مجلس نظماء تو پہلے ہی سے ولزلی کی سخت مخالف تھی۔ اب چارلس گرانٹ مجلس نظماء کا صدر ہوگیا تھا جو لارڈ ولزلی کا سخت مخالف تھا۔ اب تک وزارت نے مجلس نظماء کی مخالفت کے باوجود ولزلی کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ ولزلی کی زیادہ عرصے تک تائید وحمایت نہیں کی جاسکتی اس واسطے کہ پارلیمنٹ کے ہر گوشہ سے اس کی حکمت عملی سے اختلاف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وارن ہیسٹنگز اور ولزلی کے ساتھ پارلیمنٹ اور مجلس نظماء نے مختلف اصول اختیار کئے۔ مجلس نظماء نے وارن ہیسٹنگز کی برابر تائید کی تھی اور پارلیمنٹ نے برابر اس کی مخالفت کی تھی لیکن ولزلی کی پارلیمنٹ نے آخر وقت تک حمایت کی اور مجلس نظماء نے برابر اس کی مخالفت کی۔ پارلیمنٹ میں انگریزوں نے ولزلی کا مواخذہ کرنے کی تجویز پیش کی لیکن یہ تجویز رد کردی گئی۔ اس کے برخلاف پارلیمنٹ نے لارڈ ولزلی کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ولزلی کا چھوٹا بھائی جنرل ولزلی (جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن ہوا) ہندوستان سے انگلستان واپس جاچکا تھا۔ اس نے پٹ اور کاسل رے سے ملاقات کی اور اپنے بھائی کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے دیکھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پٹ نے کارنواس سے ایک گفتگو کے دوران میں صاف طور کہہ دیا تھا کہ ولزلی نے بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام کیا ہے اور اس کو زیادہ عرصے تک گورنر جنرل کی حیثیت سے نہیں رکھا جاسکتا[1]۔ جنرل ولزلی نے جب اپنے بھائی کے خلاف انگلستان میں یہ فضا دیکھی تو اس کو ایک خط میں صاف طور پر لکھدیا کہ "مجھے بڑا خطرہ ہے کہ آپ کو عہدہ سے الگ

---

[1] Ross, Correspondence of Marquis Cornwallis. Vol. III p. 522

نہ کر دیا جائے۔[1] ان حالات میں ولزلی نے اپنا استعفاء پیش کر دیا۔ ۳۰ر جولائی ۱۸۰۵ء لارڈ کارنوالس کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا اور اس کو ہدایت کی گئی کہ ہندوستان جاکر ملک میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش کرے۔

ولزلی کی خارجی سیاست

اس میں شبہ نہیں کہ ولزلی نے عہد معاونت کے اصول سے فرانسیسیوں کے اثر کو ہندوستانی والیان ملک کے دربار میں ختم کر دیا تھا اور جو فوجیں فرانسیسی افسروں کے زیر تربیت تیار کی گئی تھیں وہ منتشر کر دی گئی تھیں لیکن ولزلی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت انگلستان انقلابی فرانس کے ساتھ حیات اور ممات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور فرانس انگلستان کی مشرقی سلطنت پر کاری ضرب لگانے کے لئے آمادہ تھا۔ ۱۷۹۹ء میں ولزلی نے پرتگالی حکومت سے معاملات طے کرنے کے بعد گوا میں انگریزی محافظ فوج متعین کر دی تاکہ فرانسیسی اس بندرگاہ پر قبضہ کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے اور انگریزی مفاد کے خلاف نہ استعمال کر سکیں۔ ۱۸۰۱ء میں برطانیہ اور ڈنمارک میں دوبارہ میں جنگ چھڑ گئی تو ولزلی کو بڑا اچھا موقع ملا کہ وہ ٹرانک بار اور سیرام پور پر جو ڈنمارک کے مقبوضات تھے قبضہ کر لے۔ جس وقت ڈنمارک غیر جانبدار تھا تو ولزلی کو اندیشہ تھا کہ اس کے مقبوضات کو فرانس اپنا مرکز نہ بنا لے۔ سیرام پور کلکتہ سے اس قدر قریب تھا کہ وہاں سے انگریزی صدر مقام کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ پھر اس کی اطلاعیں بھی پہنچیں تھیں کہ سیرام پور میں انقلابی فرانسیسیوں (جے کوبنز) نے اپنا مرکز قائم کیا ہے۔ دشمن ان مراعات سے جو ڈنمارک کو دریائے ہنگلی میں جہازرانی کے متعلق حاصل تھیں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ غرضکہ ڈنمارک کے دونوں مقبوضات پر قبضہ کر لینے سے یہ اندیشہ جاتا رہا۔

نپولین کا عرصے سے خیال تھا کہ وہ خشکی کے راستے سے ہندوستان

---

[1] Roberts, India under Wellesley. p. 264

پر حملہ کرکے سلطنت برطانیہ کی شہ رگ پر ضرب لگائے گا۔ چنانچہ اس نے زار روس پال اول سے جو معاہدہ کیا اس کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ ۳۵ ہزار فرانسیسی فوج ڈینیوب کے دریائی راستہ سے بحر اسود اور وہاں سے استرا خان جائیگی جہاں روس کی ۳۵ ہزار فوج تیار رہے گی۔ یہ دونوں لشکر ہرات اور قندھار ہوتے ہوئے دریائے انڈس کی طرف بڑھیں گی[1] یہ منصوبہ چاہے کتنا ہی ناقابل عمل کیوں نہو لیکن نپولین جیسے بے باک شخص سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اس پر عمل کر بیٹھتا۔ چنانچہ ولزلی نے اس خطرہ کی روک تھام کرنے کے لیے پہلے ایک ایرانی مہدی علیخاں نامی کو جو کمپنی کی ملازمت میں عرصے سے تھا طہران روانہ کیا تاکہ وہ شاہ ایران کو انگریزی حکومت کا موافق بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد ولزلی نے مالکم کو بہایت قیمتی تحفے دیکر طہران روانہ کیا۔ مالکم نے شاہ ایران سے دو معاہدے کئے۔ ایک تجارتی اور دوسرا سیاسی۔ تجارتی معاہدہ کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اجازت مل گئی کہ وہ ایرانی بندرگاہوں کو تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرے اور وہاں اپنی کوٹھیاں بنائے۔ سیاسی معاہدہ کی رو سے زماں شاہ والئی افغانستان اور حکومت ایران نے وعدہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔ ولزلی نے اپنے اس کارنامہ کے متعلق بڑے فخر سے مجلس نظماء کو لکھا کہ "برطانوی حکومت اور ایک ایسی مملکت کے درمیان اتحاد کے مضبوط تعلقات قایم ہوگئے ہیں جس کے وسائل انگریز قوم کے دشمنوں کی دسترس میں آسکتے ہیں اور ان سے ہمارے مشرقی مقبوضات کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے[2]"

لیکن جب روس اور ایران میں جنگ چھڑی تو شاہ ایران نے سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کا حوالہ دے کر جو مالکم کے ساتھ ہوا تھا لارڈ ولزلی سے امداد طلب

---

[1] Roberts, India under Wellesley, p. 144.

[2] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, p.

کی لیکن روس اور برطانیہ میں چونکہ اتحاد ہو چکا تھا اس لئے ولزلی کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتا تھا۔ شاہ ایران نے اپنے ایلچی فرانس روانہ کئے تاکہ ادھر سے کچھ مدد ملے۔ نپولین نے جنرل گاردان کو اپنے سفیر کی حیثیت سے طہران روانہ کیا جس نے جاکر شاہ ایران سے یہ معاہدہ کیا کہ فرانس روس کے خلاف ایران کی مدد کرے گا۔ اس کے صلہ میں شاہ ایران نے وعدہ کیا کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے جو فرانسیسی فوج اس کے ملک میں سے گزرے گی اس کو رسد بہم پہنچانے کا وہ ذمہ لیتا ہے اور وہ اس کے علاوہ فوجی امداد سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ لیکن اس اثنا میں یورپ کی بین الاقوامی سیاست میں زبردست تبدیلی ہوگئی۔ سنہ ۱۸۰۷ء میں نپولین اعظم نے روس کو شکست دی اور تلسٹ کے مقام پر روس اور فرانس میں جو معاہدہ ہوا اس کے بموجب یہ طے ہوا کہ زار الگزنڈر فرانس کے ساتھ اتحاد میں شریک ہوگا۔ چنانچہ وسط ایشیا اور ایران کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے منصوبے پھر سوچے جانے لگے لیکن اس معاہدہ کے ایک سال کے اندر ہی نپولین کو یورپ میں دوسرے ایسے اہم مسائل پیش آئے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا خیال پس پشت ڈال دینا پڑا۔ لیکن نپولین کے ان مشرقی منصوبوں سے اتنا ضرور ہوا کہ ولزلی نے اپنی سیاست کے نقطۂ نظر کو ہندوستان کی حدود سے محدود نہ کیا بلکہ برطانوی شہنشاہیت کی مشرقی ضرورتوں کو اپنا محرک عمل بنایا۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں ولزلی چاہتا تھا فرانسیسی مقبوضہ آئل آف فرانس کے خلاف سیلون سے بحری بیڑہ بھیجے۔ جب سے فرانس اور انگلستان کی جنگ شروع ہوئی تھی اس وقت سے اس جزیرے سے ۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ کا برطانوی مال لوٹا جا چکا تھا اور بے شمار جہاز ڈبوئے جا چکے تھے۔ اس مہم پر جنرل ولزلی جانے کو تیار تھا لیکن شاہی بحریہ کے اڈمیرل رینیر نے اس مہم میں اسوقت تک شرکت کرنے سے انکار کیا جب تک کہ اس کو حکومت انگلستان سے احکام نہ ملجائیں۔ بورڈ آف کنٹرول نے ولزلی کے منصوبہ کی تعریف کی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اڈمیرل رینیر نے جو کچھ کیا وہ ادائے فرض

کے سلسلہ میں کیا اس لیے کہ جب تک اس کو براہ راست احکام نہ ملیں وہ کسی بحری مہم کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا تھا۔ ولزلی نے جو فوج اس مہم کے لیے تیار کی تھی وہ بورڈ آف کنٹرول کے احکام کے بموجب سرڈیوڈ بیرڈ کی ماتحتی میں سمندر کے راستے سے مصر بھیجدی گئی۔ لیکن پیشتر اس کے سرڈیوڈ بیرڈ وہاں پہنچے فرانسیسی فوج کو سر رالف ایر کرومبی کے ماتحت انگریزی فوج نیچا دکھا چکی تھی اور فرانسیسی افسروں نے ہتیار ڈال دیے تھے۔

فورٹ ولیم کالج

وارن ہسٹنگز نے سب سے پہلے اس جانب توجہ کی کہ کمپنی کے ملازمین کی واقفیت اہل ہند کے متعلق بڑھائی جائے۔ چنانچہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اس نے سرولیم جونس کے زیر صدارت اسلئے قایم کی تھی کہ مشرقی علوم وفنون کو انگریزی زبان میں منتقل کیا جائے تاکہ کمپنی کے ملازمین ان کتابوں کو انگریزی میں پڑھ کر ہندوستان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ ولزلی نے محسوس کیا کہ اکثر ملازم کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کرتے جو انھیں ان کی آئندہ ذمہ داریوں کے متعلق تیار کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان پر آئندہ انگریزوں کی حکومت عارضی نوعیت کی نہ ہو بلکہ ایسے لوگ حکومت کریں جو برطانوی شہنشاہیت کا اصولی احساس رکھتے ہوں۔ اس نے بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) کو کمپنی کے ملازموں کی تعلیم کے متعلق جو اسکیم بنا کر بھیجی اس میں اس نے اس امر پر زور دیا کہ اس کی بنیاد انگلستان میں قایم ہونی چاہیئے اور تعلیمی عمارت کا بالائی حصہ باقاعدہ ہندوستان میں مکمل ہونا چاہیئے چنانچہ اس نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج اسی غرض کے لیے قایم کیا۔ کمپنی کے سیول ملازم ہندوستان آنے کے بعد یہاں تین سال رکھے جاتے تھے۔ انھیں ہندوستانی زبانیں، ہندوستانی تاریخ اور ہندؤوں اور مسلمانوں کے قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کے اخراجات کی پابجائی کے لیے اس نے کمپنی کے مالیہ کو زیر بار نہیں کیا اس لئے کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً مجلس نظار اس پوری اسکیم کی

مخالفت کرتی۔ اس نے کمپنی کے تمام سیول ملازموں کی تنخواہوں سے تھوڑی سی رقم وضع کرنے کا قاعدہ مقرر کر دیا جسے سب نے بخوشی منظور کر لیا۔ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول کی منظوری کا انتظار کئے بغیر یہ کالج قایم کر دیا جس کی وجہ سے بورڈ نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور اس کے تسلط الغانہ طرز عمل کو قابل اعتراض ٹھہرایا۔ لیکن ایک مرتبہ کالج قایم ہو جانے کے بعد اس کا توڑنا مشکل تھا۔ بورڈ نے کالج کو توڑنے کی بہترین ترکیب یہ سوچی کہ اسی قسم کے کالج بمبئی اور مدراس میں بھی قایم کئے جائیں لیکن ولزلی نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ایسا کرنے سے تعلیم میں یکسانیت نہیں رہ سکے گی جو ایک مرکزی ادارہ ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے جسے مرکزی حکومت اپنی نگرانی میں چلاتی ہو۔ بورڈ آف کنٹرول نے وزارت وقت کے زیر اثر فورٹ ولیم کالج کو توڑنے کے خیال کو ملتوی کر دیا لیکن مجلس نظماء اس پر برابر اڑی رہی۔ لیکن ولزلی نے اس بات میں اپنے ان دوستوں سے جو وزارت انگلستان کے رکن تھے پرزور اپیل کی اور درخواست کی کہ کالج کو تباہ ہونے سے بچائیں۔ اس واسطے کہ اس کو اپنے اس کام پر تسخیر میسور سے زیادہ فخر و ناز تھا۔ آخر بورڈ آف کنٹرول نے کچھ عرصے کیلئے اس کالج کو باقی رہنے کی اجازت دے دی۔[1]

لارڈ ولزلی کا کارنامہ

ولزلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سر جان شور کی عدم مداخلت کی کمزور حکمت عملی سے انگریزی حکومت کے خلاف جو عام طور پر ہندوستانی والیان ملک میں بے اعتباری پیدا ہو گئی تھی اس کو اس نے دور کر دیا۔ ولزلی کو اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ہندوستان کے حالات کا قدرتی اقتضا یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے بجائے ملک کی سیاست میں پہل کرے۔ اس نے اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں کوئی ایسی زبردست

---

[1] Martin, Wellesley's Despatches, Vol. II, p. 640-66.

سلطنت قایم نہ ہوجائے جو اپنے وسائل اور فوجی قوت کی وجہ سے سب پر غلبہ حاصل کرلے اس وقت تک ملک کی ابتری اور انتشار کو دور نہیں کیا جاسکتا جو دیسی حکمرانوں کے آپس کے آئے دن کے جھگڑوں کا لازمی نتیجہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اگرچہ ہندوستان میں اب ایک زبردست سلطنت قایم کرلی تھی لیکن اس کے ارباب حل وعقد کی ذہنیت ابھی تک تاجرانہ تھی۔ وہ فوجی کارروائیوں کو بری نظر سے دیکھتے تھے اس واسطے کہ ان سے ان کے سالانہ منافع میں کمی ہوجاتی تھی۔ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران) اور کورٹ آف ڈائرکٹرز (مجلس نظماء) کو صاف صاف بتایا کہ کمپنی کی تاجرانہ ذہنیت کو اب بدلنا ہوگا اور کمپنی کے شاہانہ فرائض اس کے تجارتی مقاصد پر غالب رہنے چاہئیں۔ ولزلی نے عہد معاونت کے اصول کے ذریعہ انگریزی سیادت کو اکثر والیان ملک سے منوا لیا اور اسطرح کمپنی کو تقریباً نصف ہندوستان کا حمایتی یا نگہبان بنادیا۔ باقی نصف پر کمپنی کا پرچم لہرانے لگا۔ ولزلی کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسی سیاسی حیثیت حاصل کرلی ہے کہ وہ پورے ملک کی سیادت اور بالادستی کے بجا طور پر دعویدار ہوسکتے ہیں اب اگر وہ جس مقام تک پہنچ چکے ہیں وہیں ٹھہر جائیں گے تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری قوت ان کی جگہ لے اور پورے ہندوستان میں اپنے اقتدار کا سکہ چلائے۔ ولزلی کا سب سے بڑا مقصد تو یہ تھا کہ برطانوی حکومت کو پورے ہندوستان کا مقتدر بنادے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ سلطنت برطانیہ کے سب سے بڑے حریف یعنی نپولین اور حکومت فرانس کے مشرقی ممالک کے منصوبوں کو خاک میں ملادے اور اس غرض کے لئے ہندوستان کے وسیلوں کو استعمال کرے۔ چنانچہ ٹیپو کی تباہی، سرکار نظامہ سے عہد معاونت بسین کا معاہدہ اور مرہٹوں کی جنگ یہ سب آخر الذکر مقصد کے ذریعے تھے جو استعمال کئے گئے۔ ولزلی کے توسیع سلطنت کے منصوبوں کی پارلیمنٹ میں مخالفت ہوتی رہی لیکن وہ دھن کا پکا تھا۔ اس نے مخالفت کی کوئی پروا نہیں کی۔ اسکے اٹل عزم اور استقلال سے انگریزی حکومت کو ہندوستان کے بیشتر حصوں میں غلبہ اور

تسلط حاصل ہوگیا۔ اس کے عہد میں سلطنت کی غیر معمولی توسیع عمل میں آئی اور انگریزوں کی برتری کو ہندوستان کی باقی ماندہ قوتوں نے تسلیم کرلیا۔ شروع میں وزارت اور مجلس نگران نے اس کا ساتھ دیا لیکن ہلکر کی لڑائی کے وقت سے وہ بھی ان بھاری ذمہ داریوں کو تشویش کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ وزارت نے لارڈ کارنوالس کو گورنر جنرل کے عہدہ کو قبول کرنے پر اصرار کیا تاکہ وہ پھر اس اصول کا اعلان کردے جو پٹ کے قانون میں پیش کیا گیا تھا تاکہ دیسی والیانِ ملک کی سابقہ خود مختارانہ حیثیت بحال کردی جائے اور یہ خیال ان کے دل سے محو ہو جائے کہ انگریزی حکومت تمام دیسی ریاستوں پر قبضہ کرنیکا ارادہ رکھتی ہے۔

لارڈ کارنوالس کا دوبارہ گورنر جنرل ہونا

لارڈ کارنوالس کو دوبارہ جب گورنر جنرل کا عہدہ تفویض کیا گیا تو اس کی عمر ۶۷ سال تھی۔ اس کی صحت خراب تھی لیکن اس نے دعوت فرض قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ چنانچہ وہ ۳۰ جولائی ۱۸۰۵ء کو کلکتہ پہنچا۔ اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ولزلی کی حکمت عملی کو پلٹنے کی تدبیر کرے۔ مرہٹوں سے مصالحت کرے اور ملک گیری کے بجائے اندرونی نظم و نسق کو بہتر بنانے کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرہٹوں سے ولزلی کے عہد حکومت میں جو معاہدے ہوئے ہیں ان کی کڑی شرطوں کو منسوخ کردیا جائے تاکہ ان کی بے اطمینانی دور ہو۔ کارنوالس نے ۱۹ ستمبر ۱۸۰۵ء کو جنرل لیک کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس کے طرز عمل پر جو اس نے مرہٹوں کے معاملات میں اختیار کر رکھا تھا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کو ہدایت کی گئی کہ ہلکر سے مصالحت کرلی جائے۔ گوالیار سندھیا کو واپس کردیا جائے اور گوہد پر اس کی باجگذاری تسلیم کرلی جائے۔ سندھیا نے انگریز ریزیڈنٹ مسٹر جنکنس کو جو حراست میں رکھ چھوڑا تھا اگر وہ اس کو رضامندی سے چھوڑدے تو اچھا لیکن اگر اس کی رہائی کے مطالبہ سے انگریزی حکومت اور سندھیا میں

صلح ہونے میں خلل پڑتا ہو تو اس مطالبہ پر زیادہ اڑنا نہ چاہیئے۔ جے پور کے ساتھ جو کمپنی نے معاہدہ کر لیا تھا اسے کالعدم تصور کیا جائے اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مرہٹوں سے سیاسی اُلجھاؤ کا ہمیشہ ڈر رہیگا۔ شاہ عالم کو کلکتہ یا کسی اور دوسرے محفوظ مقام پر بھیج کر دہلی سندھیا کو واپس دیدیا جائے۔ دریائے چنبل کے شمال میں جن والیان ریاست سے معاہدے کئے گئے ہیں وہ سب منسوخ کئے جائیں۔ انگریزی حمایت سے محروم ہونے کی وجہ سے ان والیان ملک کو جو نقصان اٹھانا پڑے گا اس کی تلافی اس طرح کی جاسکتی ہے کہ انھیں انگریزی علاقے میں سے بعض حصے حوالے کر دیئے جائیں۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ مراسلہ لیک کو پہنچتا لارڈ کارنوالس غازی پور کے مقام پر وفات پا چکا تھا۔ لارڈ کارنوالس میں اگرچہ وارن ہیسٹنگز کی سی اُپج اور ولزلی کی سی اولوالعزمی نہ تھی لیکن وہ راست باز اور اعتدال پسند تھا جس کی وجہ سے انگلستان کی وزارت کو ہمیشہ اس پر بھروسا رہا۔ اور پٹ تو ہندوستان کے تمام معاملات میں بغیر اُس کے مشورے کے کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔

دسواں باب

جارج بارلو اور منٹو کا عہد حکومت

سر جارج بارلو

لارڈ کارنوالس کی وفات پر سر جارج بارلو نے جو گورنر جنرل کی کونسل کا سب سے پرانا رکن تھا گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لیا۔ وہ کمپنی کے تجربہ کار عہدہ داروں میں سے تھا اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں کا اس کو وسیع تجربہ حاصل تھا۔ اگرچہ وزارت نے سر جان شور کے زمانہ میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ کسی ایسے شخص کو جو کمپنی کی ملازمت میں ہندوستان میں عرصے سے ہو گورنر جنرل کا اعلیٰ عہدہ نہیں دیا جائے گا لیکن لارڈ ولزلی کی سفارش پر سر جارج بارلو اس عہدہ پر عارضی طور پر سرفراز کیا گیا۔ سر جارج بارلو میں دفتری کام کی صلاحیت اچھی تھی۔ لیکن اعلیٰ سیاست کے مسائل سے وہ بالکل ناآشنا تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں وہ اس کی شہنشاہی حکمت عملی کا قائل تھا لیکن بعد میں جب اس نے دیکھا کہ وزارت کی حکمت عملی بدل چکی ہے تو اس نے بھی اپنے مسلک میں تبدیلی کر لی۔ گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد سر جارج بارلو نے جنرل لیک

کو آگاہ کر دیا کہ وہ جلد سے جلد سندھیا اور ہلکر سے صلح کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے لیک کو یہ بھی ہدایت کی کہ ان معاہدوں میں ہمیں معاونت کے اصول پر چنداں اصرار کی ضرورت نہیں اور نہ جمنا کے پار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ساتھ سیاسی تعلقات ضروری ہیں۔ ہمیں ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کے تمام حقوق سے ہاتھ اٹھالینا چاہئے۔ کمپنی کی سرحد دریائے جمنا رہنی چاہیئے۔ ولزلی کا اصول یہ تھا کہ برطانوی بالادستی کے تحت ہندوستان کو امن و امان حاصل ہو گا لیکن سر جارج بارلو نے یہ اصول پیش کیا کہ دیسی ریاستوں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ انھیں کمپنی کے مقبوضات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ اس نقطۂ نظر کی بدولت کمپنی کو بقول مٹکاف "ایسی ذلت ہوئی جس میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ ایسے معاہدے کئے گئے جن سے حفاظت میسر نہ آسکی اور ایسی صلح ہوئی جس سے امن و امان نصیب نہ ہو سکا[1]۔

جنرل لیک نے سندھیا سے نومبر ۱۸۰۵ء میں ایک معاہدہ کر لیا جس کے بموجب معاہدہ سرجی ارجن گاؤں کی بعض دفعات میں تبدیل کر دی گئی۔ گوالیار سندھیا کو واپس کر دیا گیا اور گوہد پر اس کے باجگذاری کے حقوق تسلیم کر لئے گئے۔ عہد معاونت کی شرطیں جو گزشتہ عہد نامہ میں تھیں وہ جدید معاہدہ میں نہیں رہیں۔ انگریزی حکومت اور سندھیا کی ریاست کے درمیان دریائے چنبل کو سرحد قرار دیا گیا۔ انگریزی حکومت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ جے پور، جودھپور اور اودے پور کے راجاؤں سے کوئی معاہدہ نہیں کرے گی اسلئے کہ سندھیا کو ان پر اپنے باجگذار ہونے کا دعوے تھا۔ راجپوتانہ کے راجاؤں کے ساتھ اس طرح بے مروتی سے پیش آنے سے کمپنی نے اپنے تئیں دوسروں کی نظروں میں بڑا ذلیل کر لیا۔

لیک نے پوری کوشش کی کہ ہلکر نے فوجی لحاظ سے کمپنی کو جو نیچا

---

[1] Roberts, History of British India, p. 264.

دکھایا تھا کہ اسکی تلافی کرے۔ اس وقت ہلکر کے ساتھ بارہ ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل فوج تھی جس سے وہ وسط ہند میں لوٹ مار کر رہا تھا لیک نے ہلکر کا شمال کی طرف پیچھا کیا جو پنجاب میں داخل ہو گیا تھا لیکن اس نے دریائے ستلج کو پار کر کے رنجیت سنگھ سے ملاقات کی جو اس زمانے میں اپنی سکھ ریاست کو مستحکم کرنے میں لگا ہوا تھا۔ لیک چاہتا تھا کہ رنجیت سنگھ ہلکر کے خلاف انگریزوں کی مدد کرے لیکن اس نے غیر جانبداری کے اصول پر عمل کیا اس واسطے کہ وہ مرہٹوں کو خواہ مخواہ اپنا مخالف نہیں بنانا چاہتا تھا لیکن اس نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ ہلکر کو پنجاب سے فوراً چلے جانے پر مجبور کرے گا۔ ہلکر اس وقت سکھوں کے متبرک مقام امرتسر میں پناہ گزین تھا۔ اس نے اپنا ایلچی جنرل لیک کے پاس بھیجا جو خود بھی گورنر جنرل کے احکام کے بموجب جلد سے جلد صلح کرنا چاہتا تھا۔ سر جارج بارلو کی ہدایت کے مطابق ایک معاہدے کا مسودہ ہلکر کے سامنے پیش کیا گیا جس کے مطابق ہلکر کو اس کی قوت و حکومت بحال کر دی گئی۔ اس کے وہ تمام علاقے واپس کر دئے گئے جو پہلے سے اس کے خاندان کی حکومت کے تحت چلے آتے تھے۔ انگریزی حکومت نے راجپوتانہ کی ان تمام ریاستوں کے معاملات میں مداخلت سے دستبرداری کا وعدہ کیا جن پر ہلکر کو اپنے باجگذار ہونے کا دعویٰ تھا۔ بوندی، رام پور دریائے چنبل کے شمال کے تمام علاقوں اور بندیل کھنڈ میں ہلکر اپنے تمام دعووں سے دستبردار ہو گیا۔ لیکن معاہدے کے بعد بھی ہلکر کے وکیلوں کی کوشش سے گورنر جنرل نے رامپورہ ہلکر کو واپس دے دیا اور بوندی اور ٹونک میں اس کی مداخلت کو تسلیم کر لیا۔

سندھیا اور ہلکر سے معاہدے ہو جانے کے بعد باوجود لیک کے سخت احتجاج کے گورنر جنرل نے اعلان کر دیا کہ دریائے چنبل کے پار جتنی راجپوت ریاستیں ہیں ان کو مرہٹوں کی دستبرد سے بچانے کی ذمہ داری کمپنی پر نہیں۔ سر جارج بارلو کا کہنا یہ تھا کہ وہ جہاں تک ممکن ہے حکومت انگلستان کی حکمت عملی کو ہندوستان میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا۔ جے پور اور بوندی کے راجا وفادار اتحادی ہونے کی حیثیت سے اس سے بہتر سلوک کے مستحق تھے جو ان کے ساتھ روا

رکھا گیا۔ ہلکر پنجاب سے واپسی پر ایک مہینہ تک جے پور کی ریاست کو لوٹتا گھسوٹتا رہا لیکن گورنر جنرل کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ جب ہلکر کو معلوم ہو گیا کہ انگریزوں نے راجا پر سے اپنا حمایتی سایہ اٹھا لیا ہے تو اس نے اس سے اٹھارہ لاکھ کا نذرانہ جبریہ وصول کیا۔ اس عدم مداخلت کی حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوتانہ اور وسط ہند میں پھر طوائف الملوکی پھیل گئی۔ راجپوت راجاؤں کے آپس کے جھگڑوں میں مرہٹے حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے اور زیادہ پیچیدگی اور ابتری پیدا ہوئی۔ راجا جے پور اور راجا جودھپور کی لڑائی میں سندھیا اور امیر خاں نے جے پور کے راجا کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے جودھپور کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد راجا جودھپور نے پچاس لاکھ کا وعدہ کر کے امیر خاں کو راجا جے پور کی طرف سے توڑ لیا اور اس نے جے پور کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ راجا اودے پور کے علاقے کو بھی سندھیا اور امیر خاں نے خوب جی بھر کے لوٹا۔ راجا نے گورنر جنرل سے مدد کی درخواست کی اور کہا کہ ہندوستان میں ہمیشہ ایسی مقتدر حکومت رہی ہے جس کی طرف کمزوروں کی نظریں داد رسی کے لئے اٹھتی رہی ہیں۔ اس وقت کمپنی نے یہ اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے اس لئے اس کا منصب ہے کہ وہ کمزوروں کو زبردستوں کی چیرہ دستی سے محفوظ رکھے لیکن سر جارج بارلو اس اپیل سے ٹس سے مس نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجا اودے پور کو اپنی ریاست کا نصف حصہ امیر خاں کے حوالے کرنا پڑا۔ اس زمانے کی برطانوی حکمت عملی پر کلنگ کا ٹیکا یہ ہے کہ اس نے راجپوتانہ کی ریاستوں کو بے پناہ اور مرہٹوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونے کے لئے چھوڑ دیا جس سے انگریزی حکومت کی طرف سے ہر طرف بے اعتباری پیدا ہو گئی۔ ولزلی کے دفاعی اتحاد کے منصوبے سے برطانوی سیادت ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہو گئی تھی۔ سر جارج بارلو نے اس کے خلاف جو حکمت عملی اختیار کی اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ راجپوتانہ اور وسط ہند میں سخت بدنظمی پھیل گئی اور برطانوی بالادستی کو ٹھیس لگی۔

اس ابتری اور تاراج کے زمانے میں نواب سکندر جاہ والی ریاست حیدرآباد نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے مدنظر ہلکر اور سندھیا سے نامہ و پیام شروع کر دیا تھا۔ سر جارج بارلو نے دربار حیدرآباد کی سیاست پر اپنا اثر قایم رکھنے کے لئے اصرار کیا کہ اعظم الامرا کے انتقال کے بعد جنھوں نے تیس سال تک دولت آصفیہ کی مدار المہامی کے فرائض بڑی قابلیت اور وفاداری سے انجام دیے تھے میر عالم کا تقرر کیا جائے جو انگریزی حکومت کا دوست اور ہوا خواہ تھا۔ چنانچہ شروع میں تو نواب سکندر جاہ نے کچھ عذر کیا لیکن جب انگریزی حکومت اڑی رہی تو مجبوراً انھوں نے میر عالم کو اپنا مدار المہام بنا لیا۔ سر جارج بارلو نے اس موقع پر ریاست حیدرآباد کے مدار المہام کے تقرر کے متعلق مداخلت کی جو بالکل اندرونی انتظامی معاملہ تھا اور جس کا براہ راست تعلق معاہدوں کے بموجب سرکار نظام کی ذات سے تھا۔ میر عالم کی انگریز پرستی کے باعث ریزیڈنٹ کا عمل دخل ریاست حیدرآباد کے اندرونی انتظامی معاملات میں بھی شروع ہو گیا۔

پونا کے معاملات میں بھی سر جارج بارلو نے عدم مداخلت کے اصول کو خیرباد کہا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اگر پیشوا کو اس کا موقع دیا گیا کہ وہ معاہدۂ بسین کی شرطوں کی پابندی اپنے اوپر سے اٹھا لے تو اس کا نتیجہ مرہٹہ سیاست کی سخت پیچیدگی اور عدم توازن کی شکل میں برآمد ہو گا۔ پیشوا وسط ہند کے بعض علاقوں میں اپنا اقتدار منوانا چاہتا تھا جو معاہدہ بسین کے خلاف تھا۔ اگرچہ مجلس نظماء چاہتی تھی کہ برطانوی حکومت ہند اپنے آپ کو مرہٹہ سیاست سے بالکل بے تعلق کرلے اور پیشوا کی مرہٹہ برادری کے سرپنچ کی حیثیت بحال کر دی جائے لیکن سر جارج بارلو نے معاہدہ بسین میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے انکار کیا اور مجلس نظماء سے باادب درخواست کی کہ وہ ایسا کرنے پر اصرار نہ کرے اس لئے کہ اگر پیشوا کی مرکزیت پھر قایم ہو گئی تو انگریزی مفاد کو آئندہ سخت صدمہ پہنچے گا۔

لارڈ ولزلی کی توسیع مملکت کی حکمت عملی کی وجہ سے کمپنی کا مالیہ بہت زیربار

ہوا تھا اور حکومت ہند کا قرض بہت کافی بڑھ گیا تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ولزلی کے عہد میں جو الحاقات ہوئے ان کی سالانہ آمدنی بہت کافی تھی لیکن اس وقت اچانک کمپنی کی مالیات کا توازن بگڑ گیا تھا۔ سر جارج بارلو نے حکومت کے اخراجات میں تخفیف کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے میزانیہ میں بجائے خسارہ کے اخراجات پورے کرنے کے بعد فاضل رقم بچنے لگی۔ سر جارج بارلو نے حکومت کی مالیات کو ایسی مستحکم بنیادوں پر قایم کردیا کہ آئندہ بیس سال تک اس میں کوئی کمزوری نہیں ہوئی[۱]۔ کٹک، بندیلکھنڈ اور دوآبہ کے ضلعوں کے نظم و نسق میں بھی اصلاح کی گئی۔

ویلور کی بغاوت جولائی ۱۸۰۶ء میں ویلور کے مقام پر انگریز افسروں کے خلاف ہندوستانی سپاہ نے علم بغاوت بلند کردیا۔ بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ احاطہ مدراس میں فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ سپاہی بوقت قواعد پریڈ کے وقت ٹلک وغیرہ کی مذہبی نشانیاں پیشانی پر نہ لگایا کریں۔ داڑھی منڈانے اور مونچھوں کی خاص تراش کے متعلق بھی قاعدے بنا دئیے گئے۔ سپاہیوں کے لئے جو نئی وضع کی پگڑی تجویز کی گئی تھی وہ انگریزی ہیٹ سے بہت کچھ مشابہہ تھی۔ سپاہیوں کو اندیشہ ہوا کہ انگریز ان کے دھرم کو بگاڑنا چاہتے ہیں اور یہ سب کارروائیاں انھیں آئندہ عیسائی بنانے کا پیش خیمہ ہیں چنانچہ وہ بگڑ گئے اور بغاوت کرکے ایک سو تیرہ انگریز افسروں اور سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ ارکاٹ سے انگریزی فوج نے موقع پر پہنچکر فساد فرو کردیا۔ چھ سو سپاہیوں کو قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ بعد میں لارڈ منٹو نے جب وہ گورنر جنرل ہوکر آیا تو انھیں ملازمت سے خارج اور آئندہ کے لیے ممنوع الخدمت قرار دیا۔ اس زمانہ میں ویلور میں ٹیپو سلطان کے لڑکے رہتے تھے۔ انگریزی حکومت کو شبہہ ہوا کہ شاید ان کے بھڑکانے سے یہ فساد ہوا۔ چنانچہ انھیں کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں مدراس میں بنٹنگ گورنر تھا۔ اس کو اور فوج کے

[۱] Thornton, History of the British Empire in India, Vol. IV p. 62-4,

کمانڈر سر جان کرڈیگ کو انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ بنٹنگ نے اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا اور بتایا کہ اس تمام معاملہ کا اس سے تعلق نہ تھا۔ لیکن مجلس نظماء نے انگلستان کی رائے عامہ سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا اس لیے وہ اس پر قایم رہی۔

اس اثناء میں انگلستان کی سیاست میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ مسٹر پٹ کے انتقال اور قدامت پسند جماعت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہگ جماعت نے اپنی حکومت قایم کر لی تھی۔ اگرچہ سر جارج بارلو کا تقرر عارضی تھا لیکن بعد میں مجلس نظماء کی سفارش پر قدامت پسند وزارت نے اس کو مستقل کر دیا۔ لبرل وزارت نے اس حق کی رو سے جو پٹ کے قانون کی بدولت اس کو حاصل تھا مجلس نظماء کی رائے کو رد کر کے لارڈ منٹو کو جو بورڈ آف کنٹرول (مجلس نظماء) کا صدر تھا ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا[1]۔

لارڈ منٹو کا عہد حکومت سنہ ۱۸۰۷ء تا سنہ ۱۸۱۳ء

لارڈ منٹو لبرل جماعت کا رکن تھا۔ جس وقت وارن ہسٹینگز پر مقدمہ چلایا گیا تو اس نے اس میں دوسرے لبرل جماعت کے ارکان کی طرح حصہ لیا تھا۔ ہندوستان آنے سے قبل وہ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کی حیثیت سے سلطنت کے معاملات کا کافی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ لارڈ منٹو نے لبرل وزارت کی ہدایتوں کے بموجب ہندوستان کے والیان ملک کے معاملات میں عدم مداخلت کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ اس کے عہد میں کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی سر جارج بارلو کے زمانے میں مرہٹوں سے جو معاہدے ہوئے تھے ان پر منٹو نے عمل کیا۔ ولزلی کے عہد حکومت میں انگریزی راج کی حدود کی جو توسیع ہو چکی تھی اس سے آگے قدم بارلو اور منٹو نے نہیں بڑھایا۔ منٹو کو اپنے عہد کے آغاز ہی میں وسط ہند کی بدامنی کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اس تمام ملک میں غارت گری کا دور دورہ تھا۔ بندیلکھنڈ کے بعض علاقے معاہدہ بسین کے بعد کمپنی کے

[1] Thornton, History of the British Empire in India, Vol. IV p. 116.

زیر اقتدار آگئے تھے۔ لارڈ منٹو نے وسط ہند کی بد امنی دور کرنے کی کوشش کی۔ اجے گڑھ اور کالنجر کے قلعوں پر ایسے سرداروں نے قبضہ جما لیا تھا جو لٹیروں کے حمایتی اور انگریزی حکومت کے مقابلے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ جنرل لیک نے سر جارج بارلو سے ان دونوں قلعوں پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی لیکن اس کو یہ اجازت نہیں دی گئی۔ مگر اجے گڑھ اور کالنجر کے قلعوں پر جو سردار قابض تھے انھوں نے لٹیروں کے سرغنوں سے ملکر آس پاس کے برطانوی ضلعوں پر قبضہ کرلیا۔ بندیلکھنڈ کی بد امنی کے مضر اثرات اب آہستہ آہستہ دوآبہ تک پہنچنے لگے تھے اور جمنا کی جنوبی سرحد محفوظ نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اجے گڑھ اور کالنجر کے قلعوں کے خلاف فوج کشی کا حکم دے دیا۔ یہ دونوں قلعے چھین لئے گئے۔ بندیلکھنڈ کے بہت سے دوسرے سرداروں نے انگریزوں کی اس کامیابی سے متاثر ہوکر کمپنی کی اطاعت قبول کرلی اور اپنے تمام جھگڑوں میں انگریزی حکومت کو ثالث تسلیم کرلیا۔
پنڈاریوں کے سردار امیر خاں نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ جب بھونسلا راجا کے جنوبی حصوں پر ہلہ بول دیا تو منٹو نے باوجود اس کے کہ راجا نے اپنے آپکو عہد معاونت کی شرطوں سے عملاً آزاد کرلیا تھا انگریزی فوج اس کے خلاف روانہ کی۔ امیر خاں اپنے لشکر کو واپس لے گیا اور معاملہ نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ منٹو نے بھی بڑی احتیاط برتی اس واسطے کہ وہ جانتا تھا کہ امیر خاں کے ہلکر سے اچھے تعلقات ہیں۔ وہ مرہٹوں سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب ہلکر نے امیر خاں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا تو منٹو نے اعتدال پسندی کے اصول کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی فوج مرہٹہ علاقے سے واپس بلالی۔

رنجیت سنگھ سے معاہدہ

احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد پنجاب بدنظمی کا شکار ہوگیا۔ اس بدنظمی سے سکھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ان کے ایک سردار چرت سنگھ اور اس کے بیٹے مہا سنگھ نے اپنی قوت بڑھا کر ستلج تک کے علاقوں پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں ستلج پار کے پٹیالہ اور نابھا کے راجاؤں میں آپس

میں جھگڑا شروع ہوا تو رنجیت سنگھ نے مداخلت کا اچھا موقع دیکھا اور ستلج پار جاکر دونوں سے اپنا اقتدار منوایا اور اپنا باجگذار بنایا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ جمنا اور ستلج کے کل علاقے پر اپنا اقتدار منوانا چاہتا تھا مغلوں کی کمزوری کے زمانے میں سندھیا کے فرانسیسی جنرل پیرون نے ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقے پر جو سرہند کہلاتا تھا مرہٹوں کا حلقہ اثر قایم کرلیا تھا۔ ولزلی کے زمانے میں جب سندھیا کو انگریزوں نے شکست دی اور دہلی کو اپنے تحت کرلیا تو قدرتی طور پر سرہند کے علاقے پر بھی انگریزی اثر قایم ہوگیا۔ جب رنجیت سنگھ نے پٹیالہ اور نابھا کے معاملات میں مقتدر قوت کی حیثیت سے مداخلت کی تو یہاں کے راجاؤں نے مٹکاف کو جو دہلی میں انگریزی ریزیڈنٹ تھا اس طرف متوجہ کیا اور حفاظت کے لیے اپیل کی۔ لارڈ منٹو کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا۔ رنجیت سنگھ نے بھی اس دوران میں براہ راست گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ جمنا اور ستلج کے درمیان کا علاقہ میرے تحت ہے اس پر میرا قبضہ رہنے دیا جائے۔ اب منٹو کو یہ اہم فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ مجلس نظماء کی ہدایتوں کے مطابق اس معاملہ میں بھی بے تعلقی ظاہر کرے اور اس طرح رنجیت سنگھ کو سرہند پر اقتدار قایم کرنے دے یا یہ کہ سرہند کی ریاستوں کو برطانوی حمایت میں لے اور رنجیت سنگھ کو پنجاب کی سرحد سے باہر اپنا حلقہ اثر وسیع نہ کرنے دے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو رنجیت سنگھ کے لئے ممکن ہوتا کہ وہ برطانوی سرحد سے بہت قریب اپنی فوج کے مرکز قایم کرلے۔ لیکن منٹو نے بڑی دلیری اور ہوشمندی سے کام لیا۔ اس نے رنجیت سنگھ سے گفتگو کے لئے مٹکاف کو بھیجا جو اس زمانے میں کمپنی کے ملازموں میں قابل ترین افسر تھا۔ رنجیت سنگھ کو معلوم ہوچکا تھا کہ سنہ ۱۸۰۷ء میں تلسٹ میں نپولین اور بادشاہ روس میں جو معاہدہ ہوا ہے اس میں بعض خفیہ شرطیں فرانسیسیوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے میں سہولتیں بہم پہنچانے کے متعلق رکھی گئی تھیں۔ چنانچہ لارڈ منٹو کو اس ضمن میں بورڈ آف کنٹرول سے ہدایتیں ملی تھیں کہ وہ ہندوستان کی سرحد کے حکمرانوں سے مدافعانہ معاہدے کرنے کی کوشش کرے۔ رنجیت سنگھ نے ان حالات میں خیال کیا کہ وہ اس شرط پر

فرانسیسیوں کے خلاف اتحاد میں شرکت کرے گا کہ اس کو ستلج پار کی ریاستوں میں مداخلت کا حق دیا جائے لیکن اس دوران میں نپولین کی تمام تر توجہ جزیرہ نمائے اسپین و پرتگال کی طرف ہو گئی جس کی وجہ سے مشرقی سیاست کی صورت حال میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور برطانوی شہنشاہیت کو جو خطرہ لاحق تھا وہ کم ہو گیا۔ چنانچہ مٹکاف نے رنجیت سنگھ سے لاہور میں گفت و شنید شروع کی تو مشرق میں برطانوی سیاسی حیثیت نسبتاً بہتر ہو چکی تھی جب رنجیت سنگھ کی طرف سے یہ شرط پیش کی گئی کہ وہ انگریزوں کے ساتھ فرانسیسیوں کے خلاف اتحاد میں اس وقت شریک ہوگا جبکہ انگریزی حکومت ستلج پار کی ریاستوں پر اس کے سیاسی تسلط کو تسلیم کرے تو مٹکاف نے صاف کہہ دیا کہ برطانوی حکومت نے اس کو اس شرط کے قبول کرنے کا اختیار نہیں دیا ہے۔ مٹکاف نے برطانوی حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ ستلج پار کی ریاستیں برطانوی حلقۂ اثر میں آ چکی ہیں اور برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ اس حلقۂ اثر کو برقرار رکھے۔ رنجیت سنگھ اس پر خفا ہوا اور ستلج پار کر کے اس علاقے کے بعض معاملوں کا تصفیہ کرنے کیلئے تین مہینے وہاں ٹھیرا رہا۔ مٹکاف اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ منٹو نے اس موقع پر ہمت اور استقلال سے کام لیا اور کرنل آکٹرلونی کے تحت جمنا کے پار لدھیانہ کی چھاؤنی کو مزید انگریز فوج بھیجدی گئی تاکہ اگر جنگ کی نوبت آئے تو رنجیت سنگھ کے اچانک حملے کی مدافعت کی جا سکے۔ رنجیت سنگھ نے دیکھا کہ منٹو نے عدم مداخلت کی حکمت عملی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور وہ مقابلہ کے لئے تیار ہے تو اس نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی اور ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کو امرتسر میں ایک معاہدہ پر دستخط کر دئے جس کی رو سے وہ رضامند ہو گیا کہ ستلج پار کی ان ریاستوں پر اپنا تسلط قایم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا جو برطانوی حمایت میں آ چکی ہیں۔ ان میں نابھا، پٹیالہ اور جھیند کی بڑی ریاستوں کے علاوہ سولہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں یا زمینداریاں شامل تھیں۔ برطانوی حکومت رنجیت سنگھ کے علاقے کے یا اس کی رعایا کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی اور اس کو ستلج کے شمال کے مقبوضات کا جائز حکمران

تسلیم کرے گی۔ رنجیت سنگھ نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر کوئی یورپین قوت پنجاب کے راستے سے ہندوستان پر حملہ آور ہوگی تو وہ انگریزوں کی مدد کرے گا۔ اس معاہدہ کے بموجب انگریزوں کی شمال مغربی سرحد پنجاب کے دریا کے جمنا کے دریائے ستلج قرار پائی۔ لدھیانہ میں انگریزی فوج کی تعداد بڑھا دی گئی اور وہ انگریزوں کی سب سے بڑی شمال مغربی چھاؤنی بن گیا۔

افغانستان کی سفارت

فرانس اور روس کے ۱۸۰۷ء کے اتحاد سے حکومت ہند کو قدرتی طور پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر نپولین نے مشرق میں برطانوی شہنشاہی کے خلاف خشکی کے راستے سے پیشقدمی کی تو وہ افغانستان میں سے ہو کر ضرور گزرے گا۔ چنانچہ منٹو نے الفنسٹن کے تحت کابل کو ایک سفارت روانہ کی تاکہ شاہ شجاع والی افغانستان سے مدافعانہ معاہدہ طے کرے۔ لیکن اس زمانے میں افغانستان اندرونی خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔ شاہ شجاع بیشتر اس کے کہ انگریزی حکومت سے کوئی معاہدہ کرے مالی امداد کا طالب ہوا۔ الفنسٹن نے حکومت ہند کو سفارش کی کہ دس لاکھ روپیہ اسے دے دیا جائے تاکہ شاہ شجاع نئی فوج بھرتی کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کر سکے۔ لیکن چونکہ فرانسیسی حملے کا خطرہ اب جا چکا تھا اس لئے لارڈ منٹو اس رقم کو ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ شاہ شجاع کو اپنے بھائی کے ہاتھوں سخت شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوا۔ الفنسٹن کے کہنے کے مطابق اس وقت حکومت ہند دس لاکھ روپے دیدیتی تو اس کا قوی امکان تھا کہ شاہ شجاع شکست نہ کھاتا اور حکومت ہند اس کئی کروڑ روپیے کے بار سے بچ جاتی جو تیس سال بعد شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھانے کے لئے اسے برداشت کرنا پڑا اور جس کی وجہ سے اس کی نیک نامی اور وقار پر حرف آیا۔ الفنسٹن کی سفارت کا بس اتنا کارنامہ کہا جا سکتا ہے کہ خود اس نے افغانستان کے دوران قیام میں اس ملک کی تاریخ کے متعلق کافی مسالا جمع کر لیا۔ اس سے پہلے انگریزی میں اور کوئی مستند کتاب افغانستان کے متعلق موجود نہ تھی۔

ایران کی سفارت

ایران میں فرانسیسی سفارت کچھ عرصے سے انگریزی ہند کے خلاف جوڑ توڑ کر رہی تھی۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے مالکم کو ۱۸۰۸ء میں روانہ کیا۔ مالکم فارسی جانتا تھا اور ولزلی کے عہد میں وہ پہلی مرتبہ سفارت پر ایران گیا تھا تو وہاں اس نے اپنے حسن اخلاق سے کافی ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ ادھر انگلستان کے محکمۂ خارجہ نے سر ہارفرڈ جونس کو سفارت کے لئے منتخب کیا۔ سر ہارفرڈ جونس برطانوی حکومت کی جانب سے بوشہر میں قونصل کی خدمت انجام دے چکا تھا اور ایران کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب وہ انگلستان سے بمبئی پہنچا تو لارڈ منٹو نے اس کو ہدایت کی کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ مالکم کی سفارت کا نتیجہ نہ معلوم ہو جائے۔ اس دفعہ مالکم کی سفارت کو دربار طہران میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی کہ ولزلی کے عہد میں اس کی پہلی ایرانی سفارت کو ہوئی تھی۔ فرانسیسی سفیر نے شاہ ایران کے پاس بہت رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کے مشورہ پر مالکم کو شیراز سے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔ مالکم کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور وہ اپنے عملے کے ساتھ ہندوستان واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کے بعد سر ہارفرڈ جونس طہران گیا۔ مالکم نے لارڈ منٹو کو مشورہ دیا کہ حکومت ایران آجکل پوری طرح سے فرانسیسی اثر میں ہے۔ اس کا ردعمل حکومت ہند کی جانب سے یہ ہونا چاہیے کہ خلیج فارس میں فوجی مظاہرہ کیا جائے اور بعض جزیروں پر قبضہ کرنے کی دھمکی دی جائے۔ سر ہارفرڈ جونس کو حکومت ہند نے تاکیدی احکام روانہ کئے کہ وہ فوراً ایران سے واپس چلا آئے لیکن اس کو چونکہ حکومت انگلستان نے سفارت پر بھیجا تھا اس لئے اس نے باوجود حکومت ہند کے احکام کے شاہ ایران سے ایک معاہدہ کیا کہ فرانسیسی سفارت طہران سے رخصت کر دی جائے گی اور پیرس سے سفیر ایران کو واپس طلب کر لیا جائے گا۔ منٹو نے حکومت ایران کو مطلع کیا کہ حکومت ہند سر ہارفرڈ جونس کی سفارت کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کے ساتھ مالکم کو پھر دوبارہ طہران روانہ کیا تاکہ وہ اس معاہدہ کی

حکومت ہند کی طرف سے تصدیق کرے جو سر ہارفرڈ جونس نے طے کیا تھا۔ سر ہارفرڈ جونس اور مالکم میں آپس میں رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جس کی بنا پر حکومت انگلستان نے ان دونوں کو ایران سے واپس جانے کا حکم دے دیا اور دربار ایران میں سر گور آوزلے کو مستقل سفیر کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت سے ایران کے ساتھ سیاسی تعلقات کا تعین بڑی حد تک حکومت ہند کے بجائے انگلستان کا محکمہ خارجہ کرنے لگا۔

سندھ کی سفارت

لارڈ منٹو نے تیسری سفارت سندھ روانہ کی جو ہندوستان کی مغربی سرحد پر فوجی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے یہ کوشش کی جا چکی تھی کہ سندھ کی حکومت کمپنی سے تجارتی تعلقات استوار کرے لیکن اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ منٹو کے عہد حکومت میں سندھ میں غلام علی، کرم علی اور مراد علی یہ تینوں بھائی مختلف علاقوں پر حکمران تھے اور امیران سندھ کہلاتے تھے۔ سندھ کی سرحد مملکت ایران سے ملی ہوئی تھی اور اکثر سرحدی جھگڑے ہوتے رہتے تھے کچھ عرصے سے حکومت ایران برابر بلوچستان اور سندھ کی سرحد کے پاس اپنے مطالبے بڑھاتی جا رہی تھی۔ چنانچہ امیران سندھ کی خواہش پر لارڈ منٹو نے کپتان سیٹن اور مسٹر ہنگی اسمتھ کو سندھ روانہ کیا تاکہ وہ ان سے اتحاد کا معاہدہ طے کرے۔ بڑے بحث و مباحثہ کے بعد ۲۳ر اگست ۱۸۰۹ء کو یہ معاہدہ ہوا کہ امیران سندھ کا سفیر کلکتہ میں رہا کریگا اور انگریزی سفیر امیران سندھ کے دربار میں حیدر آباد میں رہے گا۔ امیران سندھ نے وعدہ کیا کہ وہ کسی فرانسیسی کو اپنی ملازمت میں نہیں رکھیں گے کمپنی کو سندھ میں تجارت کی بے روک ٹوک اجازت ہو گئی۔

فرانسیسی مقبوضات

اس زمانے میں بحر الکاہل میں فرانسیسیوں اور ولندیزیون (ڈچ) کی نوآبادیاں موجود تھیں۔ فرانس اور ہالینڈ میں جب لڑائی ہوئی تو اول الذکر نے ہالینڈ کی نوآبادیوں پر قبضہ کر لیا۔ جزیرہ ماریشس پر فرانسیسی حکومت کا پہلے سے قبضہ تھا۔ یہاں سے فرانسیسی جہازران انگریزی تجارتی جہازوں پر

بڑی آسانی سے حملے کرتے تھے اور مڈاگاسکر سے لے کر جاوا تک بحری نقل وحرکت میں رکاوٹ ڈالتے رہتے تھے۔ انگلستان کے تجارت پیشہ طبقے کی طرف سے وزارت وقت کو ان نقصانات کی جانب متوجہ کیا گیا جو انھیں فرانسیسی بحری قزاقوں سے برداشت کرنے پڑے تھے۔ اس پر محکمۂ وزارت نے حکومت ہند کو اختیار دیا کہ وہ برطانوی تجارت کی حفاظت کے لیے مناسب تدبیروں اختیار کرے۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے ایک زبردست بحری مہم ماریشس کے خلاف روانہ کی جس میں ۷۰ توپیں چڑھے ہوئے جہاز شریک تھے۔ تیرہ تین مستولوں کے جہاز اور ان کے علاوہ بے شمار چھوٹے جہاز اور توپیں چڑھی ہوئی کشتیاں تھیں۔ ان جہازوں پر گیارہ ہزار کا مسلح لشکر بھیجا گیا۔ فرانسیسی اس بحری مہم کی تاب نہ لاسکے۔ اور جزیرہ ماریشس کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

ماریشس پر قبضہ کرنے کے بعد مجلس نظماء کی اجازت سے لارڈ منٹو نے جاوا کے خلاف بحری مہم بھیجی جس میں ۹۰ جہاز تھے جن پر بارہ ہزار کا لشکر کمانڈر ان چیف سر سیمول آک مٹی کے تحت حملہ کے لئے تیار تھا۔ اب تک حکومت ہند نے جتنی بھی بحری مہمیں روانہ کیں ان میں یہ سب سے زبردست اور اہم تھی۔ خود لارڈ منٹو بطور رضاکار اس مہم میں شریک تھا۔ کرنل جلیسپی نے پہلے بٹاویہ اور پھر قلعہ کورنیلس کو ۲۶ ر اگست ۱۸۱۱ء فتح کر لیا جو سب سے زیادہ مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسی جنرل جان سین جسے جاوا کی مدافعت پر نپولین نے مامور کیا تھا جزیرہ کے مشرقی ساحل کی طرف بھاگ گیا لیکن جب اس نے کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھی تو ہتھیار ڈال دئیے۔ جاوا کا نظم ونسق منٹو نے سر اسٹمفورڈ ریفلس کے سپرد کیا۔ مجلس نظماء نے ہدایت کی تھی کہ جزیرہ جاوا کے تمام قلعوں کو فتح کرنیکے بعد مسمار کر دیا جائے اور انگریزی فوج سامان حرب دیسی باشندوں کو تقسیم کر کے اور جزیرے کو خالی کر کے ہندوستان واپس چلی آئے۔ لیکن منٹو نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس وقت تک جب تک کہ یورپ میں صلح نہ ہو جائے منٹو نے مناسب خیال کیا کہ جاوا کو انگریزی حکومت کے ماتحت رہنے دے۔ ۱۸۱۴ء میں یورپ میں صلح ہونے کے بعد ڈچ لوگوں کو جب ان کے

مشرقی مقبوضات دئے گئے تو سوائے جنوبی افریقہ کے کیپ کے باقی انھیں واپس دے دیئے گئے جن میں جاوا شامل تھا۔

ٹراونکور کی بغاوت

۱۸۰۸ء میں ٹراونکور کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل میکالے اور وہاں کے دیوان ویلو تھمپی میں اس امر پر اختلاف ہوا کہ راجا ٹراونکور نے جو اپنی ذاتی فوج بھرتی کی ہے آیا ریاست میں حمایتی فوج کے ہوتے ہوئے اس کی کوئی ضرورت باقی بھی ہے یا نہیں چونکہ حمایتی فوج کے ضمن میں انگریزی حکومت کو جو سالانہ رقم واجب الادا قرار پائی تھی وہ کئی سالوں سے ادا نہیں ہوئی تھی اس لئے ریزیڈنٹ نے راجا اور دیوان پر زور دیا کہ حمایتی فوج کے علاوہ اور دوسری فضول فوج برطرف کر دی جائے تو رقم کی ادائی ریاست کے خزانہ کے لئے آسان ہو جائے گی۔ ریزیڈنٹ نے راجا سے دیوان کی شکایت کی کہ جان بوجھ کر حمایتی فوج کے سلسلے میں جو رقم مقرر کی گئی ہے اس کی ادائی میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اس واسطے اس کو دیوان کے عہدہ سے الگ کر دیا جائے۔ راجا اس پر بادل ناخواستہ آمادہ ہو گیا لیکن دیوان ویلو تھمپی نے ٹراونکور کی نائروں کی فوج کو ملا لیا اور اس زمانے میں اتفاق سے چند فرانسیسی مہم جو بھی ٹراونکور میں موجود تھے انھوں نے بھی اس قسم کی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ انھوں نے یہ خبر مشہور کر دی کہ اگر ہم تھوڑے دن انگریزوں کا مقابلہ کر لیں تو بہت جلد ہمیں سمندر کے راستے سے فرانسیسی کمک پہنچ جائے گی۔ کرنل میکالے نے مدراس سے مزید فوجی امداد طلب کی۔ لیکن بیشتر اس کے کہ امداد پہنچے نائروں نے رات کے وقت ریزیڈنٹ کے مکان کو گھیرنے کی کوشش کی تاکہ اس کو قتل کر دیا جائے اور وہ چھپ کر دریا کے راستہ سے بھاگ گیا لیکن تیس انگریز سپاہی قتل کر دئے گئے۔ دیوان ٹراونکور نے جب دیکھا کہ اب انگریزی فوج کا مقابلہ کرنا ہوگا تو اس نے کوچین کے دیوان سے فوجی امداد طلب کی چنانچہ اس نے امداد بھیجی حمایتی فوج کے کماندار کرنل شاٹرس نے

1 — Thornton, History of the British Empire in India, Vol. IV. p. 148.

جب ٹراونکور پر حملہ کیا تو دیوان کی فوج نے پانچ گھنٹے تک مقابلہ کیا لیکن اسکے بعد اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ویلو تھمپی کوچین بھاگ گیا۔ انگریزی فوج نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نے اپنے آپ کو حوالے کرنے کے بجائے خودکشی کرلی۔ انگریزی حکومت نے راجا کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ ایک دوسرا دیوان مقرر کر دیا جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ وہ انگریزی مفاد کے خلاف نہ جائے گا۔ ٹراونکور اور کوچین کو عارضی طور پر گورنر مدراس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

منٹو کے گورنر جنرل ہونے کے بعد مجلس نظما نے سر جارج بارلو کو مدراس کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اس نے تخفیف مصارف کے جوش میں انگریز فوجی افسروں اور سپاہیوں کے بھتہ میں کمی کر دی جس کی وجہ سے سرنگاپٹم اور حیدرآباد کی فوج بگڑ گئی اور عدول حکمی پر اتر آئی۔ مالکم اور دوسرے افسروں نے سر جارج بارلو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے حکم کو واپس لے لے لیکن اس نے بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دیا اور حکم کو واپس لینے سے انکار کیا۔ چنانچہ لارڈ منٹو معاملہ کی تحقیقات کیلئے خود مدراس آیا۔ تحقیقات کے بعد سوائے اکیس افسروں کے باقی سب کو عام معافی دیدی گئی۔ انگلستان میں پارلیمنٹ میں سر جارج بارلو پر سخت تنقیدیں کی گئیں اور حکومت برطانیہ کی اس پالیسی سے اختلاف کیا گیا کہ کمپنی کے اعلیٰ عہدوں پر ایسے لوگوں کو مقرر کیا جائے جنھوں نے ادنیٰ عہدوں سے ترقی کی ہو اس واسطے کہ ایسے اشخاص باوجود اپنی قابلیت کے بھی وہ عزت نہیں حاصل کر سکتے جو انگلستان کے اعلیٰ خاندان کا شخص حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ سر جارج بارلو کو انگلستان واپس بلا لیا گیا۔

۱۸۱۳ء کا قانون منشور

۱۸۰۸ء میں دارالعوام کی ایک مجلس منتخبہ مقرر کی گئی تاکہ کمپنی کی مالی حالت اور دوسرے اہم امور کی نسبت تحقیقات کر کے پارلیمنٹ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ برابر چار سال کی چھان بین کے بعد اس مجلس نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں ہندوستانی مقبوضات کے طریق مالگزاری، عدالتی اور پولیس کے انتظام کے متعلق نہایت مفصل اور مفید معلومات جمع کر دی گئیں۔ انگلستان کا تجارت پیشہ طبقہ کمپنی کے ہندوستانی ٹھیکہ کا سخت مخالف تھا۔ کمپنی کے نظار کی یہ کوشش تھی کہ بلا شرکت غیرے ہندوستان

کی تجارت کا ٹھیکہ انھیں کے پاس رہے۔ نپولین اعظم نے یورپ کی بیشتر بندرگاہوں میں انگریزی مال کی درآمد ممنوع قرار دے دی تھی اس لئے انگریزی مال کی نکاسی بہت کم ہو گئی تھی اور انگلستان کے تجارت پیشہ لوگوں کے لئے سخت پریشانی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹھیکہ کی تجدید کا زمانہ آیا تو انگلستان کے صنعتی شہروں کی طرف سے پارلیمنٹ کے سامنے محضر پیش کئے گئے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کی تجارت کا دروازہ بلامزاحمت تمام انگریز تاجروں کے لئے کھول دیا جائے کہ بغیر اس کے ملک کی صنعت کی ترقی ممکن نہیں۔ کمپنی کے نمائندوں نے اپنے مفاد و مراعات کو بچانے کی ہر چند کوشش کی اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ بغیر تجارتی ٹھیکہ کے کمپنی ہندوستان کی سیاسی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی لیکن پارلیمنٹ رائے عامہ سے مجبور تھی۔ اس مسئلہ پر بہت بحث ہوتی رہی۔ تجربہ کار لوگوں کی شہادتیں قلمبند کی گئیں۔ بوڑھے وارن ہسٹنگز نے بھی دارالعوام کے سامنے شہادت دیتے ہوئے اس امر کی تصدیق کی کہ اگر انگریز تاجروں کو بے روک ٹوک ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت دی گئی تو اس کے نتیجے انگریز قوم کے لیے بہت برے نکلیں گے۔ سرجان شور، سرجان مالکم اور سر ٹامس منرو جیسے تجربہ کار اور کارداں حاکموں نے بھی وارن ہسٹنگز کی تائید کی لیکن انگلستان کی معاشی حالت کا اقتضا یہ تھا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی عام اجازت ہونی چاہیئے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ ہر ہیچ و اور دولت جو کو ہندوستان جانے کا موقع نہیں دینا چاہیئے بلکہ قیدیں لگانی چاہئیں اور صرف باعزت اور ذی وجاہت لوگوں کو ہندوستان جا کر تجارت کرنے کی اجازت دینی چاہیئے۔ اس ضمن میں مسیحی مبلغین کا معاملہ بھی زیر بحث آیا۔ ولزلی اور خاصکر لارڈ منٹو نے اپنے عہد حکومت میں مسیحی مبلغین کی سرگرمیوں کو اچھا نہ سمجھا۔ منٹو نے ۱۸۰۸ء میں ایک عرضداشت کے ذریعہ سے صدر مجلس نظماء کو ان خطروں سے آگاہ کیا تھا جو ہندوستان میں مسیحی تبلیغ کے عام کرنے سے انگریزی حکومت کے لئے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مسیحی مبلغین کے حامیوں نے اس وقت جبکہ کمپنی کے مراعات کی تجدید کا مسئلہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش تھا اپنے مطالبات

پیش کئے اور کمپنی کی حکومت کا یہ فرض ٹھہرایا کہ وہ مسیحی تبلیغ کی ہندوستان میں
ہر ممکن طور پر ہمت افزائی کرے۔ غرضکہ سمجھوتا اس پر ہوا کہ کمپنی کی حکومت مسیحیت
کے پرچار کرنے والوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی اور انھیں اپنا
کام کرنے کی آزادی رہے گی۔ کمپنی کی طرف سے جو شہادتیں مجلس منتخبہ کے سامنے
دی گئیں ان سب میں پادریوں اور نج کے تاجروں کے ہندوستان میں
بے روک ٹوک گھس پڑنے کی سخت مخالفت کی گئی کئی سال بحث کے بعد ۱۸۱۳ء
میں قانون منشور منظور ہوا جس کی اہم دفعات یہ ہیں۔

انگلستان کے تاجر براہ راست کمپنی کے توسط سے ہندوستان سے درآمد و برآمد کر سکیں گے۔
ہندوستان کی تجارت میں صرف چائے کی تجارت کا کمپنی کے پاس ٹھیکہ رہے گا۔ چین کی
کل تجارت پر کمپنی کا ٹھیکہ بدستور برقرار رہے گا۔ بورڈ آف کنٹرول (مجلس نگران)
سیاسی امور کے علاوہ کمپنی کے تجارتی معاملات کی بھی نگرانی کرے گا۔ کمپنی اپنی
آمدنی میں سے ½ ۱۰ فی صدی منافع شرکائے کمپنی کو تقسیم کرے گی۔ مجلس نظما کو
گورنر جنرل، کمانڈران چیف اور گورنروں کے تقرر کا حق حسب سابق حاصل
رہے گا بشرطیکہ تاج کی رضامندی حاصل کر لی گئی ہو۔ فوجی تعلیم کے لیے اڈسکمب
کا مدرسہ رکھا جائے گا۔ کوئی شخص اس وقت تک کمپنی کا محرر (رائٹر) مقرر
نہ ہو سکے گا جب تک اس نے ہیلی بری کے مدرسہ میں چار میقاتیں نہ گذاری
ہوں۔ یہ دونوں مدرسے بورڈ آف کنٹرول کے تحت ہوں گے۔ شاہی افواج
بیس ہزار سے زیادہ سوائے غیر معمولی حالات کے ہندوستان نہ بھیجی جائیں گی
جن کے خرچ کا بار کمپنی کے خزانہ پر رہے گا۔ حکومت ہند کو اختیار ہو گا کہ اپنی دیسی
افواج کے لیے قاعدے اور ضابطے مقرر کرے، جنگی سامان تیار کرائے اور
ضرورت کے وقت کورٹ مارشل کا نفاذ کرے۔ پریسی ڈنسیوں کی حکومت کو
بورڈ آف کنٹرول کی منظوری لینے کے بعد اپنے علاقے کے باشندوں پر محصول
لگانے اور نہ دینے کی صورت میں انھیں سزائیں دینے کا اختیار ہو گا۔ جو انگریز
تجارت کی غرض سے ہندوستان میں رہنا چاہیں انھیں مجلس نظما سے اس
کے لئے اجازت اور لائسنس حاصل کرنا ہو گا بغیر اس لائسنس کے وہ ہندوستان

میں سکونت اختیار کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ لائسنس لینے کے بعد بھی وہ ہندوستان میں رہنے کے اس وقت تک مجاز تصور کئے جائیں گے جب تک کہ انکا چال چلن اطمینان بخش رہے گا۔ ان پر ان شرطوں اور قیدوں کی پابندی لازمی ہوگی جو وقتاً فوقتاً ان پر عاید کی جائیں گی۔ اگر کوئی انگریز لائسنس حاصل کئے بغیر ہندوستان چلا جائے گا تو اس پر ہندوستان کی عدالت میں کمپنی کی طرف سے مقدمہ چلایا جائے گا۔ وہ انگریز جو کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے شہروں کی حدوں سے دس میل یا اس سے زیادہ فاصلہ پر سکونت اختیار کرنا چاہیں انھیں اپنے نام باقاعدہ عدالت میں رجسٹری کرانے ہوں گے۔ ہندوستان کے اہل علم کی ہمت افزائی اور تعلیمی ترقی کے لئے کمپنی کے میزانیہ میں سے ایک لاکھ روپیے سالانہ کی رقم محفوظ کر دی جائے گی کلکتہ میں انگلی کن کلیسا کا ایک بشپ مقرر کیا جائے گا جس کے تحت تین آرچ ڈیکن ہوں گے۔ ان کلیسائی عہدہ داروں کی تنخواہیں کمپنی کے خزانہ سے ادا کی جائیں گی۔ پادری جو کمپنی کے مقبوضات میں سکونت اختیار کرنا چاہتے ہوں انھیں بھی لائسنس حاصل کرنے ہوں گے۔ انھیں اجازت ہوگی کہ دیسی لوگوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کو سدھارنے کے لئے انھیں ایسے علوم وفنون کی تعلیم دیں جو انکے لئے مفید ہوں۔ قانون منشور کی ایک دفعہ میں اس امر کی توثیق کی گئی ہے کہ کمپنی اہل ہند کے مذہبی معاملات میں پوری آزادی کے اصول کو تسلیم کرتی ہے اور کسی خاص مذہب کی موافقت میں جانبداری کا اظہار نہیں کرے گی اور اس کو مسیحی مبلغین کے کام سے کوئی سروکار نہیں رہے گا۔

لارڈ منٹو اگرچہ عدم مداخلت کی حکمت عملی کا حامی تھا لیکن ہندوستان کے مخصوص حالات میں اس نے اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کی۔ اس نے مجلس نظماء کو یہ یقین دلادیا کہ ہندوستان میں انگریزی قوت یا سیاسی اقتدار کو گھٹا کر یہ امید رکھنا عبث ہے کہ قیام امن کی کوئی صورت ممکن ہے۔ اس نے عدم مداخلت کو ایسی صورت میں کبھی روا نہ رکھا جبکہ انگریز قوم کی عزت پر حرف آنے کا اندیشہ ہو یا قومی نقصان ہوتا ہو۔ اس نے ٹراونکور، بندیلکھنڈ، سرہند اور ناگپور کے

جنوبی علاقوں پر پنڈاریوں کی یورش کے موقع پر قوت فیصلہ کا ثبوت دیا جو ایک ماہر نظم ونسق کے لئے از حد ضروری ہے۔ منٹو کی عادات سادہ تھیں اور وہ ولزلی کی شان وشوکت کو اور اس اہتمام کو جو گورنر جنرل کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے مضحکہ خیز سمجھتا تھا۔ اپنے ایک خط میں گورنر جنرل کی زندگی کا اس نے اس طرح سے نقشہ کھینچا ہے "کلکتہ میں میں نے جو پہلی رات گزاری تو میرے کپڑے پہننے کے کمرہ میں چودہ ڈھیلے ڈھالے سفید کپڑے پہنے ہوئے شخص موجود تھے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ان میں سے چند خواتین ہوتیں۔ جب میں نے دیکھا کہ جتنے اشخاص ہیں اتنے ہی صافے اور داڑھیاں ہیں تو میری دلی تمنا تھی کہ یہ داڑھی والی خادمائیں رخصت ہو جائیں۔ چنانچہ انھیں علٰحدہ کرنے میں مجھے بڑی مشکل سے کامیابی ہوئی۔ اور اب مجھے اپنے کمرہ میں تنہائی میسر ہے اگرچہ پوری طرح سے نہیں۔ دروازے کھلے رہتے ہیں لیکن بعض اشخاص برابر اپنی نظر مجھ پر رکھتے ہیں۔ جب میں بستر میں ہوتا ہوں تو بھی میری نگرانی کی جاتی ہے۔ کمروں کے درمیان جو گزرگاہ ہے وہاں رات بھر کچھ لوگ پہرہ دیتے ہیں۔ تمام کمروں اور زینوں پر باڈی گارڈ کے سپاہی رہتے ہیں میں اپنے کمرہ سے ذرا اِدھر اُدھر نکلا یا زینے پر گیا تو ہر طرف سے باقاعدہ فوجی سلاموں کی بھرمار ہونے لگتی ہے۔ چار پانچ آدمی سامنے ڈنڈے لئے ہوئے چلتے ہیں۔ اس قسم کی تکلیف دہ حماقتوں میں سے اکثر کو میں نے ختم کر دیا ہے لیکن ابھی بہت سی ایسی حماقتیں باقی ہیں جن سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے اور جن کی وجہ سے راحت اور آسائش گھر سے رخصت ہو جاتی ہے"۔[1]

---

[1] Thompson and Garratt, Rise and fulfilment of British Power in India, p. 249.

گیارھواں باب

مارکوئس آف ہیسٹنگز کے عہد میں سلطنت برطانیہ کی توسیع اور لڑائیاں سر جارج بارلو اور لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں جہاں تک ہو سکا حکومت ہند نے لڑائی بھڑائی سے بچ کر امن و اماں قایم رکھنے کی کوشش کی تاکہ ولزلی کے عہد میں سلطنت کی جو توسیع عمل میں آئی تھی اس پر اکتفا کر کے اندرونی نظم و نسق کو مستحکم بنیادوں پر قایم کیا جائے۔ منٹو کی زیادہ تر توجہ فرانسیسیوں کے ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کرنے اور فرانسیسی اثر کو زائل کرنے کے لئے مختلف دیسی حکمرانوں سے سیاسی اتحاد قایم کرنے میں صرف ہوئی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے گورنر جنرل کے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد محسوس کیا کہ دیسی والیان ملک ایک ایک کر کے برطانوی اقتدار کے جوئے کو اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ راجپوت ریاستوں کو بارلو اور منٹو نے مرہٹوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ پیشوا نے اگرچہ ولزلی کے زمانے میں عہد معاونت کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا لیکن وہ دوسرے مرہٹہ حکمرانوں سے انگریزوں کے خلاف ساز باز میں برابر مشغول تھا تاکہ مناسب موقع آتے ہی عہد معاونت کی پابندیوں کو ختم کر دے۔ ہلکر کے دربار میں پنڈاریوں کے سرگردہ امیر خاں نے اپنے قدم جما لئے تھے۔ خود ہلکر کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اور اس کی فوجی قوت بہت کافی کمزور ہو گئی تھی۔ سندھیا کی فوجیں اپنے ہمسایوں پر

دستبرد کرکے اپنی قوت کو بڑھا رہی تھیں۔ پنڈاری لوگ وسط ہند میں لوٹ مار میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر بنگال اور بہار کی شمالی سرحد پر نیپال کی نئی طاقت نے زور پکڑا تھا اور آہستہ آہستہ کم و بیش دو سو برطانوی گاؤں پر جو سرحد پر واقع تھے قبضہ کرلیا تھا۔[1] منٹو کے زمانے میں نیپالیوں کی پیشقدمی برطانوی علاقے میں بہت بڑھ گئی۔ لیکن منٹو فرانسیسیوں کے خلاف خارجی سیاست کی کارروائیوں میں ایسا گھرا رہا کہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کرسکا۔ ان حالات میں گرکھوں کی ہمت اور بڑھی اور انھوں نے سرن اور گورکھپور کے علاقے میں ان علاقوں پر قبضہ کرلیا جو نواب اودھ نے ۱۸۰۲ء میں ولزلی کے عہد میں کمپنی کو منتقل کئے تھے۔ منٹو نے ۱۸۱۳ء میں ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن نیپال کی حکومت نے انکار کردیا۔ کئی سال کی متواتر فتوحات سے گرکھوں کے دل میں گھمنڈ پیدا ہوگیا تھا۔ یہ انکاری جواب کلکتہ اس وقت پہنچا جبکہ مارکوئس آف ہیسٹنگز اپنے عہدہ کا جائزہ لے چکا تھا۔ چنانچہ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے تمام متعلقہ کاغذات کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس معاملہ میں حکومت نیپال کی صریح زیادتی ہے۔ اگر اس قسم کی کارروائیوں کی فوراً روک تھام نہ کی گئی تو انگریزی حکومت کا ہندوستان میں وقار جاتا رہے گا اور اس کی سخت ذلت ہوگی۔ چنانچہ اس نے حکومت نیپال سے آخری مطالبہ کیا کہ جو علاقے اس نے دبائے ہیں وہ پچیس روز کے اندر واپس کردئے جائیں۔ جب گرکھوں نے اس مطالبہ کی تکمیل نہ کی تو لارڈ ہیسٹنگز نے گورکھپور کے مجسٹریٹ کو یہ حکم بھیجا کہ متعلقہ علاقوں میں سے گرکھوں کو زبردستی نکال دیا جائے۔

لارڈ ہیسٹنگز نے یکم نومبر ۱۸۱۴ء کو حکومت نیپال کے خلاف جب اعلان جنگ کیا تو کمپنی کی حکومت کا خزانہ خالی تھا۔ مجلس نظما کا اصرار تھا کہ سالانہ جتنا سونا ہندوستان سے انگلستان بھیجا جاتا ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ کمپنی کی حکومت کی ساکھ اس زمانے میں اس قدر گری ہوئی تھی کہ لڑائی کے لئے

[1] Marshman, History of India, Vol II, p. 287.

قرض لینا بھی مشکل تھا اس واسطے کہ بازار میں نقد روپیہ بارہ روپئے سیکڑے پر قرض مل سکتا تھا اور حکومت کی ہنڈیاں دس روپئے سیکڑے کا بٹہ کھا رہی تھیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز جانتا تھا کہ گرکھوں سے لڑائی آسان نہ ہوگی۔ جب اور کوئی تدبیر نہ سوجھی تو اس نے نواب اودھ کی طرف نظر دوڑائی جس کے پاس اس وقت ساتھ کروڑ روپیہ نقد جمع تھا۔ لارڈ ہیسٹنگز سے نواب نے شکایت کی تھی کہ ریزیڈنٹ اس کے معاملات میں غیر ضروری طور پر مداخلت کیا کرتا ہے اس پر گورنر جنرل نے نواب کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس ضمن میں کوئی مناسب صورت اختیار کرے گا۔ چنانچہ اس نے ریزیڈنٹ میجر بیلی کو لکھا کہ آئندہ وہ نواب کے ساتھ معاملات کے میں احتیاط برتا کرے۔ اس پر نواب وزیر نے شکریے کے طور پر گورنر جنرل کی خدمت میں ایک کروڑ روپئے نذرانے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز نواب سے ملنے کے لئے لکھنؤ روانہ ہوگیا لیکن ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ نواب کا انتقال ہوگیا۔ لکھنؤ پہنچنے پر نواب کے جانشین فرزند نے ایک کروڑ کا نذرانہ پیش کیا۔ لیکن کلکتہ کونسل نے لارڈ ہیسٹنگز سے بے پوچھے اس رقم میں سے نصف پرانے قرضے ادا کرنے میں صرف کردیا چنانچہ لارڈ موصوف نے نواب سے ایک کروڑ روپیہ بطور قرض لیا تاکہ نیپال کے خلاف اپنے فوج کشی کے منصوبوں کو بروئے کار لاسکے۔

لارڈ ہیسٹنگز نے تیس ہزار فوج اور ۶۰ بڑی جنگی توپیں حکومت نیپال کے خلاف روانہ کردیں۔ انگریزی فوج نے نیپال پر چار طرف سے حملہ کیا۔ انگریزی فوج پہاڑی قلعوں پر قبضہ کرنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی چاہتی تھی کہ چار طرف سے حملہ کرکے گرکھا فوج کا دھیان بٹایا جائے۔ ایک مہم دریائے ستلج کی طرف سے دوسری مہم مشرقی سرحد کی طرف سے نیپال کے صدر مقام کھٹ منڈو کی طرف بھیجی گئی۔ دو مہمیں درمیانی علاقوں میں سے بھیجی گئیں۔ سب سے پہلے جنرل جلیسپی ساڑھے تین ہزار فوج کے ساتھ کلنگا پر حملہ آور ہوا جو مشہور قلعہ تھا۔ اس نے توپ خانہ سے قلعہ کو فتح کرنے کے بجائے ہلہ بول کر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن گرکھوں نے جن کی فوج کی تعداد صرف تین سو تھی اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جس وقت

جنرل جلیسی اپنے سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کو قلعہ کے پھاٹک کے قریب تھا تو ایک گولی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس سانحہ کے بعد جنرل مارٹنڈل جنرل جلیسی کا جانشین مقرر ہوا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر جے ٹوک کا محاصرہ کیا لیکن وہاں بھی اسکو کامیابی نہیں ہوئی۔ جنرل مارلے اور جنرل وڈ کے تحت جو فوجیں قلب نیپال میں گھس جانے کے لیئے بھیجی گئی تھیں ان کو بھی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان ناکامیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ انگریزی فوجیں نیپال کے پہاڑی راستوں اور حالات سے بالکل ناواقف تھیں اس لیئے انھیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ گرکھے بڑی بہادری سے لڑے جس کی لارڈ ہیسٹنگز کو توقع نہ تھی۔ اگرچہ اس نے بہت کافی کمک روانہ کی لیکن حالات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے سوچا کہ اگر جنگ میں انگریزوں کو ناکامی ہوئی تو یہ سلطنت برطانیہ کی ذلت سمجھی جائے گی۔ چنانچہ اس کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے اس قسم کی اطلاعیں پہنچ رہی تھیں کہ ان دیسی والیان ملک نے بھی جنھوں نے پہلے انگریزی اقتدار کو مان لیا تھا نیپال میں انگریزوں کی شکست کی خبر سن کر فوجی مظاہرے شروع کر دیئے تھے۔ پیشوا نے اپنی سربراہی میں سندھیا، رنجیت سنگھ اور امیر خاں کے پاس سفیر بھیجے تاکہ انگریزی حکومت کے خلاف خفیہ معاہدہ طے ہو جائے۔ لیکن آپس کی بے اعتباری کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔

ان حالات سے لارڈ ہیسٹنگز بہت متفکر ہوا لیکن وہ اپنے ارادہ کا پکا تھا۔ اس لئے جنرل اکٹرلونی کو مزید کمک پہنچائی تاکہ وہ ستلج کی طرف سے گرکھوں کے سپہ سالار امر سنگھ کے خلاف پیشقدمی کرے۔ اکٹرلونی نے بھی جنگلوں میں چھاپہ مارنے کی تدبیر جنگ پر عمل کیا جس سے گرکھوں نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ بجائے ہلہ کرنے کے آتش بازی سے اس نے نالاگڑھ۔ تراگڑھ۔ رام گڑھ اور دوسرے مشہور قلعوں کو تسخیر کیا۔ نہایت صبر آزما اور محنت طلب حالتیں بڑی بہادری سے یہ فتحیں حاصل کی گئیں۔ برف باری کی یہ حالت تھی کہ توپوں کیلئے پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے راستہ نکالنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔ بڑی قابلیت سے اکٹرلونی نے امر سنگھ کو اس طرح پر گھیر لیا

کہ کھٹمنڈو سے اس کو کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ امر سنگھ نے مجبور ہو کر مصالحت پر آمادگی ظاہر کی۔ اکٹرلونی نے اپنے دشمن کی بہادری کا خیال کرکے امر سنگھ کو اجازت دے دی کہ وہ قلعہ سے نکل جائے اور کھٹمنڈو جاکر دونوں حکومتوں میں مصالحت کی کوشش کرے۔ کھٹمنڈو میں اس زمانہ میں جو مجلس تولیت تھی اس نے اب محسوس کیا کہ اس کے پہاڑی قلعے ایک ایک کرکے انگریزوں کے ہاتھ میں چلے گئے تو اب سوائے اس کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں کہ مصالحت کرلی جائے چنانچہ سگولی کے مقام پر ۲ دسمبر ۱۸۱۵ء انگریزی حکومت کی طرف سے یہ شرائط پیش ہوئے کہ دریائے کالی کے مغربی علاقوں میں جو راجا اور زمیندار آباد ہیں ان پر حکومت نیپال کو اقتدار حاصل نہ رہے گا۔ سکھم انگریزوں کو واپس کردیا جائے گا۔ ہمالیہ پہاڑ کی ترائی میں جہاں جہاں گرکھوں نے قبضہ کرلیا ہے اس سے وہ دستبردار ہو جائیں گے اور یہ علاقے انگریزی حکومت کے تحت رہیں گے۔ کھٹمنڈو میں انگریزی ریزیڈنٹ رہا کرے گا۔ حکومت نیپال کے نمائندوں نے ان شرطوں پر سگولی میں دستخط کردئے اور یہ وعدہ کیا کہ مجلس تولیت سے باقاعدہ ان شرطوں کی توثیق کراکے صلح نامہ کا مسودہ واپس کردیا جائے گا۔ لیکن مصدقہ صلح نامہ واپس نہیں کیا گیا۔ امر سنگھ نے کھٹمنڈو میں مجلس تولیت کو مشورہ دیا کہ اہل نیپال کو زمین کے چپے چپے پر لڑنا چاہئے اور صلح نامہ کی توثیق کسی طرح مناسب نہیں۔ جب اس کی اطلاع لارڈ ہیسٹنگز کو ہوئی تو اس نے نیپال کی سرحد پر بیس ہزار فوج بطور کمک روانہ کردی تاکہ جنرل آکٹرلونی کی قیادت میں کھٹمنڈو پر کاری ضرب لگائی جائے۔ چنانچہ جنرل آکٹرلونی نے گرکھوں کے دارالحکومت کی طرف پیشقدمی شروع کردی اور وہاں سے ۵۰ میل جاکر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں گرکھا فوج مقابلہ کو آئی لیکن اس کو شکست فاش ہوئی۔ اب گرکھوں کا دم خم ٹوٹ گیا۔ مجلس تولیت نے صلح نامہ سگولی کی تصدیق کرکے جنرل آکٹرلونی کے پاس بھیجدیا۔ اس وقت سے آج تک حکومت نیپال اور حکومت ہند میں برابر صلح قایم ہے اور ہزاروں گرکھے انگریزی فوجوں میں بھرتی ہوتے ہیں یہ بڑے جیوٹ اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ انھوں نے انگریزوں کی ہمیشہ مصیبت کے وقت مدد کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے وقت گرکھوں کی ایک

زبردست فوج انگریزوں کی مدد کو آئی۔ اسی طرح بعد میں مختلف جنگوں میں انھوں نے حکومت ہند کا ساتھ دیا اور ۱۸۱۶ء کے معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ انھوں نے اپنے اور انگریزی حکومت کے صحیح مقام کو جان اور پہچان لیا۔ جس طرح انھوں نے انگریزوں سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اسی طرح انگریزوں نے بھی ان کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ نیپال، چین اور برطانوی ہند کے درمیان شمال میں ایک قدرتی حد فاصل ہے جسے دونوں حکومتیں علیٰ حالہ برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

پنڈاری اور مرہٹے انگریزی حکومت کی گرکھوں سے لڑائی کے وقت وسط ہند میں بدامنی خوب زور پر تھی۔ عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ کمپنی کی حکومت کمزور ہو گئی ہے اس لئے غارتگر گروہوں کے حوصلے خوب بڑھ رہے تھے۔ پنڈاریوں کے زبردست گروہ کا گذارہ شمشیر زنی اور لوٹ مار پر تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں انگریزی حدیں اور برطانوی حمایت کے حلقۂ اثر کے بڑھ جانے کی وجہ سے بہت سی دیسی فوجیں ٹوٹ گئی تھیں۔ چنانچہ کم و بیش پانچ لاکھ پیشہ ور سپاہی بے لگام چھوڑ دئیے گئے تھے کہ بدنظمی اور بے ترتیبی کے علاقوں میں لوٹ مار کر کے پیٹ پالیں۔ بعض دیسی رئیسوں کو انھوں نے دبا لیا اور بعض رئیسوں نے ان کی ہمت افزائی کی۔ وسط ہند میں کوئی ایک ایسی مقتدر قوت نہیں تھی جو ان جنگ بازوں پر قابو پا سکتی۔ پنڈاریوں کے سردار امیر خاں کے پاس تیس ہزار کا لشکر اور ایک زبردست توپ خانہ تھا۔ وہ اس کے بل بوتے پر سارے وسط ہند میں ادھر سے ادھر نقل و حرکت کرتا اور مختلف والیان ریاست کی آپس کی لڑائیوں میں کبھی ایک کا ساتھ دیتا اور کبھی دوسرے کا۔ وہ علاقے بھی جنھوں نے برطانوی حمایت قبول کر لی تھی پنڈاریوں کی لوٹ مار سے محفوظ نہ تھے۔ ہلکر، بھونسلا اور سندھیا نے پنڈاریوں سے خفیہ معاہدے کر لئے تھے جن کے باعث انھیں ان سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن دوسرے سب ان کی دستبرد کا شکار رہا کرتے تھے۔ مرہٹہ سرداروں کو توقع تھی کہ اگر آئندہ کبھی انگریزوں سے لڑائی کی نوبت آئی تو یہ پنڈاریوں کے منظم اور

مسلح گروہ ان کی مدد کریں گے۔ پنڈاریوں کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے جس زمانے میں حکومت ہند گرکھوں سے لڑائی میں مشغول تھی انگریزی علاقوں پر بھی چھاپے مارنے شروع کر دئیے۔ چنانچہ انھوں نے بنگال اور مدراس کے بعض ضلعوں کو بری طرح سے لوٹا کھسوٹا۔

نیپال کی جنگ کے بعد لارڈ ہیسٹنگز نے مجلس نظماء کو نہایت زوردار الفاظ میں لکھا کہ جب تک انگریزی حکومت وسط ہند میں غارت گروں کی سرکوبی نہ کرے اس وقت تک برطانوی علاقوں کا امن و امان خطرے میں رہے گا۔ مرہٹوں کی سرحد کے پیچھے راجپوتوں کی ریاستیں تھیں جو اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھیں اور زبردست غارت گروں کی درازدستیوں کی روک تھام ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان میں سے بعض ریاستوں نے حکومت برطانیہ سے بہ اصرار درخواست کی تھی کہ انھیں اپنے زیر حمایت لے لے لارڈ ہیسٹنگز کو مجلس نظماء سے یہ ہدایت دی گئی کہ پنڈاریوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے اس واسطے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو انگریزی حکومت کو سندھیا اور دوسرے مرہٹہ سرداروں سے الجھنا پڑے گا۔ اکتوبر ۱۸۱۵ء میں پنڈاریوں نے نربدا کو عبور کر کے سرکار نظام کے علاقوں کو جنوب کی طرف دریائے کرشنا تک خوب لوٹا اور مال غنیمت سے لدے پھندے وسط ہند واپس ہوئے۔ فروری ۱۸۱۶ء میں انھوں نے شمالی سرکار پر چڑھائی کی۔ گنتور کو جی بھر کے لوٹا اور آس پاس کے علاقوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ جب کلکتہ اس کی خبر پہنچی تو گورنر جنرل نے سمندر کے راستے سے فوج بھیجی لیکن پنڈاری اس کے پہنچنے سے پہلے ہی لاپتا ہو چکے تھے۔ یورش میں پنڈاری پچیس لاکھ سے زیادہ کا مال غنیمت اپنے ساتھ لے گئے۔

راجا ناگپور سے معاہدہ

لارڈ ہیسٹنگز نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت کو رگھوجی بھونسلا راجا ناگپور سے اتحاد قایم کرنا چاہیے اس لئے کہ شمالی سرکار اور بنگال پر پنڈاریوں کی یورش اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جبکہ انکی فوجیں راجا ناگپور کے علاقوں میں سے گذریں۔ لیکن راجا عہد معاونت کی

شرطیں ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۱۶ء کو رگھوجی بھونسلا کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا پرساجی جانشین ہوا۔ یہ لڑکا اندھا، رعشہ کا مریض اور فاتر العقل تھا۔ دوبار ناگپور میں سازشوں کا بازار گرم تھا جن کا حال ہمیں ناگپور کے انگریز ریزیڈنٹ مسٹر جنکنس کے خطوں سے معلوم ہوا ہے۔[1] آخر رگھوجی بھونسلا کا بھتیجا مدہوجی بھونسلا جو اپا صاحب کے نام سے مشہور ہے نظم و نسق پر حاوی ہوگیا اور ریاست کا متولی بن گیا۔ انگریز ریزیڈنٹ نے لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا کہ اگر اس وقت ہم اپا صاحب کا ساتھ دیں تو ہم عہد معاونت کی تمام شرطیں جنھیں رگھوجی نے ماننے سے انکار کیا تھا اس سے منوا سکتے ہیں چنانچہ جنکنس کو حکومت ہند نے مجاز گردانا کہ وہ اپا صاحب سے اس ضمن میں بات چیت شروع کردے۔ ۲۷ مئی ۱۸۱۶ء کو اپا صاحب نے ایک معاہدہ پر دستخط کردئے جس کی رو سے چھ ہزار پیدل اور رسالہ کی ایک رجمنٹ کا مناسب توپ خانہ کے ساتھ ناگپور میں رہنا طے ہوا جس کا خرچ دربار ناگپور کے ذمہ ہوگا۔ اپا صاحب نے یہ پابندی بھی مان لی کہ وہ دوسرے والیان ملک سے جنگ نہیں کرے گا اور دوسرے حکمرانوں سے کوئی جھگڑا پیش آجائے گا تو انگریزی حکومت کا تصفیہ قطعی تصور ہوگا۔ ناگپور دربار دوسرے درباروں سے کسی قسم کا سیاسی تعلق نہیں رکھے گا۔ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے راجا تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل فوج رکھ سکے گا لیکن اس کی نگرانی انگریز ریزیڈنٹ کے ذمہ ہوگی۔ اس معاہدہ کو اس وقت تک خفیہ رکھا گیا جب تک کہ کرنل واکر کی ماتحتی میں انگریزی حمایتی فوج ناگپور نہ پہنچ گئی۔ راجا ناگپور سے انگریزی حکومت کا یہ معاہدہ سیاسی اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ بقول مالکم "اس زمانے کے ہندوستان کے حالات میں اس عہد معاونت سے زیادہ باعث خوش قسمتی اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی تھی۔ اسکی وجہ سے مرہٹہ قوم کے اتحاد پر کاری ضرب لگ گئی"۔[2]

---

[1] Jenkins to Moira (Lord Hastings), despatches of 25th Mareh, No. l and 29th March, No. 2, (Bengal consultations, 15th April, 1816)

[2] Malcolm, Political History of India, Vol. I, p. 465.

لارڈ ہیسٹنگز نے بورڈ آف کنٹرول کو متعدد بار اس جانب متوجہ کیا کہ پنڈاریوں کا استیصال برطانوی حکومت کے استحکام کے لئے ازبس ضروری ہے۔ لیکن کیننگ جو بورڈ آف کنٹرول کا اس زمانے میں صدر تھا، پنڈاریوں کے خلاف اقدامی کارروائی کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے لارڈ ہیسٹنگز کو مشورہ دیا کہ چونکہ پنڈاریوں کے خلاف لڑائی لڑنے میں اندیشہ ہے کہ کہیں برطانوی حکومت کو مرہٹوں کے ساتھ بھی نہ الجھنا پڑے اس لئے مناسب یہی ہے کہ عام جنگ کی جوکھم میں پڑے بغیر کوشش کرنی چاہئے کہ پنڈاریوں کے بعض سرغنوں کو توڑ لیا جائے تاکہ ان کی مدد سے دوسروں کو جو زیادہ خطرناک ہیں گرفتار کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ ہندوستان کے حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب شمالی سرکار پر پنڈاریوں کی یورش اور سفاکی کی اطلاع انگلستان پہنچی تو کیننگ اور بورڈ آف کنٹرول نے اپنی رائے بدل دی۔ کیننگ نے بورڈ آف کنٹرول کے صدر کی حیثیت سے لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا کہ بورڈ ان تجویزوں کو پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور انھیں منظور کرتا ہے جو گورنر جنرل نے پنڈاریوں کے استیصال کے متعلق پیش کی ہیں۔ اس ضمن میں گورنر جنرل کو جو ہدایتیں دی گئیں ان میں اس امر کی بھی صراحت کر دی گئی کہ بورڈ آف کنٹرول ان فوجی کارروائیوں کو نہیں روکنا چاہتا جو برطانیہ کا اقتدار قایم رکھنے اور بے پناہ مخلوق کی حمایت اور حفاظت کے لیے اختیار کی جائیں۔ اگر سندھیا اور ہلکر کا کوئی لگاؤ ان پنڈاریوں سے انگریزی حکومت اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ثابت ہو جائے تو ان دونوں کو بھی برطانوی حکومت کا دشمن اور مخالف سمجھنا چاہیئے۔

لارڈ ہیسٹنگز نے پنڈاریوں کے خلاف جنگ کی تیاری نہایت وسیع پیمانے پر کی اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑائی آخر مرہٹوں کے خلاف رنگ اختیار کرے گی۔ سندھیا اور ہلکر کے یہاں پنڈاریوں کی مستقل فوجیں رہا کرتی تھیں۔ واصل محمد خاں اور کریم خاں جو پنڈاریوں کے بڑے سرغنا تھے سندھیا کی

ملازمت میں رہ چکے تھے اور بعد میں بھی سندھیا کے دربار میں ان کا اثر کام کرتا رہا۔ چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز نے سندھیا کو مطلع کر دیا کہ انگریزی حکومت پنڈاریوں کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آکر ان کے خلاف فوج کشی کرنا چاہتی ہے۔ اس سے خواہش کی گئی کہ وہ اس کام میں انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کرے اور ھنڈیا اور اسیر گڑھ کے قلعوں پر انگریزی فوجی مرکز قایم کرنے کی اجازت دے۔ سندھیا کے دربار میں پنڈاریوں کے جو کارکن موجود تھے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ سندھیا اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دے انھوں نے سندھیا کو یہ بھی یاد دلایا کہ اگر پنڈاری فنا کر دئے گئے تو خود اسکی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ پنڈاری ہمیشہ ضرورت کے وقت اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کو تیار تھے۔ اگر وہ باقی نہ رہے تو سندھیا اپنی سیاسی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ چنانچہ سندھیا نے شروع میں لارڈ ہیسٹنگز کو کوئی قطعی جواب نہیں دیا اور کوشش کی کہ بات کو ٹال جائے لیکن بیشتر اس کے کہ سندھیا کوئی فوجی تیاری کرتا انگریزی فوجوں نے دریائے جمنا پار کر کے گوالیار کی طرف نقل و حرکت شروع کر دی۔ سندھیا نے دیکھا کہ انگریزوں نے ناگپور کے وسیلے حاصل کر لئے ہیں اور لارڈ ہیسٹنگز کی حکمت عملی ولزلی کی حکمت عملی سے ملتی جلتی ہے اس واسطے مناسب یہی ہے کہ مصالحت کر لی جائے چنانچہ ۵ نومبر ۱۸۱۷ء اس نے باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ پنڈاریوں کے خلاف اتحاد عمل کا وعدہ کر لیا۔ سرجی ارجن گاؤں کے معاہدہ کی وہ دفعہ منسوخ قرار دی گئی جس کے مطابق انگریزی حکومت کو اس اختیار سے محروم کیا گیا تھا کہ وہ راجپوت حکمرانوں سے معاہدے کر سکے۔ سندھیا اسیر گڑھ کے قلعہ سے بھی دستبردار ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی وسط ہند اور راجپوتانہ کے ۱۹ والیان ریاست کے وکیل انگریزی حکومت کے ریزیڈنٹ سر چارلس مٹکاف کے پاس دہلی آئے تاکہ انگریزی حکومت کی حمایت حاصل کریں۔ ان والیان ریاست میں جنھوں نے برطانوی حمایت قبول کی نواب بھوپال، راجا جے پور، راجا جودھپور، راجا کوٹہ اور راجا بوندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اب لارڈ ہیسٹنگز نے تینوں احاطوں (پریسیڈنسیوں) کی فوجیں طلب کیں

جن کی تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔ اس فوج کو شمالی اور جنوبی کمان میں تقسیم کیا گیا۔ شمالی فوج کا صوبہ شمال مغربی (موجودہ یو۔پی) کی طرف سے خود لارڈ ہیسٹنگز کی ماتحتی میں بڑھنا طے ہوا اور جنوبی فوج سر تھامس ہسلاپ کے تحت رکھی گئی۔ ان فوجوں کے پیش نظر ایک تو یہ مقصد تھا کہ پنڈاریوں کا استیصال کیا جائے اور دوسرے یہ بھی کہ مرہٹہ ریاستوں پر نظر رکھی جائے کہ وہ اپنی غیر جانبداری سے دستبردار نہ ہوں۔ انگریزی فوجوں نے پنڈاریوں کے مرکزوں پر حملے کئے اور پورے وسط ہند میں ان کے خلاف ایک گھیرا سا قایم کر لیا جس میں سے نکل کر وہ نہ جا سکے۔

پیشوا

جس وقت انگریزی حکومت گرگھوں کے خلاف لڑائی لڑ رہی تھی تو پیشوا نے ہلکر، سندھیا اور امیر خاں سے کمپنی کے خلاف خفیہ معاہدے کئے جن کا منشاء یہ تھا کہ انگریزی حکومت کے خلاف سب مل کر لڑیں تاکہ اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو اور ولزلی کے زمانے میں مرہٹوں نے جو شرطیں کمپنی کی بالادستی کے متعلق مان لی ہیں وہ ختم کر دی جائیں۔ پیشوا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس طرح وہ مرہٹہ برادری میں اپنا کھویا ہوا اثر پھر سے قائم کر لے۔ جب لارڈ ہیسٹنگز نے پنڈاریوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فوج کشی کی تو پیشوا نے بھی فوجی تیاری شروع کر دی اور انگریز ریزیڈنٹ کو یہ باور کرایا کہ وہ فوجی تیاری اس لئے کر رہا ہے کہ پنڈاریوں کے خلاف انگریزوں کی امداد کر سکے۔ پیشوا کے دربار میں اس زمانے میں ترمبک جی نے بڑا اثر پیدا کر لیا تھا جو انگریزوں کا سخت دشمن تھا وہ برابر پیشوا کو اکساتا رہتا تھا کہ انگریزوں کا جوا اتار پھینکے۔ جب گنگا دھر شاستری جو مہاراجہ گیکواڑ کا وزیر تھا بعض رقمی معاملوں کے تصفیہ کے لیے پونا آیا تو ترمبک راؤ کے اشارہ پر اس کو قتل کر دیا گیا۔ گنگا دھر شاستری انگریزی حکومت کے زیر حفاظت تھا۔ چنانچہ پونا کے انگریز ریزیڈنٹ الفنسٹن نے اس معاملہ کی تحقیقات کرائی تو ترمبک جی کا جرم ثابت ہو گیا۔ اس نے پیشوا سے درخواست کی کہ ترمبک جی کو انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کو تھانہ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا

لیکن کچھ عرصے بعد وہ بھیس بدل کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس کے بعد پیشوا کی انگریزوں کے خلاف ریشہ دوانیاں اور بڑھ گئیں، اگرچہ بظاہر وہ ان کے ساتھ دوستی کے دعوے کرتا تھا۔ الفنسٹن کی نظر سے وہ تمام خفیہ کارروائیاں پوشیدہ نہیں تھیں جو پیشوا کچھ عرصہ سے کر رہا تھا اور جن کی تہ میں ترمبک جی کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل کے ایما پر اس نے پیشوا کو مجبور کیا کہ وہ ایک معاہدے کے مسودے پر دستخط کرے جس کی وجہ سے پیشوا سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے دربار سے تمام والیانِ ملک کے وکیلوں کو نکال دے جن کے ذریعہ سے وہ انگریزوں کے خلاف سازشیں کیا کرتا تھا۔ اگر کسی والی ملک کے ساتھ پیشوا کے جھگڑے ہیں تو وہ سب انگریزی حکومت کی طرف رجوع ہونے چاہئیں ساگر اور بندیلکھنڈ پر جو اس کو حقوق حاصل ہیں ان سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو جائے مرہٹہ برادری کے اعلیٰ سردار کی حیثیت سے اگر پیشوا کے کوئی دعاوی ہوں تو ان سے بھی دستبردار ہو جائے۔ پیشوا کوشش کر کے ترمبک جی کو گرفتار کرا کے انگریزی حکومت کے حوالے کرے۔ چنانچہ پیشوا نے اعلان کیا کہ جو شخص ترمبک جی کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کرے گا اسکو دو لاکھ روپیہ نقد اور ایک گاؤں انعام میں دیا جائے گا جس کی سالانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ ہوگی۔ پیشوا اور اس کے وزیروں نے ان تحریری شرائط کی سختی کو کم کرانے کی کوشش کی اور بتایا کہ انگریزی حکومت اپنے معاہدوں کی پابندی کے متعلق پیشوا کے ساتھ بمقابلہ دوسرے والیان ملک کے زیادہ سختی برتتی ہے۔ لیکن الفنسٹن کو اصرار تھا کہ اگر اس معاہدہ پر فوراً دستخط نہ کئے گئے تو پیشوا کو انگریزی حکومت کا دشمن سمجھا جائے گا۔ اس معاہدہ کی شرطیں اس قدر سخت تھیں کہ بورڈ آف کنٹرول نے بھی ان پر اعتراض کیا۔[1]

ظاہری طور پر پیشوا نے انگریزوں سے اچھے تعلقات رکھے لیکن درپردہ اس نے اپنے ایلچی ہلکر، سندھیا اور بھونسلا کے پاس بھیجے اور ان سے اپیل کی

---

[1] Mehta, Lord Hastings and the Native States, p. 63

کہ مرہٹہ برادری کو تنہا ہونے سے بچائیں۔ اس لئے اپنی دولت اس کام میں بے دریغ صرف کی۔ قلعوں کی مرمت کرائی اور بحری بیڑے کو منظم کیا تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ اس نے اپنے سپہ سالار گوکھلے کو ایک کروڑ روپیہ دیا تاکہ نئے سپاہی بھرتی کئے جائیں۔ جاگیرداروں کی ہر طرح تالیف قلب کی گئی تاکہ انکے ذریعہ سے بھی فوج کی بھرتی میں مدد ملے۔ اس نے انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو بھی لالچ دے کر ملانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مسٹر الفنسٹن انگریز ریزیڈنٹ مقیم پونا نے جب یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو وہ احتیاطاً پونا سے باہر کھڑکی چلا گیا اور بمبئی سے مزید انگریزی فوج بلا بھیجی۔ لیکن اس مزید فوج کے آجانے کے بعد بھی انگریزی فوج کی کل تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔ برخلاف اس کے پیشوا کے پاس اس وقت اٹھارہ ہزار فوج تھی۔ پیشوا نے سندھیا، ہلکر بھونسلا اور امیر خاں سے طے کرلیا تھا کہ جب وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع کرے تو وہ سب کے سب انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کردیں۔

۵ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیشوا نے مسٹر الفنسٹن کو تحکمانہ پیغام بھیجا جس میں ان خاص شرطوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی جن کے بموجب وہ انگریزی حکومت سے تعاون کرنے کو آمادہ ہے۔ لیکن یہ شرطیں ان تمام شرائط کو منسوخ کرتی تھیں جو وہ پہلے عہد معاونت کے ذریعہ تسلیم کرچکا تھا۔ مرہٹہ افواج نے پونا میں ریزیڈنسی کی عمارت کو آگ لگادی اور شہر سے کھڑکی کی طرف کوچ کردیا۔ کرنل بر اور جنرل اسمتھ نے کھڑکی کے قریب پیشوا کی فوج کا مقابلہ کیا اور شاندار فتح حاصل کی۔ جنرل اسمتھ نے وہاں سے سیدھا پونا کا رخ کیا۔ دوسرا مقابلہ کرنے کی باجی راؤ کو ہمت نہیں ہوئی۔ شہر پونا پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ اس طرح پیشوا کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ باجی راؤ کا جنرل اسمتھ اور جنرل پرٹزلر نے پیچھا کیا۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگا بھاگا پھرتا رہا۔ ایک ایک کرکے اس کے سارے مشہور قلعوں پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ باجی راؤ نے

راجا ستارا کو اپنے ساتھ حراست میں رکھا اس واسطے کہ اس کو اندیشہ تھا کہیں انگریز اس کی ساری حکومت اس کے حوالے نہ کر دیں۔ باپو گوکھلے پیشوا کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ اس نے اور تازہ دم فوج بھرتی کی تاکہ انگریزوں سے آخری مقابلہ کیا جائے۔ ترمبک جی نے جو آخر تک پیشوا کے ساتھ رہا اس کی ڈھارس بندھائی کہ آخر میں جیت انہیں کی ہوگی۔ پیشوا نے جنرل اسمتھ کا راستہ کاٹ کر پونا کی طرف کوچ کیا تاکہ اپنی تازہ دم فوج کے بل پر اس شہر کو جس پر ایک صدی سے اس کے گھرانے کی حکومت تھی پھر قبضہ کرے۔ کوڑی گاؤں کے مقام پر کمپنی کی فوج نے باپو گوکھلے کو سخت شکست دی۔ یہاں سے پیشوا پھر جنوب کی طرف چل دیا۔ اچانک جنرل اسمتھ نے آشٹی کے مقام پر اس کو جا لیا۔ باپو گوکھلے لڑائی میں مارا گیا۔[1] مرہٹہ فوج میں سراسیمگی پھیل گئی اور وہ ادھر اُدھر منتشر ہونا شروع ہو گئی۔ انگریزی فوج نے آشٹی کے مقام پر راجا ستارا کو پیشوا کی نظر بندی سے چھڑا لیا۔ پیشوا چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ شمال کی طرف بھاگا۔ دریائے تاپتی کو پار کر کے وہ نربدا کے شمال میں جانا چاہتا تھا۔ لیکن انگریزی فوجوں کے دستے تمام گھاٹوں پر متعین تھے۔ جب پیشوا نے کوئی مفر نہ دیکھا تو سر جان مالکم کو لکھا کہ وہ کوشش کر کے انگریزی حکومت سے اس کے قصور معاف کروا دے۔ لیکن لارڈ ہیسٹنگز پیشوا کے علاقوں کی ضبطی کے متعلق پہلے ہی الفنسٹن کو لکھ چکا تھا۔ چنانچہ الفنسٹن نے اس کا اعلان کر دیا کہ پیشوا اور اس کے خاندان کو تخت پونا سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا۔ حکومت پونا کے تحت جو ملک تھا اس میں سے پندرہ لاکھ سالانہ آمدنی کے علاقوں پر راجا ستارا کی حکومت قایم کر دی گئی۔ باقی ملک کو کمپنی کے احاطۂ بمبئی میں ملا لیا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز کی رائے تھی کہ باجی راؤ کو دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا جائے لیکن سر جان مالکم نے[2]

Tharntoo, History of the British Empire in India, Vol. IVp. 503. ؎۱

2. Kaye, Life of Malcolm, Vol. II, p. 237 ؎۲

اس سے آٹھ لاکھ روپیے سالانہ کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی اور بٹھور ضلع کانپور میں دریائے گنگا کے کنارہ اس کو رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ بعد میں عرصے تک زندہ رہا اور کمپنی کے خزانے سے ڈھائی کروڑ روپیہ وظیفے کی شکل میں وصول کیا۔ ترمبک جی کو گرفتار کر کے بنارس کے قریب چنار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور وہ زندگی بھر قید ہی میں رہا۔

واقعات ناگپور اپا صاحب کے خلاف دربار ناگپور میں سازش کا سلسلہ جاری رہا۔ اور وہ خود بھی سازش کرنے میں کسی سے کم نہ تھا۔ چنانچہ اس نے یکم فروری ۱۸۱۷ء راجا کو قتل کرا کے خود راج گدی پر قبضہ جمایا۔ باجی راؤ نے اس کو خلعت سے سرفراز کیا۔ مسٹر جنکنس نے جو اس زمانے میں ناگپور میں ریزیڈنٹ تھا اپا صاحب کو ہر چند سمجھایا کہ وہ باجی راؤ کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئے اور انگریزوں سے اتحاد قایم رکھے لیکن جب باجی راؤ نے جنگ شروع کی تو اس نے بھی انگریزوں کے خلاف فوج کشی کی اور سیتابلدی کے مقام پر شکست کھائی۔ جنکنس نے اس شرط پر اپا صاحب کو گدی پر رہنے دیا کہ اپنی فوج، توپیں اور ان تمام قلعوں کو انگریزی حکومت کے حوالے کر دے جن کی فوجی لحاظ سے انھیں ضرورت ہو اور ایسے لوگوں کو وزیر مقرر کرے جن پر انگریزوں کو بھروسا ہو۔ برار، گاول گڑھ اور سہاگ پور کے زرخیز علاقے انگریزی حکومت کے حوالے کر دئے جائیں گے۔ ان شرطوں پر اپا صاحب نے صلح کر لی لیکن یہ صلح کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتی رہی۔ اس لئے باجی راؤ سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور چاندہ کے مقام پر اپنی فوج کے ساتھ باجی راؤ سے ملنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سارے منصوبے کی خبر برٹش ریزیڈنٹ کو مل گئی۔ اس لئے اپا صاحب کو گرفتار کرا لیا۔ ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو لکھا کہ اس کا ثبوت فراہم ہو گیا ہے کہ سابق راجا پرسوجی بھونسلا کو اپا صاحب نے قتل کرایا ہے اس لئے اب اپا صاحب راج گدی کا مستحق نہیں نیز اس نے اپنے ان سیاسی تعلقات سے جو باجی راؤ، کے ساتھ ہیں یہ بات

ثابت کردی ہے کہ انگریزی حکومت کبھی بھی اس پر بھروسا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ مناسب صورت یہ ہوگی کہ رگھوجی بھونسلا کے نواسے کو ناگپور کی راج گدی پر بٹھا دیا جائے۔ آپا صاحب انگریزوں کی قید سے بھاگ گیا جبکہ اس کو کرنل براؤن الہ آباد لے جا رہا تھا۔[1] اس نے وسط ہند کے گونڈ قبیلوں کی فوج بھرتی کی تاکہ مقابلہ پر آئے لیکن اس کی غیر منظم جمعیت منتشر کردی گئی۔ آپا صاحب نے بھاگ کر رنجیت سنگھ کے پاس پنجاب میں پناہ لی۔ رنجیت سنگھ نے انگریزی حکومت سے استصواب کرنے کے بعد اس کو اپنی پناہ میں لے لیا لیکن اس کی حیثیت ایک سیاسی قیدی کی تھی۔ آیندہ آٹھ سال تک ناگپور کا انتظام انگریز عہدہ داروں کے ہاتھ میں رہا۔

ہلکر

۱۸۱۱ء میں جسونت راؤ ہلکر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ تلسی بائی نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ لیکن فوجی سردار اس کے خلاف ہو گئے۔ چنانچہ تلسی بائی کو قتل کرا دیا گیا اور نوجوان ملہر راؤ کو فوجی سرداروں نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ جو مرہٹہ سردار اس وقت اندور کے دروبست پر حاوی تھے وہ انگریزی حکومت کے سخت دشمن تھے۔ باجی راؤ کی فوج کشی کی خبر سن کر انھوں نے بھی اپنے لشکروں کا رخ دکن کی طرف پھیر دیا۔ مہد پور کے مقام پر دسمبر ۱۸۱۷ء میں سر تھامس ہسلاپ کی انگریزی فوج سے ہلکر کے لشکر کا مقابلہ ہوا۔ سر جان مالکم اور سر تھامس ہسلاپ کو کامیابی ہوئی۔ ملہر راؤ ہلکر کو جس کی عمر اس وقت صرف گیارہ سال تھی انگریزوں نے اپنی حراست میں لے لیا۔ مندسور کے مقام پر سر جان مالکم نے ہلکر کے وزیر تانتیا جوگ سے معاہدہ طے کیا جس کی رو سے ہلکر نے عہد معاونت تسلیم کر لیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اندور میں انگریزی فوج رہے گی۔ کوہ ستپورہ کے جنوب میں جن علاقوں پر ہلکر کو دعویٰ تھا اس سے وہ دستبردار ہو جائے گا۔ ان میں خاندیس کے علاقے بھی شامل تھے۔ راجپوتانہ کی ریاستوں کے معاملوں میں

---

[1] Auber, Rise and Progress of the British Power in India, Vol. II, p. 541.

ہلکر آئندہ سے کسی قسم کا دخل نہیں دے گا اور نہ ان پر اس کے کوئی مطالبات باقی رہیں گے۔ دوسرے والیان ریاست سے سیاسی تعلقات نہیں رکھے جائیں گے اور اگر کسی دوسری ریاست سے ہلکر کا کوئی جھگڑا ہوگا تو کمپنی فیصلہ کرے گی۔ ہلکر کی فوج منتشر کر دی گئی سوائے تین ہزار رسالہ کے جو انگریزی حمایتی فوج کے ساتھ ملا دیا گیا۔

اگرچہ سندھیا نے ۱۸۱۸ء کے معاہدہ کے مطابق اسیر گڑھ کے قلعہ کو کمپنی کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن چونکہ فوراً اس قلعہ پر قبضہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے سندھیا کے قلعہ دار ہی اس پر قابض رہے اسیر گڑھ کے قلعدار جسونت راؤ لار نے انگریزی فوج پر جب کہ وہ پیشوا کا پیچھا کرتی ہوئی اس کے قلعہ کے قریب سے گزری تو گولیاں چلوا دیں۔ اس کے علاوہ انگریزی حکومت کو اس کی بھی اطلاع ملی تھی کہ اسیر گڑھ کا قلعہ دار پنڈاریوں کی خفیہ امداد کر رہا ہے۔ چنانچہ گورنر جنرل نے سندھیا کو اس واقعہ کی طرف متوجہ کیا۔ سندھیا نے محض دکھاوے کے لیے قلعدار کو برطرف کر دیا لیکن در پردہ اس کو شہ دے دی کہ قلعہ پر قابض رہے۔ اس پر گورنر جنرل نے حکم دے دیا کہ اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا جائے۔ جنرل ڈوٹن کی ماتحتی میں فروری ۱۸۱۹ء میں محاصرہ شروع ہوا۔ اسیر گڑھ کا قلعہ ہندوستان کے ناقابل تسخیر قلعوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک مہینے کے محاصرے کے بعد قلعہ اسیر گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا قلعہ میں سندھیا کے دستخط سے ایک خط ملا جس میں قلعدار کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ باجی راؤ کی ہر طرح سے مدد کرے اور انگریزوں کا مقابلہ کرے۔ اگرچہ گورنر جنرل کے پاس کافی ثبوت موجود تھا کہ اسیر گڑھ کے معاملہ میں سندھیا نے فریب سے کام لیا جس کی بنا پر وہ اس کو گدی سے برطرف کر سکتا تھا لیکن اس نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور اس کی ریشہ دوانیوں کو نظر انداز کر دیا۔[1] اسیر گڑھ

---

[1] Kaye, Life of Malcolm, Vol, II, p. 286-98

کی فتح کے بعد مرہٹوں کی تیسری جنگ کا خاتمہ ہوا۔

مرہٹہ قوت کو توڑنے کے ساتھ ساتھ انگریزی فوجیں پنڈاریوں کا برابر پیچھا کرتی رہیں۔ سندھیا کے ساتھ معاہدہ ہو جانے کے بعد امیر خاں کو لارڈ ہیسٹنگز نے یہ شرط پیش کی کہ اگر وہ اپنی فوج کو برخاست کر کے ڈیڑھ سو توپوں کو جو اس کے پاس تھیں انگریزوں کو مقررہ قیمت پر حوالے کر دے تو اس کو ان علاقوں کا رئیس بنا دیا جائے گا جو اس وقت اس کے قبضہ میں تھے۔ شروع میں تو امیر خاں اس شرط کو ماننے کو تیار نہیں ہوا لیکن جب اس نے اپا صاحب اور پیشوا باجی راؤ کی بربادی کی خبریں سنیں تو اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے ماتحت اس کو ٹونک کا والیٔ ریاست تسلیم کیا گیا جس کی آمدنی اس زمانے میں پندرہ لاکھ تھی۔ دوسرے پنڈاری سرغناؤں میں کریم خاں اور واصل خاں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور مصالحت کی درخواست کی۔ کریم خاں کو گورکھپور کے قریب جاگیر دی گئی۔ واصل خاں نے زہر کھا کر جان دی۔ سر جان مالکم نے چیتو کا جنگلوں میں پیچھا کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بیس ہزار ساتھیوں کو پیچھا کر کے منتشر کر دیا گیا۔ لیکن چیتو گرفتار نہ ہو سکا کہا جاتا ہے کہ اسیر گڑھ کے قریب کے جنگل میں جہاں وہ جا کر چھپا تھا کسی جنگلی جانور نے اس کو ہلاک کر دیا[1]۔ پنڈاریوں کے خلاف جو کارروائی کی گئی وہ تمام پردیسی فوج کے ذریعہ سے کی گئی جس کی سربراہی میں انگریز افسر تھے۔ اس طرح پنڈاریوں کے خانہ بدوش لٹیرے جتھوں سے وسط ہند کو نجات ملی۔ ان میں سے بہت سوں نے معافی مانگ کر امن و سکون کی زندگی اختیار کر لی۔ اگر برطانوی حکومت واقعی پورے ملک کی قوت بالادست بننا چاہتی تھی تو اس کے لئے لازمی تھا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلانے والے عناصر کا پوری طرح سے استیصال کرے۔ لارڈ ہیسٹنگز نے

[1] Fortesque, A History of the British Army, XI, p. 177.

صحیح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ یہ مقصد سیاسی نامہ و پیام سے نہیں حاصل ہوسکتا بلکہ فوجی ذریعوں ہی سے اس کا حصول ممکن تھا۔ چنانچہ فوجی تنظیم کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ جس وقت لارڈ ہیسٹنگز نے پنڈاریوں اور مرہٹوں کے خلاف فوجی پیش قدمی کا قصد کیا تو اس وقت برطانوی حکومت کے دشمنوں کے پاس ڈیڑھ لاکھ سوار اور پیدل فوج میدان میں لائی جاسکتی تھی اور بعد میں واقعی لائی گئی۔ لیکن کمپنی کی ہندوستانی فوج نے انگریز افسروں کے تحت اس زبردست فوجی خطرہ کی ہمیشہ کے لئے روک تھام کردی۔ وسط ہند اور مالوہ کے علاقے تقریباً ایک صدی کی سیاسی ابتری کی وجہ سے ویران ہوگئے تھے۔ باضابطہ انتظام قائم ہونے سے وہ گاؤں جو اُجڑ گئے تھے پھر سے آباد ہونے لگے اور رعایا کی خوشحالی بڑھی۔

لارڈ ہیسٹنگز نے مرہٹوں کی قوت کو توڑ کر وہ کام پورا کیا جس کا بیڑا لارڈ ولزلی نے اٹھایا تھا۔ پیشوائی کے عہدہ کو ختم کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ مرہٹہ برادری پھر کبھی کسی مرکز کے تحت سر نہ اٹھا سکے اور انگریزی بالادستی کے لئے خطرہ نہ بن سکے۔ اب سوائے پنجاب اور سندھ کے انگریزی حکومت کا اقتدار تمام ہندوستان نے مان لیا تھا۔ اہل ہند کو پوری طرح یقین ہوگیا کہ ان کے ملک کا اقتدار ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا اور انگریزی کمپنی اکبر اور اورنگ زیب کے تاج و تخت کی مالک بن گئی[1]۔ لارڈ ہیسٹنگز نے بجائے ولزلی کے حمایتی اصول کے اتحتی کے اصول کے مطابق والیان ریاست کو برطانوی سیاسی اتحاد میں شریک کیا۔ راجپوتانہ اور مالوہ کی ریاستوں سے جو معاہدے کئے گئے ان سب کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر والئی ملک نے برطانوی بالادستی کو صاف طور پر تسلیم کیا۔ انگریزی حکومت کو حق حاصل ہوگیا کہ اگر اس کو فوجی امداد کی ضرورت ہوئی تو اتحاد کرنے والی ریاست کی فوج کو کمپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق استعمال کرسکے گی۔ فوج کی تعداد کا

[1] Marshman, History of India, Vol. II, p. 345-346.

کوئی تعین نہیں کیا گیا" تاکہ پوری فوج کو کمپنی اپنے اغراض کے لئے استعمال کر سکے اور اس کے اخراجات اسے نہ اٹھانے پڑیں۔ چونکہ وسط ہند اور مالوہ کی ابتری کی ایک بڑی وجہ وہاں کے مختلف والیان ملک کی باہمی رقابتیں تھیں جن کی وجہ سے جنگ اور غارت گری کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لئے برطانوی حکومت کو قوت بالادست کی حیثیت سے یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ ان کے جھگڑوں میں پنچ بن کے جھگڑے چکا دے۔ ان ریاستوں کے خارجی امور کلیتاً کمپنی کے تحت آ گئے لیکن لارڈ ہیسٹنگز چاہتا تھا کہ ان کے اندرونی نظم و نسق میں کمپنی کے نمائندے جہاں تک ہو سکے مداخلت نہ کیا کریں[۱]۔ اس میں شبہ نہیں کہ راجپوتانہ کی متعدد ریاستوں کو برطانوی اتحاد میں شریک ہونے سے اس بدامنی سے نجات ملی جو مرہٹوں کی یورشوں کے سبب سے ان کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن سندھیا کے ساتھ لارڈ ہیسٹنگز نے جو معاہدہ کیا اس میں اس خراج کی رقم کی ادائی کا ذمہ لیا جو راجپوتانہ کی ریاستوں سے اس کو ملا کرتی تھی۔ چونکہ سندھیا ان ریاستوں پر سے اپنے سیاسی حقوق سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو رہا تھا اس لیے لارڈ ہیسٹنگز نے اس وقت کے سیاسی حالات کے مدنظر اس کے حق خراج کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ اس کی وصولیابی کی ذمہ داری انگریزی حکومت نے اپنے ہاتھ لے لی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے ان ریاستوں کے ساتھ برطانوی حکومت کے سیاسی تعلقات کا جس نہج پر تعین کیا اب تک کم و بیش ان تعلقات کی نوعیت وہی چلی آ رہی ہے جو اس کے عہد میں تھی۔ برطانوی اقتدار اب راس کماری سے ستلج کے کنارہ تک قائم ہو گیا۔

ولزلی کے زمانے میں کمپنی کی قوت ملک کی دوسری سیاسی طاقتوں کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن لارڈ ہیسٹنگز نے دیسی والیان ملک سے

۱۔ Private Journal of Marquis of Hastings, Vol. I, p. 54.

جو معاہدے کئے ان میں کمپنی کی بالادستی صراحت کے ساتھ مذکور تھی۔ ولزلی کے زمانے کے معاہدوں میں جو بعض ایسی دفعات تھیں جن سے والیان ملک کے حقوق اقتدار متاثر ہوتے تھے ان کی پابندی پر کمپنی نے اصرار نہیں کیا۔ چنانچہ عہد معاونت کی رو سے والیان ریاست کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ دوسری ریاستوں سے بغیر کسی کی حکومت کے استصواب کے سیاسی تعلقات قائم کریں۔ لیکن پیشوا معاہدہ کرلنے کے بعد بعض دوسرے مرہٹہ درباروں کو اپنے وکیل بھیجتا تھا اور ان کے وکیلوں کو اپنے دربار میں باریاب کرتا تھا۔ جوں جوں کمپنی کی سیاسی قوت ملک میں مستحکم ہوتی گئی اس کے ساتھ ساتھ کمپنی ان دفعات کی پابندی پر اڑنے لگی جن سے معاہدہ کرنے والی ریاستوں کے حقوق مقتدرانہ متاثر ہوتے تھے۔ سیاسی حالات کے بدلنے کے ساتھ معاہدوں کی توجیہ میں بھی فرق پیدا کیا جانے لگا۔ چنانچہ لارڈ ہیسٹنگز نے سندھیا اور ہلکر کو صاف لکھ دیا تھا کہ بارلو کے زمانے میں ان سے جو معاہدے ہوئے ہیں جن کی رو سے کمپنی کی حکومت راجپوتانہ کے والیان ریاست سے سیاسی تعلقات نہیں قایم کرسکتی تھی اب منسوخ تصور ہونے چاہئیں، اس واسطے کہ اب انگریزی حکومت کی مصلحتوں کا یہ اقتضا ہے کہ وہ ان سے سیاسی تعلقات قایم کرے۔ غرض کہ لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں دیسی والیان ملک کو اندرونی نظم ونسق کے جو اختیارات دیئے گئے وہ انگریزی حکومت نے اپنی مرضی سے دیئے تھے، اس شرط پر کہ وہ کمپنی کی بالادستی کو تسلیم کریں۔ آئندہ سے والیان ریاست اپنے حقوق کا ماخذ اور منبع قوت بالادست کو سمجھنے لگے اور انگریزی اقتدار نے ایک امر تسلیم شدہ کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاہدوں کی اہمیت اور آہستہ آہستہ قوت بالادست اور دیسی ریاستوں کے باہمی تعلقات کا تعین عمل درآمد اور رواجوں پر مبنی قرار پایا۔ لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں دیسی

ریاستوں کے مسئلہ نے فوجی نوعیت کے بجائے خانگی۔ سیاسی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ نوعیت اس وقت سے آج تک برقرار ہے۔

حکومت ہند اور سرکار نظام

دسمبر ۱۸۰۸ء میں میر عالم کے انتقال پر منیر الملک کو نواب سکندر جاہ نے مدار المہام مقرر کیا تو لارڈ منٹو گورنر جنرل ہند نے اس شرط پر ان کی مدار المہامی قبول کی کہ وہ نظم ونسق کے تمام اختیارات راجا چندو لال[1] کے سپرد کر دیں جس نے انگریزی حکومت کا خاص اعتبار حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت سے راجا چندو لال نے دولت آصفیہ کے در وبست میں پورا دخل حاصل کر لیا۔ جب نواب سکندر جاہ نے راجا چندو لال کو اس کی فضول خرچی اور بد انتظامی کی وجہ سے علیحدہ کرنے کا خیال کیا تو گورنر جنرل نے صاف کہہ دیا کہ اس کی علیحدگی سے دونوں حکومتوں کے تعلقات میں فرق آجائے گا۔ اور اگر سرکار نظام کے معاملوں کا انجام دینا کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا گیا جس پر انگریزی حکومت بھروسا نہیں کر سکتی تو ممکن ہے کہ انگریزی حکومت کے لئے ناگزیر ہو جائے کہ وہ اپنے مفاد کی نگرانی کیلئے کوئی دوسرا طریق کار اختیار کرے بجائے اس طریق کار کے جواب تک کافی خیال کیا گیا تھا۔ جس زمانے میں پنڈاری اور مرہٹے وسط ہند میں اُدھم مچا رہے تھے تو سر ہنری رسل ریزیڈنٹ حیدرآباد نے دیکھا کہ امانتی فوج سے ممالک محروسہ سرکار عالی کی سرحدوں کی حفاظت ممکن نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ فوج کی نئی تنظیم کی جائے۔ لیکن اس تنظیم کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت محسوس کر رہی تھی کہ بہت جلد اس کو مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے زبردست فوج درکار ہوگی۔ لارڈ ہیسٹنگز کا خیال تھا کہ اس فوج کو جو حیدرآباد میں رہے گی اور جس کے خرچ کا بار سرکار نظام پر ہوگا انگریزی مفاد کے لئے

---

[1] Kays, Life of Metcalf, Vol. II, p. 7.

[2] Memoirs and Correspondence of General Fraser, p. 358

سہولت کے ساتھ استعمال کیا جا سکے گا اور انگریزی حکومت اس کے ذریعے سے بہت کچھ خرچ سے بچ جائے گی۔ اس کے خیال میں یہ بڑی بھاری غلطی ہوگی اگر معدلت کے اصول کی نظری بحث کی خاطر انگریز اپنے مفاد کو قربان کردیں۔ اپنی ایک اور تحریر میں لارڈ ہیسٹنگز نے لکھا ہے کہ "یہ امر واقعہ ہے کہ اس فوج پر ہمارا اتنا بوا اس حکمران کے مقابلے میں زیادہ ہے جو ان کے اخراجات کی پابجائی کرتا ہے[1]"۔ چونکہ اعانتی فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی اس لئے اس میں بے چینی اور شورش کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ رسل نے فوج کی جدید تنظیم کی جو رسل بریگیڈ کے نام سے موسوم ہے۔ شمالی سرکاروں کی نو لاکھ روپیے سالانہ پیشکش کی رقم سے ریزیڈنٹ نے سرکار نظام سے یہ اختیار حاصل کرلیا کہ اس میں سے پہلے فوج کی تنخواہ کی ادائی کی جائے۔ یہی رسل بریگیڈ بعد میں حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ لفٹننٹ ہیر اس کا کمانڈر مقرر ہوا جس نے اس کی کارکردگی میں وہی معیار قائم کردیا جو برطانوی ہند کی فوج کا تھا۔ اس کنٹنجنٹ کا اچھا خاصہ حصہ اورنگ آباد میں رہتا تھا جو جغرافی لحاظ سے مرہٹوں کی سرحد سے قریب ہونے کے باعث اہم تھا۔ پنڈاریوں کے گروہ اکثر یہاں تک لوٹ مار کرتے ہوئے چکر لگاتے تھے۔ دو ہزار فوج حیدرآباد میں توپ کے سانچہ پر رہتی تھی تاکہ اگر ریاست کے کسی حصے میں بغاوت ہو تو اس کو فوراً یہاں سے بھیجا جا سکے۔ ۱۸۱۷ء میں جنگ مرہٹہ شروع ہوئی تو حسب معاہدہ سرکار نظام نے اپنی فوج کمپنی کی حکومت کی مدد کے لیے بھیجی۔ مرہٹوں کی جنگ کے بعد ۱۸۲۲ء میں سرچارلس مٹکاف نے سرکار نظام سے معاہدہ کیا جس کی رو سے شمال و مغربی ضلعے جو اعلیٰ میں سرکار نظام کے تھے اور جن پر پیشوا اور بھونسلا قابض ہوگئے تھے حکومت سرکار عالی کو واپس کردئے گئے۔ پیشوا کو سرکار نظام سے چوتھ وصول کرنے کا جو حق حاصل تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اس واسطے کہ خود پیشوائی کا ہمیشہ

[1] Hyderabad Papers, p. 9

کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

انگریزی ریزیڈنٹ سر ہنری رسل نے گورنر جنرل سے مشورے کے بعد جو جدید فوجی تنظیم کی اس کے اخراجات کی پابجائی کے ضمن میں اس کی بھی ضرورت تھی کہ سپاہ کو پابندی سے وقت پر تنخواہ ملا کرے۔ چنانچہ اس بناء پر ریزیڈنٹ نے ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ خاص طور پر مالگزاری وصول کرنے کا جو طریقہ رائج تھا اس پر اس نے اپنی نگرانی قائم کر لی۔ رسل بریگیڈ کے اخراجات ادا کرنے کے لئے حکومت سرکار عالی کو قرضدار ہو جانا پڑا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں ایک انگریزی ساہوکارے کی کمپنی پامر اینڈ کمپنی کے نام سے قائم ہوئی اس کے قیام میں راجا چندو لال کا بھی ہاتھ تھا اور بعض دیسی ساہوکاروں نے بھی جن میں بنکا داس سب سے بڑا سرمایہ دار تھا اس میں اپنا سرمایہ لگایا تھا۔ لیکن زیادہ تر سرمایہ انگریز سرمایہ داروں کا تھا۔ اس کمپنی کا مقصد یہ تھا کہ بنک کاری اور لین دین کے علاوہ تجارتی اغراض کے لئے دکن کے مادی وسیلوں سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ کمپنی برار کی روئی اور دریائے گوداوری کے کنارے کے جنگلوں کی لکڑی کی تجارت بھی کرتی تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز کا ایک قریبی عزیز سر ولیم رمبولڈ نامی اس ساہوکارے کے کاروبار میں شریک ہو گیا۔ فوج کے اخراجات کے لئے جب روپیے کی ضرورت ہوتی تو راجا چندو لال بلا تکلف پامر اینڈ کمپنی سے ۲۴ فی صدی سود پر قرض لے لیتے۔ قرض کا یہ سلسلہ اسی طرح سے کئی سال تک چلتا رہا۔ حالانکہ ۱۷۹۷ء کے قانون منظورہ پارلیمنٹ کی رو سے کسی یورپین کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی والی ریاست سے بغیر گورنر جنرل کی خاص اجازت کے روپیے پیسے کا لین دین کر سکے۔ پامر اینڈ کمپنی کو لارڈ ہیسٹنگز نے سر ہنری رسل ریزیڈنٹ حیدرآباد کی سفارش پر کاروبار کرنے اور سرکار نظام سے لین دین کی بطور خاص اجازت دے دی تھی۔ لیکن یہ اجازت اس شرط پر دی گئی تھی کہ سرکار نظام اگر پامر اینڈ کمپنی سے قرض لے گی تو اس کی ادائی کی ذمہ داری برطانوی

حکومت پر نہ ہوگی[1] پامر اینڈ کمپنی پابندی سے کنٹنجنٹ کی تنخواہ کی ادائی کرتی تھی جس کی تعداد سات ہزار تھی اور راجا چندو لال کو حکومت کے لئے بھی جب کبھی قرضے کی ضرورت ہوتی تو پامر اینڈ کمپنی قرض دے دیا کرتی تھی اس قرض کی ادائی کبھی نقد کی شکل میں جو مالگزاری سے وصول ہوتا اور کبھی زمینیں سپرد کر کے ہوا کرتی تھی۔ لیکن پوری ادائی کبھی نہیں ہوتی تھی اور قرض کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہ جاتا تھا۔ چنانچہ ہوتے ہوتے کمپنی کا قرض جمع ہوکر ساٹھ لاکھ روپے تک پہنچ گیا۔ نہ صرف یہ کہ سرکار عالی پامر اینڈ کمپنی کے قرض سے زیر بار ہوگئی بلکہ کمپنی کا سیاسی اثر ریاست کے معاملات میں بڑھنے لگا۔ جب ان حالات کی اطلاع انگلستان میں مجلس نظماء کے ارکان کو ہوئی تو انھوں نے کمپنی کے قیام اور اس کے طریق کار پر سخت اعتراض کئے۔ چونکہ لارڈ ہیسٹنگز کا عزیز سر ولیم رمبولڈ بھی کمپنی کے کاروبار میں شریک تھا اس لئے گورنر جنرل کی ذات پر بھی پارلیمنٹ میں اعتراضوں کی بوچھار ہوئی اور اس سے اس ضمن میں جواب طلب کیا گیا۔ مجلس نظماء نے گورنر جنرل کو ہدایتیں بھیج دیں کہ پامر اینڈ کمپنی کے توسط سے انگریزی فوج کی تنخواہوں کی ادائی کا طریقہ فوراً بند کر دینا چاہئے۔ یکم دسمبر ۱۸۲۰ء کو سر ہنری رسل کی جگہ سر چارلس مٹکاف حیدرآباد کا ریزیڈنٹ ہوکر آیا۔ وہ بڑا تجربہ کار اور ہوشمند شخص تھا۔ حالات کا جائزہ لینے پر اس نے محسوس کیا کہ مالگزاری کی وصولیابی میں پامر اینڈ کمپنی کو جو عمل دخل حاصل ہوگیا ہے اس سے بد انتظامی بڑھنے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اس کو یہ اندیشہ تھا کہ عام انتظامی ابتری سے ریاست حیدرآباد بہت جلد بالکل دیوالیہ ہو جائے گی۔ ملک کی مالی حالت پہلے ہی سے خراب تھی۔ کنٹنجنٹ کے اخراجات کے بار سے روز بروز حالت اور بھی زیادہ بدتر ہورہی تھی۔ اس کو یہ معلوم کر کے تعجب اور رنج ہوا کہ خود ریزیڈنسی کے عہدہ داروں کا دامن پامر اینڈ کمپنی کے لین دین کی آلائش

---

[1] Letter of Governor-General to the Resident, 13th Sept. 1822 (Hyderabad Papers, p. 136)

سے پاک نہیں ہے۔ وہ اصولی آدمی تھا۔ اس نے اس کی مطلق پروا نہیں کی کہ اگر وہ پامر اینڈ کمپنی کا زور توڑنے کی کوشش کرے گا تو یہ گورنر جنرل کو ناگوار ہوگا۔ چنانچہ اس نے مالگزاری کی وصولیابی پامر اینڈ کمپنی کے ہاتھ سے نکال لی اور اس کام کے لئے بعض انگریز عہدہ دار مقرر کردیے جو ہندوستانی مستاجروں کے عملی تعاون سے اپنے فرائض ادا کرتے تھے[1]۔

پامر اینڈ کمپنی کے متعلق سر چارلس مٹکاف نے گورنر جنرل کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے جو واجبات ہیں ان کی ادائی کلکتہ میں ۶ فیصدی شرح سود پر قرض لے کر کی جائے اور پامر اینڈ کمپنی کو چونکہ آئندہ اپنا کاروبار بند کرنا پڑے گا اس لیے چودہ لاکھ روپیے زائد نفع اور ہرجانے کے اس کو ادا کردیے جائیں۔ پامر اینڈ کمپنی کے سرکار نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ سر ولیم رمبولڈ نے اپنا سارا اثر اور رسوخ استعمال کرکے گورنر جنرل کو اپنے موافق کرلیا اور اس کو یہ باور کرادیا کہ سر چارلس مٹکاف نے یہ تمام معاملہ اس لئے اٹھایا ہے کہ وہ اس کے خلاف ذاتی مخالفت رکھتا ہے۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے پہلے تو مٹکاف کے مراسلوں کو ڈیڑھ سال تک کسی کارروائی کے بغیر ڈالے رکھا۔ اس نے مٹکاف کو لکھا کہ سرکار نظام کے اندرونی انتظام میں ہمیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ چونکہ پامر اینڈ کمپنی کا معاملہ اندرونی انتظام کی نوعیت رکھتا ہے اس واسطے ہمیں اس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے۔ لیکن مٹکاف نے گورنر جنرل کو یہ توجہ دلائی کہ پامر اینڈ کمپنی کا معاملہ اب محض ایک تجارتی کمپنی کا معاملہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے انگریزی حکومت بدنام ہورہی ہے پھر خود گورنر جنرل کے طرز عمل میں تضاد پایا جاتا تھا۔ اس نے رسل کو جبکہ وہ مٹکاف سے پہلے حیدرآباد کا ریزیڈنٹ تھا ہدایت کی تھی کہ وہ اندرونی انتظام میں سرکار نظام کو مشورہ دے اور اپنے اثر کو استعمال کرے[2]۔ جب انگلستان میں اس معاملے کی نسبت چرچا

[1] Kaye, Life of Metcalf, Vol. II, p. 30-32.

[2] Metcalf to Russell, 22nd January, 1820, No. 14, Bengal.

ہونے لگا تو گورنر جنرل نے مٹکاف کو لکھا کہ راجا چندو لال نے گزشتہ زمانے میں انگریزی حکومت کی جو خدمتیں انجام دی ہیں انکو بھلایا نہیں جا سکتا۔ بھلا اب انگریزی حکومت کے لئے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ راجا چندو لال کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔ لیکن جب مجلس نظماء نے اس معاملے کے ضمن میں گورنر جنرل سے جواب طلب کیا تو اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت انگریزی حکومت اور پامر اینڈ کمپنی کا سرکار نظام پر قرض ملاکر ایک کروڑ سات لاکھ تک پہنچ چکا تھا۔ حکومت ہند نے یہ سب قرض اس شرط پر ادا کردیا کہ شمالی سرکار کی سالانہ پیشکش پر سرکار نظام کو آئندہ کوئی حق نہیں رہے گا۔ پامر اینڈ کمپنی کا کاروبار بہت جلد بیٹھ گیا اور وہ دیوالیہ ہوگئی۔

سر چارلس مٹکاف نے ریاست حیدر آباد کی مالی حالت درست کرنے کے سلسلے میں کنٹنجنٹ کے اخراجات کی زیادتی پر بھی اعتراض کیا اور بتایا کہ اس کا وجود دولت آصفیہ کے لیے بے سود ہے۔ اس سے انگریزی حکومت کو کتنا ہی فائدہ کیوں نہ ہو لیکن دولت آصفیہ کو کوئی فائدہ نہیں جو اس کے اخراجات کا بار اٹھانے پر مجبور ہے[1]۔ کنٹنجنٹ کا قیام کسی معاہدے کے ذریعے وجود میں نہیں آیا بلکہ ریزیڈنٹ اور راجا چندو لال کے درمیان سمجھوتے کا نتیجہ ہے جسے انگریزی حکومت کی حمایت حاصل تھی اور جو خود اپنی حفاظت کے لئے انگریزی فوج کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ کنٹنجنٹ کے افسروں کو ان کی تنخواہ کے علاوہ الاؤنس بھی دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں ان الاونسوں کی مقدار ساڑھے تیرہ لاکھ روپیے تھی۔ معمولاً کنٹنجنٹ کی وجہ سے ۳۸ لاکھ روپیہ سالانہ سرکار عالی کو خرچ کرنا پڑتا تھا حالانکہ اعانتی فوج کے اخراجات کے ضمن میں سرکار نظام میسور کی آخری جنگ کے بعد ۱۸۰۰ء کے معاہدے کے بموجب انگریزی حکومت کو علاقے سپرد کرچکی تھی۔

اندرونی انتظام اگرچہ لارڈ ہیسٹنگز کو اپنے عہد حکومت میں زبردست

[1] Memoirs and Correspondence of General Fraser, p. 74-76

فوجی مہموں کا انتظام کرنا پڑا اور توسیع مملکت کے منصوبے سوچنے پڑے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے اندرونی انتظام کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی۔ اس نے حکومت ہند کی مالی حالت کو باوجود ان چڑھائیوں کے جو گرکھوں، پنڈاریوں اور مرہٹوں کے خلاف کرنی پڑیں کبھی خراب نہ ہونے دیا۔ حکومت ہند کی مالی ساکھ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت کے تمسکات جن کی قیمت لارڈ ہیسٹنگز کے اپنے عہدہ گورنر جنرلی کا جائزہ لیتے وقت بارہ روپیے سیکڑے کا بٹہ کھا رہی تھیں اس کی ہندوستان سے روانگی کے وقت چودہ روپیے بڑھوتری پر فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کے عہد میں حکومت ہند کی آمدنی میں چھ کروڑ روپیے سالانہ کا اضافہ ہوا اور مستقل مصارف تقریباً چار کروڑ بڑھے۔ اس طرح دو کروڑ سالانہ کی بچت ہونے لگی۔ پیشوائی کے خاتمے کے بعد احاطۂ بمبئی میں نہایت زرخیز زمینیں شامل کی گئیں۔ مدراس میں سر تھامس منرو نے رعیت واری طریقہ مالگزاری کے وصول کا رائج کیا۔ لارڈ ہیسٹنگز دوامی بندوبست کی خوبیوں کا قائل نہ تھا لیکن بنگال بہار اور اڑیسہ میں یہ طریقہ ایسا ٹھوس بنیاد پر قائم تھا کہ اس میں ترمیم ممکن نہ تھی۔ اگرچہ وہاں بھی دوامی بندوبست کے مستقل انتظام کے ایسے قاعدے اور ضابطے نافذ کئے گئے جن کے بموجب کاشتکاروں کو موروثی حق حاصل ہو گیا۔ ان قاعدوں کی وجہ سے زمیندار اُن موروثی کاشت کاروں کو اپنی زیر کاشت زمین سے بے دخل نہیں کر سکتا تھا جو پابندی سے لگان ادا کرتے ہوں۔ موروثی زمینوں پر لگان میں اضافہ صرف خاص حالات میں ممکن تھا۔ ان قاعدوں سے دوامی بندوبست کی خرابیوں کو تھوڑا بہت کم کرنے کی کوشش کی گئی۔

لیکن ان سے اس انتظام میں کوئی بنیادی تبدیلی ممکن نہ تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں اس بات پر نظم و نسق کے بڑے ماہروں کو شبہ ہونے لگا تھا کہ دوامی بندوبست تمام ہندوستان کے لئے مالگذاری وصول کرنے کا

بہترین طریقہ ہے۔ بورڈ آف کنٹرول نے بھی حکومت ہند کو ہدایت کی تھی کہ دوامی بندوبست کے طریقے کو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں نافذ نہ کیا جائے بلکہ ہر جگہ کے مقامی حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہاں کے لئے موزوں طریقہ کا تجویز کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں سر تھامس منرو نے مدراس میں رعیت واری طریقہ رائج کیا۔ اس طریقہ میں یہ ہوتا تھا کہ ہر کھیت کی مقررہ شرح کے مطابق تشخیص کی جاتی تھی۔ ہر کھیت کا قابض براہ راست حکومت کو تشخیص شدہ رقم ادا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ جب تک وہ مقررہ رقم حکومت کو ادا کرتا رہے اس وقت تک اس کو حکومت بھی بے دخل نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں اس کو خود یہ اختیار تھا کہ اپنے زیر تصرف علاقے میں سے کسی علاقے سے دستبردار ہو جائے۔ اگر وہ اس زمین کو زرخیز بنانے کے لئے اپنا سرمایہ لگاتا تاکہ کھیت کی پیداوار میں اضافہ ہو تو ایسی صورت میں حکومت اپنی مقررہ رقم میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ منرو نے کارنوالس کے خیالات کی تردید کی اور بتایا کہ تجربہ نے انھیں مفید نہیں ثابت کیا اس لئے ان پر ملک کے دوسرے حصوں میں عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رعیت واری طریقے میں یہ سہولت تھی کہ رعایا کا حکومت سے براہ راست تعلق قایم ہو جاتا تھا اور زمیندار کے درمیانی وسیلہ کی حاجت نہیں رہتی تھی۔ جس طرح منرو نے مدراس میں رعیت واری طریقہ رائج کیا اسی طرح ماونٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے بمبئی کے صوبے میں اس طریقے کو نافذ کیا جس سے رعایا کو بہت فائدہ ہوا۔

لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں ہندوستانی منصفوں اور صدر امینوں کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔ کارنوالس نے کلکٹر اور مجسٹریٹ کے اختیارات الگ الگ کر دئے تھے تاکہ عدالتی انتظام اور مالگزاری کا انتظام گڈمڈ نہ ہو لیکن مارکوئس آف ہیسٹنگز کے عہد میں کلکٹر کو عدالتی اختیارات پھر حاصل ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کلکٹر کی اہمیت بڑھنے لگی۔ ۱۷۹۱ء میں اس کے اختیارات جو گھٹا دئے گئے تھے اور بعض صورتوں میں چھین لئے گئے تھے وہ پھر دوبارہ اس کو حاصل ہو گئے۔ گاؤں میں پنچایت اور چوکیداری کے طریقے کو رائج کیا گیا۔ ضلع کے ججوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ پٹواری اور قانون گو کے عہدے دوبارہ

قایم کئے گئے تاکہ رعایا سے مالگزاری وصول کرنے میں سہولت ہو۔ آگرہ کے صوبے میں نئے اصول پر بندوبست کیا گیا۔ جس میں اگرچہ زمیندار کا وسیلہ باقی رہا لیکن یہ بندوبست دوامی نہیں تھا بلکہ اس میں آئندہ تبدیلی ممکن تھی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز کے تحت سرجان مالکم سر تھامس منرو سر تھامس مٹکاف اور ماونٹ اسٹورٹ الفنسٹن کے سے قابل عہدے دار موجود تھے جنھوں نے برطانوی انتظام میں بہتری پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز میں اگرچہ وارن ہیسٹنگز یا لارڈ ولزلی کی سی جدت نہ تھی لیکن اس کی اعلیٰ درجہ کی فوجی اور انتظامی قابلیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ انگریزوں میں سب سے زیادہ اولوالعزم اور کامیاب گورنر جنرلوں میں بجا طور پر شمار کیا جاتا تھا۔ وہ نہایت محنتی تھا اور عام طور پر روزانہ آٹھ گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ نو سال تک برابر اس نے اسی طرح کام کیا۔ پنڈاریوں اور مرہٹوں کے خلاف اس نے جس وسیع پیمانے پر فوج کشی کا خاکہ تیار کیا اس کی مثال برطانوی ہند کی فوجی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ اس نے نہ صرف منصوبہ تیار کیا بلکہ اس کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ بھی پہنایا۔ اس کے زمانے میں پہاڑی آرام گاہیں نہ تھیں جیسی کہ بعد میں بنائی گئیں جہاں موسم گرما گزارنے کے لئے گورنر جنرل اور دوسرے اعلیٰ عہدہ دار جایا کرتے ہیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے شہر کلکتہ کو خوشنما بنانے کی طرف خاصی توجہ کی۔ سڑکیں بہ جوڑی کی گئیں۔ بیچ بیچ میں چوراہے اور فوارے بنائے گئے اور شہر کی صفائی اور رونق بڑھانے کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے انگریزی اخباروں کو حکومت پر رائے زنی کرنے کی اجازت دی جو یقیناً ایک لبرل قسم کا اقدام تھا۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز نے پامر اینڈ کمپنی کے معاملہ کی وجہ سے استعفاء دے دیا اور انگلستان روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس مالکان (کورٹ آف پروپرائٹرز) میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مارکوئس آف ہیسٹنگز کی خدمتوں کا اعتراف کرنے کے ضمن میں اس کے لئے زر نقد کی صورت میں بھی کچھ رقم منظور کرنی چاہئے۔ اس تجویز کے پیش ہونے پر

مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ آخر مجلس انتظامیہ کے صدر مسٹر رسل کی یہ ترمیم منظور ہوئی کہ "اگرچہ گورنر جنرل کی نیت کو کسی بد دیانتی سے منسوب کرنے کے وجوہ موجود نہیں ہیں۔ مگر مجلس مالکان (کورٹ آف پروپرائٹرز) ان تمام مراسلت سے اتفاق رائے ظاہر کرتی ہے جو مجلس نظماء سے حیدر آبادی لین دین کے معاملہ کے متعلق لارڈ ہیسٹنگز کو بھیجے تھے۔ ان مراسلوں میں لارڈ ہیسٹنگز پر صاف صاف الزام لگایا گیا تھا" کہ اس نے پامر اینڈ کمپنی کے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے کمپنی کے اثر و اقتدار کو استعمال کیا جو ایسے شخص کے لئے جو گورنر جنرل کے اعلیٰ عہدہ پر کمپنی کی طرف سے مامور ہو زیب نہیں دیتا۔ غرضکہ بجائے انعام ملنے کے لارڈ موصوف کو لعنت کا سزاوار قرار دیا گیا۔ بورڈ آف کنٹرول نے لارڈ ہیسٹنگز کی قابلیت اور تندہی کا اعتراف کیا۔ حکومت انگلستان نے اس کو سنہ ۱۸۲۴ء میں مالٹا کا گورنر بنا کر بھیجا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد نیپلز کے سمندر کے قریب اس کا انتقال ہو گیا۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں حکومت وقت نے اس کے خاندان کو بیس ہزار پونڈ کا عطیہ دیا تاکہ اس لعنت و ملامت کی تھوڑی بہت تلافی ہو سکے جو اس کے خلاف ہوئی تھی۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز کے استعفے کے بعد مجلس نگران نے جارج کیننگ کو اس کا جانشین نامزد کیا لیکن وہ انگلستان سے روانہ ہونے والا ہی تھا کہ لارڈ لنڈن ڈیری کا انتقال ہو گیا اور اسکو وزارت خارجہ کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ نئے گورنر جنرل کے ہندوستان پہنچنے تک مسٹر ایڈم نے جو گورنر جنرل کی کونسل کے سینیر رکن تھے گورنر جنرل کے فرائض انجام دئے۔ اس نے پریس کی آزادی پر پابندیاں لگائیں تاکہ حکومت پر نکتہ چینی نہ کی جا سکے۔ لارڈ ایمہرسٹ یکم اگست سنہ ۱۸۲۳ء کو بہ حیثیت گورنر جنرل ہندوستان پہنچ گیا۔ وہ دربار چین میں انگریزی سفیر کی خدمت انجام دے چکا تھا اور مشرقی سیاست کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا۔ لارڈ امہرسٹ نے اس انتظام کی ذمہ داری سنبھالی ہی تھی کہ اسے برما کی سیاست میں الجھنا اور اعلان جنگ کرنا پڑا

پہلی جنگ برما

النگ پایا نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں برما میں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی جس کا صدر مقام آوا تھا۔ بنگال اور برما کے درمیان جو قبائلی علاقے تھے ان کی سرحد کے متعلق حکومت برما میں کچھ عرصے سے اختلاف چلا آتا تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز کے زمانے میں حکومت برما نے مطالبہ کیا کہ ڈھاکہ، مرشد آباد اور چٹاگانگ برما کے حکمران کو واپس دینا چاہئے۔ یہ دعویٰ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ گزشتہ زمانے میں اراکان کے حکمرانوں نے بنگال کے بعض مشرقی علاقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ لیکن چونکہ مارکوئس آف ہیسٹنگز دوسرے اہم مسائل کے حل کرنے میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ وہ برما کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ دونوں حکومتوں میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کاچھار کی ریاست کو انگریزی حکومت نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ حکومت برما کو یہ ناگوار تھا۔ چنانچہ حکومت برما کی فوجوں نے کاچھار اور اس کے علاوہ منی پور کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ برمی فوجوں کا افسر اعلیٰ مہابندولہ بڑا حوصلہ مند شخص تھا۔ پے درپے کامیابیوں سے اس کا اور اس کی فوج کا گھمنڈ بڑھ گیا تھا۔ اس نے چٹاگانگ کے مشرقی ساحل پر جزیرہ شاہ پوری پر بھی قبضہ کر لیا جو انگریزوں کے تحت تھا۔ اس جزیرہ میں جو انگریزی چوکیاں قائم تھیں وہ برطرف کر دی گئیں اور انگریزی جھنڈے کی جگہ حکومت برما کا جھنڈا بلند کر دیا گیا۔ لارڈ ایمہرسٹ نے یہ خبر سن کر حکومت برما کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انگریزی فوج نے برمی فوج کو شکست دے کر جزیرہ شاہ پوری پر قبضہ کر لیا۔ ادھر مہابندولہ نے چٹاگانگ کے قریب انگریزی سرحد پر حملہ کر دیا۔ مشرقی بنگال میں تہلکہ مچ گیا۔ لیکن مہابندولہ اس جانب رخ نہ کر سکا اس واسطے کہ اسے آوا طلب کر لیا گیا۔

برمی لوگوں کو کبھی اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ انگریزی فوج سمندر کے راستہ سے رنگون پر اتنے جلد پہنچ جائے گی۔ انگریزی فوجوں نے سر آرچی بلڈ کیمپ بل کی سرکردگی میں بے مزاحمت کے رنگون پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چونکہ

بارش کا موسم شروع ہو گیا تھا اس لئے انگریزی فوج کو چھ مہینے رنگون میں ٹھہرنا پڑا۔ بارش کی کثرت کا یہ حال تھا کہ ایسی حالت میں انگریزی فوج کے لئے اندرون ملک بڑھنا ممکن نہ تھا۔ اگست ۱۸۲۴ء میں جب موسم ٹھیک ہوا تو انگریزی فوج نے تناسرم کے ساحلی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ مہا بندولہ ۶۰ ہزار کا لشکر لے کر مقابلے کے لئے بڑھا۔ گھنے جنگلوں اور دلدل کی وجہ سے انگریزوں کو جو اس ملک سے ناواقف تھے بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اس میں تشبہ نہیں کہ برمی فوج نیم مسلح تھی اور قواعد دانی سے بھی ناواقف تھی لیکن وہ بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے جنگل میں مچان بنا لیتے تھے۔ برطانوی فوج کی رسد انھوں نے بالکل بند کر دی۔ مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے انگریزی فوج میں بیماری اور موت کا بازار گرم ہو گیا آب و ہوا کی خرابی اور غذا کی کمی سے سر آرچی بلڈ کیمپ بل کی گیارہ ہزار فوج میں سے صرف تین ہزار ایسے بچے جو کام کے قابل تھے۔ اس اثناء میں کلکتہ سے کمک پہنچ گئی اور انگریزوں نے پیگو پر قبضہ کر لیا۔ دونابیو کے مقام پر سر کیمپ بل نے مہا بندولہ کو شکست دی اور وہ مارا گیا۔ اس خبر سے برمی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ انگریزی فوج نے آگے بڑھ کر پروم پر بھی قبضہ کر لیا۔

لارڈ ایمہرسٹ نے بڑی عقلمندی کی کہ برمی فوج کا دھیان بٹانے کے لئے اس نے اراکان کی طرف خشکی کے راستے سے جنرل رچرڈس کی سرکردگی میں لشکر روانہ کر دئے تھے۔ ایک لشکر کاچھار اور منی پور کی طرف سے بڑھا اور دوسرا سیدھا اراکان کی طرف روانہ ہوا۔ آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے ان لشکروں کے بہت سے آدمی ضائع ہو گئے

اگرچہ برمی فوجوں کی اس لشکر کشی کی وجہ سے دھیان کچھ ضرور بٹا لیکن انگریز کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل کر سکے۔ سر آرچی بلڈ کیمپ بل کو دونابیو کی کامیابی کے بعد مزید کمک اور سامان رسد پہنچ گیا۔ چنانچہ انگریزی فوج پروم کے بعد مقام آوا کی طرف بڑھی۔ لارڈ ایمہرسٹ

نے سر آرچی بالڈ کیمپ بل کو ہدایت کر دی تھی کہ برمیوں میں صلح کا میلان پایا جائے تو اس کا خیر مقدم کرنا۔ لیکن شاہ برما کو معلوم ہوا کہ وہ جو برابری کا معاہدہ کرنا چاہتا ہے وہ ممکن نہیں تو اس نے انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کی آخری کوشش کی۔ چالیس ہزار کی ایک فوج نے پروم پر چڑھائی کر دی مگر اس فوج کو انگریزوں نے شکست فاش دی۔ انگریزی فوجیں جب شاہ برما کے صدر مقام سے چالیس میل مقام یندبو پر جا پہنچیں تو برمیوں نے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ ۲۴ر فروری ۱۸۲۶ء صلح نامے پر دستخط ہو گئے۔ اس کی رو سے طے ہوا کہ آئندہ سے شاہ برما منی پور، کاچھار اور آسام کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ اراکان اور تناسرم کے ساحلی صوبے انگریزوں کو حوالے کئے جائیں گے۔ تمام قیدیوں کو دونوں طرف سے رہا کیا جائے گا۔ شاہ برما ایک کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرے گا۔ دربار آوا میں انگریزی ریزیڈنٹ رہا کرے گا۔ غرضکہ ان شرطوں سے انگریزوں نے برما کے ساحلی علاقے پر اپنے قدم جما لئے۔ رنگون شاہ برما کو واپس کر دیا گیا۔ لیکن ساحلی علاقے پر قبضہ حاصل ہو جانے سے انگریزی تجارت کے لئے دروازہ کھل گیا۔

بارکپور کی بغاوت

بنگال میں بارکپور کے مقام پر جو ہندوستانی فوج تھی اس نے برما کی جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس لئے کہ اسے اپنی تنخواہ کی کمی کی شکایت کے ساتھ یہ بھی شکایت تھی کہ کسی دوسری جگہ جانے میں باربرداری کا خرچ سپاہیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو تنخواہ کی کمی دوسرے باربرداری کا خرچ نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہی کو بہت کم بچتا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے افسر اعلیٰ کے پاس مودبانہ محضر پیش کیا اس میں اپنی دشواریوں کی نسبت توجہ دلائی۔ افسر اعلیٰ نے بجائے اس کے کہ اس معقول مطالبے پر غور کرتا اسکو سرکشی پر محمول کیا۔ محضر روانہ کرنے والوں کو اطلاع دے دی گئی کہ انھیں حکومت

سے کسی قسم کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ سپاہیوں میں بڑا جوش وخروش پیدا ہوگیا اور انھوں نے قسمیں کھائیں کہ چاہے کچھ ہوجائے وہ اپنے مطالبات منوا کر رہیں گے اور جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جائیں گے اس وقت تک برما کوچ نہیں کریں گے۔ کمانڈر ان چیف نے دو گورہ رجمنٹوں کے ذریعہ ہندوستانی سپاہیوں پر جبکہ وہ پریڈ کے لئے جمع تھے توپوں کے منہ کھول دئے۔ بہت سے حواس باختہ ہوکر بھاگے اور بہت سارے مارے گئے۔ سپاہیوں کے سرغنوں کو گرفتار کرکے پھانسی دے دی گئی ان سپاہیوں کے پاس اگرچہ کارتوس موجود تھے لیکن انھوں نے اپنی بندوقوں کو بھرا نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ مقابلہ کرنے کا نہیں تھا۔ بعد میں جو فوجی تحقیق کی گئی تحقیق کرنے والوں نے یہ رائے قایم کی کہ سپاہیوں کی ذہنیت ایسی باغیانہ ہوچکی تھی کہ اس وقت سوائے فوجی کارروائی کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ تحقیق کرنے والے فوجی تھے اس لئے وہ اپنے محکمہ کو کوئی الزام نہیں دینا چاہتے تھے۔ بلاشبہ لارڈ ایمہرسٹ پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ اس نے ہندوستانی سپاہیوں کے جائز مطالبوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا ورنہ ان کی شکایتیں اس قدر معمولی اور معقول تھیں کہ اگر معاملہ فہمی سے کام لیا جاتا تو خونریزی کی نوبت نہ آتی

بھرت پور

سنہ ۱۸۲۴ء میں جب بھرت پور کے راجا بلدیو سنگھ کی حالت خراب ہوئی تو اس نے دہلی کے انگریز ریزیڈنٹ سر اکٹر لونی کو بلاکر وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے کمسن بیٹے بلونت سنگھ کو راج گدی ملنی چاہئے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کا بھتیجا درجن سال گدی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی واسطے وہ انگریزی حکومت کو بیچ میں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کا اندیشہ درست نکلا۔ اس کے انتقال پر درجن سال نے فوج کو اپنے قابو میں لے کر کمسن بلونت سنگھ کو بھی نظر بند کرلیا۔ سر ڈیوڈ اکٹر لونی نے درجن سال کی اس پوری کارروائی کو ناجائز

قرار دیا۔ اگرچہ درجن سال نے اب تک بھی دعوے کیا تھا کہ وہ کمسن راجا کا ولی بن کر حکومت کا انتظام سنبھالنا چاہتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی نیت درست نہیں تھی۔ اکٹرلونی کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ نوجوان راجا کو قتل نہ کردے چنانچہ اس نے اعلان کردیا کہ درجن سال کی حرکت سراسر ناجائز ہے۔ اس کے ساتھ سولہ ہزار انگریزی فوج سو توپوں کے ساتھ بھرت پور کی طرف روانہ کردی گئی تاکہ حقدار کو اس کا حق دلوائے۔ لارڈ ایمہرسٹ کو اکٹرلونی کی یہ کارروائی ناگوار گذری اور اس نے اپنے خیالات اسلئے تحکمانہ لہجے میں ظاہر کئے جو آکٹرلونی کو سخت ناگوار گزرے۔ گورنر جنرل چاہتا تھا کہ جو فوج بھرت پور بھیجی گئی ہے وہ فوراً بلالی جائے لیکن آکٹرلونی اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے گورنر جنرل کو نہایت تلخ جواب دیا اور اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگیا۔ اس کو اپنی ذلت کا ایسا صدمہ ہوا کہ دو مہینے بعد وہ میرٹھ میں انتقال کرگیا۔

سر ڈیوڈ آکٹرلونی نے جب انگریزی فوج بھرت پور بھیجی تو درجن سال نے اعلان کردیا کہ وہ مدارالمہامی کے فرائض ادا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں لیکن جب لارڈ ایمہرسٹ کے حکم سے انگریزی فوج واپس بلالی گئی تو اس نے گدی پر اپنا دعوے قائم کیا اور اپنے ہم خیال امیروں اور فوجی افسروں کو آمادہ کرلیا کہ اس کی تائید کریں۔ چنانچہ بہت کافی فوج اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی۔ اس زمانے میں سر ڈیوڈ آکٹرلونی کی جگہ سر چارلس مٹکاف دہلی کا ریزیڈنٹ مقرر ہوا تھا اس نے کلکتہ جاکر گورنر جنرل کو بتایا کہ کمپنی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ محض غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے طوائف الملوکی کو دیکھے اور ملک کو اس قتل اور لوٹ مار کے بھوت کے حوالے کردے جس سے اس نے بڑی محنت سے نجات دلائی ہے۔ سر چارلس مٹکاف کا خیال تھا کہ اگر بھرت پور کو انگریزوں نے فتح کرلیا تو انھیں اہل ہند کی نظروں میں وہ عزت و احترام حاصل ہوجائے گا جسے وہ جنرل لیک کے زمانے میں ناکام رہ کر کھو چکے تھے

اور لوگوں کے دلوں پر جس کا نقش اب تک موجود تھا۔ لارڈ ایمہرسٹ نے مٹکاف کی تائید کی اور یہ طے ہوا کہ اگر فہمایش سے کام نہ چلے تو درجن سال کو راہ راست پر لانے کے لئے فوج کشی کی جائے۔

چنانچہ مٹکاف کے حکم سے بیس ہزار فوج اور سو قلعہ شکن توپیں بھرت پور روانہ کر دی گئیں۔ لارڈ کمبرمیر کمانڈر ان چیف نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں اپنا مستقر بھرت پور کے قلعے کے سامنے قایم کیا۔ کئی دن تک گولہ باری کی گئی آخر کار ایک بڑی زبردست سرنگ میں ساڑھے بارہ من بارود بھر کر آگ لگا دی گئی۔ ایسا زبردست دھماکہ ہوا کہ قلعہ کی فصیل اڑ گئی۔ درجن سال نے مقابلہ کیا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اب اس نے بچ کر نکل جانا چاہا لیکن گرفتار کر لیا گیا۔ اور بنارس بھیجکر پانچ سو روپیے ماہوار اس کا وظیفہ کر دیا گیا۔ وہ پچیس سال تک وظیفہ خوار کی حیثیت سے زندہ رہا۔ سر چارلس مٹکاف اور لارڈ کمبرمیر نے کمسن بلونت سنگھ کو گدی پر بٹھا دیا۔ لیکن قلعہ کی فتح کے بعد فاتحوں نے ریاست کے خزانے اور زر و جواہر پر قبضہ کر کے مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر لیا۔ لارڈ کمبرمیر کے حصہ میں چھ لاکھ کی رقم آئی۔ بھرت پور کی تسخیر سے کمپنی کا رعب سارے راجپوتانہ میں قایم ہو گیا۔

برما کی کامیابی کے صلہ میں لارڈ ایمہرسٹ کو ارل کے منصب عالی سے سرفراز کیا گیا۔ اگرچہ وہ ذہن اور سیرت کی صلاحیتوں کے مد نظر بلند خصوصیتیں نہیں رکھتا تھا لیکن چونکہ برما کی جنگ باوجود شروع کی ناکامیوں کے کئی سال بعد کامیابی کے ساتھ اس کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچی اس لئے مجلس نظما اور انگلستان کی حکومت وقت نے اس کو خطاب سے سرفراز کیا۔ اس کے عہد میں جو اندرونی انتظام کی ترقی ہوئی اس میں دراصل اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ مدراس میں سر تھامس منرو اور بمبئی میں مسٹر الفنسٹن کی کوششوں کی بدولت انتظامی اصلاحیں ہوئیں۔ جنگ برما کی وجہ سے حکومت ہند کی مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی اور اس پر دس کروڑ قرض کا اضافہ ہو گیا تھا۔ لارڈ ایمہرسٹ

فروری ۱۸۲۸ء میں انگلستان روانہ ہوگیا اور گورنر جنرل کی کونسل کے سینیر رکن مسٹر بیلی نے لارڈ ولیم بنٹنگ کے آنے تک حکومت ہند کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا۔

بارھواں باب

لارڈ ولیم بنٹنگ اور ملکی اصلاحیں

۱۸۰۶ء میں جب ویلور میں بغاوت ہوئی تو اس وقت لارڈ ولیم بنٹنگ احاطۂ مدراس کا گورنر تھا۔ مجلس نظماء نے اس کو اس لئے گورنری کے عہدہ سے ہٹا دیا کہ بے اس کے کمپنی کی حکومت پر رعایا کو بھروسا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس معزولی سے بنٹنگ کے احساسات کو بڑا دکھ ہوا اور اس نے مجلس نظماء کے سامنے اپیل بھی کی۔ چنانچہ مجلس نظماء نے اپنے فیصلہ کو حق بجانب بتایا لیکن ساتھ ہی بنٹنگ کی بے لوثی راست بازی اور خدمت خلق کے شوق کا اعتراف کرتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ مدراس کی گورنری سے معزولی اس کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں سمجھا جائے گا اور حکومت انگلستان ملک اور قوم کے نفع کی خاطر اس کو کسی دوسری موزوں خدمت پر مامور کر دے گی۔ چنانچہ اس کو اسپین اور اٹلی میں اہم فوجی خدمتیں سپرد کی گئیں جنھیں اس نے بڑی قابلیت اور محنت سے انجام دیا۔ بعد میں ۱۸۲۷ء میں اس نے لارڈ ایمہرسٹ کے عہد حکومت کے ختم ہونے پر ہندوستان کی گورنر جنرلی کا عہدہ قبول کر لیا اور جولائی ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچ گیا۔

میزانیہ کا توازن

لارڈ ولیم بنٹنگ لبرل خیالات کا شخص تھا۔ وہ جنگ

اور ملک گیری سے زیادہ انتظامی اصلاحات کو اہمیت دیتا تھا۔ اپنے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد سب سے پہلے اس نے حکومت ہند کی مالی حالت سدھارنے کی کوشش کی۔ جنگ برما کی وجہ سے حکومت ہند کا خزانہ دس کروڑ روپیے کے قرضے سے زیر بار تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز اور لارڈ ایمہرسٹ کے عہد حکومت میں انتظام کی توسیع کی وجہ سے بھی اخراجات بڑھ گئے تھے اور حکومت ہند کے میزانیہ میں ایک کروڑ سالانہ کا گھاٹا برابر کئی سال سے آرہا تھا۔ چنانچہ بنٹنگ نے سول اور فوجی محکموں میں تخفیف مصارف کے متعلق تحقیق کرنے کے لئے دو کمیٹیاں مقرر کیں تاکہ اس ضمن میں پوری چھان بین کے بعد اپنی تجویزیں پیش کریں۔ اس سے پہلے کہ فوجی محکمے کے متعلق تحقیق کرنے والی کمیٹی اپنی سفارشیں پیش کرے مجلس نظما (بورڈ آف ڈائرکٹرز) نے فوجی افسروں کے بھتہ کو نصف کرنے کے احکام گورنر جنرل کو بھیجدئے۔ دراصل بھتہ کو کم کرنے کے متعلق مجلس نظما نے مارکوئس آف ہیسٹنگز اور لارڈ ایمہرسٹ کے عہد میں بھی احکام بھیجے تھے۔ لیکن ان دونوں نے دوبارہ غور کے لئے ان احکام کو انگلستان واپس کر دیا تھا۔ بنٹنگ چونکہ خود بھی حکومت کے مالی توازن کو قائم کرنے کی تائید میں تھا اس لئے اس نے مجلس نظماء کے احکام کی تعمیل کا حکم دے دیا۔ فوجی افسر مدت سے بھتہ کو اپنی تنخواہ کا جزو سمجھنے لگے تھے۔ انھوں نے مجلس نظماء کے احکام کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ کمانڈران چیف لارڈ کمبرمیر نے احکام کو انصاف کے خلاف ٹھرایا۔ اس پر مجلس نظماء نے یہ تجویز منظور کی کہ اگر کمانڈران چیف نے بطور خود اپنا استعفیٰ داخل نہ کر دیا تو اسے فوراً خدمت سے الگ کر دیا جائیگا۔ چنانچہ لارڈ کمبرمیر مستعفی ہوگئے اور کمانڈران چیف کا عہدہ بھی گورنر جنرل کے عہدہ میں ملا دیا گیا۔ کلکتہ کے انگریزی اخباروں میں بنٹنگ کے خلاف توہین آمیز مضامین شائع ہونے لگے۔ مجبور ہو کر حکومت ہند کو احکام صادر

[1] Beveridge, Comprehensive History of India, Vol. III, p.195.

کرنے پڑے کہ اگر کسی اخبار میں آئندہ فوجی افسروں کے بھتہ کے ضمن میں کوئی مضمون یا تنقید شائع ہوگی تو حکومت اس کے خلاف سخت تعزیری کارروائی کرے گی۔ اس سلسلے میں بنٹنگ انگریزی فوجی طبقہ میں بہت بدنام ہوگیا۔ لیکن اس کے لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ وہ مجلس نظما کے احکام کو جو تیسری مرتبہ ڈیوک آف ولنگٹن وزیر اعظم انگلستان کے پورے اتفاق رائے کے ساتھ بھیجے گئے تھے کھٹائی میں ڈال دیتا۔ بھتہ کے علاوہ سپاہیوں کی تعداد میں کمی کی گئی اور اس طرح فوجی اخراجات میں تقریباً ایک کروڑ روپیے سالانہ کی بچت نکالی۔ سول محکموں میں بھی تخفیف ہوئی۔ بعض سررشتے توڑ دئے گئے اور بعض صورتوں میں کئی سررشتے ملاکر ایک عہدہ دار کے تحت کر دئے گئے۔ اس طرح سول محکموں کے اخراجات میں چھ فی صدی کی کمی ہوئی۔

فوجی اور سول محکموں کے اخراجات میں تخفیف کے علاوہ بنٹنگ نے حکومت کی آمدنی بڑھانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ رابرٹ برڈ کی نگرانی میں شمال مغربی صوبے کے زرخیز علاقوں میں مالگزاری کی جدید تشخیص کرائی گئی اور اس طرح آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اس صوبے کے انتظام مالگزاری کے لیے الہ آباد میں ایک علٰحدہ بورڈ آف ریونیو قائم کیا گیا۔ لارڈ ولزلی نے جب ان علاقوں کا الحاق کیا تھا تو وعدہ کیا تھا کہ دس سال بعد وہاں بھی دوامی بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن مجلس نظماء نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بنٹنگ نے تیس سال کے لئے جمع بندی کا ضابطہ نافذ کیا۔ اس انتظام کی خوبی اس کی سادگی میں مضمر تھی۔ پنج سالہ بندوبست کی وجہ سے جس کی مجلس نظماء نے اجازت دی تھی کاشتکار زمین کو زرخیز بنانے پر روپیہ خرچ کرنے کو حماقت سمجھتا تھا۔ جب بندوبست کی تجدید کا وقت آتا تھا تو کنویں اور زیر کاشت رقبہ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دئے جاتے تھے۔ بنٹنگ نے پنج سالہ بندوبست اور دوامی بندوبست دونوں کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے تیس سالہ بندوبست

کا ضابطہ نافذ کیا جو نتیجے کے اعتبار سے کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ ان زمینوں پر بھی لگان عاید کئے گئے جو اب تک عطیوں یا معافیوں کے نام سے ہر قسم کے سرکاری مطالبوں سے مستثنیٰ رہی تھیں۔ اگرچہ کارنوالس کے عہد سے اس قسم کی معافیوں اور عطیوں کے متعلق مال کے افسروں کو تحقیق کرنے کی تاکید کی گئی تھی لیکن اس ضمن میں ہر ہر قدم پر ایسی دشواریاں پیش آئیں کہ کام کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بنٹنگ کے ہندوستان آنے سے چند ہفتے پہلے حکومت ہند نے مال کے افسروں کی ایک کمیٹی مقرر کردی تھی تاکہ وہ عطیوں اور معافیوں کے جھگڑوں کی اپیل سنے اور فیصلہ کرے جو قطعی سمجھا جائے گا۔ بنٹنگ نے کمیٹی کے کام میں جس دلچسپی کا اظہار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام عرصے سے کھٹائی میں پڑا ہوا تھا وہ بہت جلد تکمیل کو پہنچنے لگا۔ عام طور پر زمینوں کے قبضے والوں کو بے دخل نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان پر مالگزاری عاید کردی جاتی تھی جس کی وجہ سے حکومت کی آمدنی میں کم و بیش ۳۰ لاکھ روپیے سالانہ کا اضافہ ہوا۔ افیون کے ٹھیکہ سے بھی آمدنی بڑھائی گئی۔ وران ہیسٹنگز اور سر جان شور کے عہد سے بنگال میں افیون بیچنے کا ٹھیکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے جب وسط ہند کے وسیع علاقوں میں امن و امان قایم کیا تو وہاں افیون کی کاشت بڑے پیمانے پر ہونے لگی اس واسطے کہ یہاں کی زمین اس کے لئے خاص طور پر موزوں تھی۔ چنانچہ وسط ہند اور مالوہ کے دیسی والیان ملک کے علاقوں سے افیون کی بڑی مقدار دیو اور دامن کے پرتگیزی بندرگاہوں کو جانے لگی جہاں سے پرتگیز جہاز راں اسے چین لے جاکر بیچتے تھے۔ یا دیسی تاجر راجپوتانہ کے ریگستانی راستوں سے افیون کی بڑی مقدار صندوقوں میں بھر بھر کے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچا دیتے تھے جو اس وقت امیران سندھ کے تحت تھا۔ یہاں پرتگیزی تاجر خریدنے کو موجود رہتے تھے۔ اس طرح کمپنی کو تجارتی مقابلہ کے سبب چین کے بازاروں میں افیون کی تجارت میں نقصان ہو رہا تھا اور وہ من مانے دام نہیں حاصل کرسکتی تھی۔ لارڈ ایمہرسٹ کے زمانے میں

ہلکر سے افیون کی کاشت اور فروخت کے متعلق سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ لیکن سندھیا اور راجا جے پور نے اس قسم کا کوئی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بنٹنگ یہ نہیں چاہتا تھا کہ افیون کی تجارت کے سلسلے میں حکومت ہند کوئی ایسی کارروائی کرے جو وسط ہند اور راجپوتانہ کے والیان ملک کو ناگوار گزرے۔ سر جان مالکم کی تجویز کے بموجب آخر یہ سمجھوتہ ہوا کہ وسط ہند اور راجپوتانہ سے جو افیون کراچی بھیجی جاتی ہے وہ سب بمبئی بھیجی جائے جہاں تاجروں کو اختیار ہوگا کہ چاہیں تو کمپنی کے ہاتھ افیون فروخت کر دیں اور چاہیں براہ راست برآمد کریں چونکہ کراچی بھیجنے میں خرچ زیادہ پڑتا تھا اور اس کے مقابلہ میں بمبئی تک لانے میں بہت کم خرچ ہوتا تھا اس واسطے لازم قرار پایا کہ افیون کے تاجر مقررہ وزن کے ہر صندوق پر اجازت نامہ کی فیس ادا کریں جو کسی حالت میں بھی اس رقم سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے جو کراچی بھیجنے کی صورت میں زیادہ خرچ کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح افیون کی خرید فروخت پر کمپنی کو قابو حاصل ہوگیا اور حکومت کے خزانہ میں بھی اضافہ ہوا۔ دیسی ریاستوں کو بھی اس کی شکایت کا موقع نہ رہا کہ ان کے اندرونی معاملوں میں کمپنی دخل دیتی ہے[1]۔

عدالتی انتظام صوبہ جاتی عدالتوں کا انتظام عرصے سے اصلاح طلب تھا۔ خاص کر صوبۂ شمال مغربی کی عدالتوں کے اعلیٰ حکام سال میں دو مرتبہ دورہ پر جاتے تھے۔ سوائے چند مستثنیٰ حکام کے اکثر حکام بے پروائی سے معاملات کی تحقیقات کرتے تھے۔ ملزموں کو دورہ پر آنے والے حکام کے انتظار میں مہینوں حوالات میں رکھا جاتا تھا۔ حکام کی بے پروائی کی وجہ سے ان کے فیصلے اکثر متضاد ہوتے تھے جس کے سبب سے ماتحت عدالتوں کے لئے سخت پریشان کن نظیریں قائم ہو جاتی تھیں۔ ان عدالتوں میں انصاف رسانی میں دیر لگتی تھی اور دادرس زیربار ہوتے تھے۔ بنٹنگ نے ان عدالتوں کو موقوف کر کے مقامی عدالتیں قائم کیں اور ان پر ججوں کو

---

1. Beveridge, III, p. 189

مقرر کیا۔ ان ججوں کی نگرانی کے لئے کمشنروں کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا جو خود دورے کر کے رعایا کی ضرورتوں اور شکایتوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے۔ کارنوالس کو ہندوستانیوں پر بھروسا نہیں تھا اس لئے اس نے تمام اعلیٰ انتظامی عہدوں پر انگریزوں کو رکھا تھا۔ بنٹنگ نے محسوس کیا کہ نظم و نسق میں کارکردگی بڑھانے کے لئے اعلیٰ عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس نے ان نئے عہدوں پر قابل ہندوستانیوں کو مقرر کیا۔ خاص طور پر عدالتی انتظام میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے اس لئے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی رسموں، رواج اور قانون کو بہتر سمجھ سکتے تھے۔ اس اصلاح سے یہ فائدہ ہوا کہ کام جلد ہونے لگا اور انتظامی اخراجات بھی زیادہ نہیں پڑے اس لئے کہ ہندوستانی عہدہ دار مقابلتہً کم تنخواہ پر قناعت کرتے تھے۔ بنٹنگ نے مقامی ابتدائی عدالتوں کے اختیارات میں اضافہ کر دیا تاکہ اہل معاملہ کو آسانی ہو اور ان کی اپیل کے لئے الہ آباد میں ایک صدر عدالت قایم کر دی۔ ہندوستانیوں کو انتظامی شعبوں کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنے میں سر چارلس مٹکاف کی رائے کا بھی بنٹنگ پر بڑا اثر ہوا۔ مٹکاف کا خیال تھا کہ "اہل ہند کے لئے موجودہ حالات میں بہترین طریق حکومت وہ ہے جس میں سادگی ہو اور مصنوعی اداروں سے پاک ہو۔ اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے بہترین طریق حکومت وہ ہے جس میں تصادم کے عناصر بالکل نہ ہوں اور حکومت کی وحدت برقرار رہے۔ اس کے لئے ضرور ہے کہ ہر محکمے میں دیسی عہدہ داروں کو مقرر کیا جائے۔ ان کی نگرانی انگریز حکام کریں جن کے تحت عدالت، مال اور پولیس کے محکموں کی شاخیں ہوں جو ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ ان انگریز حکام کے اوپر کمشنر ہوں اور کمشنروں کے اوپر ایسے بورڈ جو براہ راست حکومت کے تحت ہوں اور اس سے راست تعلق رکھتے ہوں"۔ مٹکاف کا بھی بنٹنگ کی طرح یہ خیال تھا کہ انگریز قوم کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہندوستان میں ایسی حکومت قایم کرے جو رعایا کی

بھلائی کا پورا دھیان رکھے۔ سر چارلس مٹکاف کو ہندوستان کے حالات کا وسیع تجربہ حاصل تھا۔ چنانچہ بنٹنگ نے اس تجربہ سے اپنے اصلاحی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔

ستی کی رسم کی موقوفی

ستی کی رسم ہندوستان میں قدیم سے رائج تھی۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں اس کی روک تھام کی کوشش کی گئی لیکن پوری طرح یہ رسم مٹ نہ سکی۔ فرانسیسی سیاح تیورنئے نے جو اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ مغل حکام نے اس رسم کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن پھر بھی چھپے چوری سے ستی کی رسم منائی جاتی ہے اور بیوہ اپنے شوہر کے مرنے پر زندہ آگ کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے[1]۔ اطالوی سیاح منوچی نے بھی جو اسی زمانے میں ہندوستان آیا تھا لکھا ہے کہ اورنگ زیب کا حکم تھا کہ کسی عورت کو زندہ نذر آتش ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ستی کی رسم ملک بھر میں بے روک ٹوک جاری ہوگئی۔ چنانچہ ۱۷۸۰ء میں مارواڑ کے راجا اجیت سنگھ کے انتقال پر ۶۴ عورتیں آگ کی بھینٹ چڑھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں بھی یہ رسم جاری تھی۔ چنانچہ سکھ سرداروں کے انتقال پر کئی کئی عورتیں جلکر بھسم ہوجاتی تھیں اور اس کو ایک قسم کا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ لارڈ ولزلی کے عہد میں بعض مقامی انگریز عہدہ داروں نے گورنر جنرل کی توجہ اس بری رسم کی روک تھام کے لئے منعطف کرائی۔ ولزلی نے اس معاملہ کو کلکتہ کی عدالت العالیہ کے سامنے پیش کر دیا جس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ چونکہ یہ رسم مذہبی عقیدہ پر مبنی ہے اس لئے اس میں دخل دینا مناسب نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد ایسے قاعدے وضع کئے گئے جن کے بموجب اگر بیوہ کی عمر سولہ سال سے زائد ہو اور وہ حاملہ نہو اور مقامی حکام کو اس بات کا اطمینان ہو کہ وہ اپنی خوشی

[1] Tavernier, Travels in India, II, p. 162, 163; Fryer, A New Account, ed. Crooke, (Hakluyt Society); Vol. I, p. 244.

سے ستی ہونا چاہتی ہے تو اسے ستی ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ ستی ہونے کے وقت پولیس کا ایک شخص موجود رہتا تھا تاکہ وہ اطمینان کرلے کہ ستی ہونے والی عورت پر دباؤ تو نہیں ڈالا جا رہا ہے۔ لیکن پولیس کی یہ نگرانی محض برائے نام تھی۔ اکثر پولیس کے آدمی کو کچھ لے دے کر خاموش کردیا جاتا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں صرف بنگال میں ۸۳۹ ستی کے واقعات ہوئے اور ۱۸۲۸ء میں ۴۶۳ بیوائیں ستی ہوئیں۔ مسٹر ایور نے جو جنوبی بنگال کے کئی ضلعوں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اعلیٰ عہدہ پر کئی سال تک مامور تھا اپنی یادداشت میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ستی خوشی سے بہت ہی کم ہوتی تھی۔ ستی ہونے والی پر ہر قسم کے معاشرتی اثرات ڈالے جاتے تھے اور اس کو مختلف طریقوں سے اس قدر پریشان کیا جاتا تھا کہ وہ بیچاری بوکھلاہٹ میں اپنی رضامندی کا مجبور ہو کر اظہار کر دیتی تھی۔[1]

بنٹنگ نے ۱۸۲۹ء میں اپنے مشیروں میں سے بعض کے اختلاف کے باوجود ایک قانون منظور کیا جس کے بموجب ستی کی رسم کو قطعی ممنوع قرار دیا گیا۔ اس قانون میں اس بات کی وضاحت کردی گئی کہ جو کوئی کسی بیوہ کو ستی ہونے پر آمادہ کرے گا وہ قتل کا ملزم قرار پائے گا۔ بنٹنگ جانتا تھا کہ ہندوستانیوں کے کسی مذہبی معاملہ میں دخل دینے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے کہ مدراس کی گورنری کے زمانے میں اس کو اس کی نسبت تھوڑا بہت تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے اس موقع پر بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا۔ سر چارلس منکاف اگرچہ بنٹنگ کا اس باب میں ہم نوا تھا لیکن اس کو بھی یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ستی کو قانوناً ممنوع قرار دینے سے شورش نہ ہو جائے۔ انگریزوں میں اس زمانے کے مشہور مستشرق ولسن نے بنٹنگ کے قانون کی صاف طور پر مخالفت کی۔ بنٹنگ نے بڑی عقلمندی یہ کی کہ خود ہندوؤں کے ایک طبقہ کو جو اگرچہ بہت کم تعداد میں تھا اپنا ہم خیال بنا لیا

[1] J. Peggs, India cries to humanity (Second Edition, 1830), p. 14.

تاکہ حکومت پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ وہ رعایا کے مذہبی معاملوں میں دخل دیتی ہے۔ بنگال کے مشہور مصلح راجا رام موہن رائے ستی کی رسم کے خلاف تھے۔ سر چارلس مٹکاف اور بعض دوسرے انگریز عہدہ داروں کو جو عام شورش کا خطرہ تھا وہ درست نہیں نکلا۔ کلکتہ کے بعض کٹر مذہبی ہندوؤں نے اس قانون کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل کی جو رد ہوگئی۔ اس کے بعد لوگ ستی کی موقوف ہونے کے ایسے عادی ہوگئے کہ کسی نے بھی اس رسم کی تائید میں آواز بلند نہیں کی۔ بنٹنگ کی اصلاح سے ہزاروں ہندو بیواؤں کی جان بچ گئی جو اکثر اپنی مرضی کے خلاف آگ میں جھونک دی جاتی تھیں۔

ٹھگی کی روک تھام

ٹھگوں کے جتھے قدیم سے وسط ہند میں موجود تھے۔ لوٹ مار ان کا پیشہ تھا۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے وسط ہند کے پنڈاریوں کا خاتمہ کر دیا تھا جو مسلح فوجی قسم کے ڈاکو تھے لیکن ان کے خاتمہ کے بعد بھی لٹیروں کی ایک اور ٹولی باقی رہی جو ٹھگ کہلائے جاتے تھے۔ ٹھگ مسافروں کو دھوکے سے مار کر ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیتے تھے۔ یہ لوگ راہ چلتے مسافروں کے دوست بن کر ان کا اعتماد حاصل کرتے تھے اور پھر موقع پاکر انھیں بے رحمی سے قتل کر ڈالتے تھے اور گڑھوں میں جو پہلے سے تیار رکھے جاتے تھے انھیں دفن کر دیتے تھے۔ ان کی ٹولیاں بھیس بدل کر وسط ہند اور دکن کے جنگلوں میں ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں۔ ان کے خاص اشارے ہوتے تھے جنھیں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ملک میں چونکہ اب تک پولیس کا ایسا انتظام نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے اس لئے ٹھگوں کی دست برد کی پوری طرح روک تھام کرنا دشوار تھا۔ بنٹنگ نے مسٹر سلیمن کو جو ایک نہایت تجربہ کار افسر تھا ٹھگوں کی بیخ کنی کے لیے مامور کیا، اور ایک علیحدہ محکمہ ٹھگی کے انسداد کے لیے قایم کر دیا۔ ابتدائی چھ سالوں میں ڈیڑھ ہزار ٹھگ پکڑے گئے۔ مسٹر سلیمن اور اس کے عملے نے بڑی محنت اور سرگرمی سے چن چن کر ٹھگوں کو گرفتار کیا اور انھیں سخت سزائیں دیں۔ چھ برس کی مسلسل کوشش کے بعد اودھ سے لیکر حیدرآباد تک کا سارا علاقہ ٹھگوں سے پاک ہوگیا۔

ان کے سرغنوں کو پھانسی دے دی گئی اور نو عمر بچوں کو زراعت کا کام سکھانے کا انتظام کیا گیا تاکہ وہ لوٹ مار کے بجائے آئندہ پرامن زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جائیں۔ بنٹنگ نے یہ پکا ارادہ کر لیا تھا کہ ٹھگی کی روک تھام میں خواہ کتنا ہی روپیہ کیوں نہ صرف ہو جائے وہ اس سے دریغ نہ کرے گا۔ وہ اپنے اس ارادے میں پوری طرح کامیاب ہوا۔[1]

شاہی منشور کی تجدید ۱۸۳۳ء

۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو شاہی منشور عطا کیا گیا تھا اس کی میعاد ۱۸۳۳ء میں ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء میں پارلیمنٹ نے منتخبہ مجالس مقرر کیں تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کی چھان بین کر کے اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کریں۔ بادشاہ جارج چہارم کے انتقال، پارلیمنٹ کی برخاستگی اور لارڈ ولنگٹن کی وزارت کی جگہ ارل گرے کی لبرل وزارت کا قیام ایسے واقعات تھے جن کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملوں کی طرف پارلیمنٹ کچھ عرصے تک توجہ نہ کر سکی۔ لیکن اس دوران میں منتخبہ مجالس نے شہادتوں کے ذریعے کافی مواد اکھٹا کر لیا تھا اور کمپنی کے معاملات کے متعلق ملک میں جو رجحان پائے جاتے تھے ان سے وہ بخوبی واقف ہو چکی تھیں۔ آخر ۱۸۳۳ء میں مجلس نظار کے صدر چارلس گرانٹ نے منشور کی تجدید کا مسئلہ ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا۔ پارلیمنٹ نے خاص طور پر چین کی تجارت کے اجارہ اور ہندوستان میں کمپنی کے طریق حکومت کی نسبت توجہ کی۔ بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد منشوری قانون منظور ہوا جس میں مندرجہ ذیل اہم امور طے پائے:۔

آئندہ بیس سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے ہندوستانی مقبوضات پر متصرف رہے گی۔ لیکن وہ حکومت ہند کی خدمت کے فرائض ہز مجسٹی ملک معظم اور ان کے جانشینوں اور وارثوں کی جانب سے بطور کفالت انجام

[1] ٹھگی کے متعلق تفصیل ملاحظہ ہو سلیمین کی کتاب۔ Rambles and Recollections

دے گی۔ ہندوستان میں کمپنی کو جو چائے کی تجارت کا اجارہ حاصل تھا وہ ختم کر دیا جائے گا۔ کمپنی آئندہ سے چین کی تجارت کی بھی اجارہ دار نہیں رہے گی بلکہ انگلستان کے تاجروں کو اجازت ہوگی کہ وہ اس ملک کے ساتھ براہ راست تجارت کریں۔ کمپنی کو چاہئے کہ جلد سے جلد ہندوستان میں اپنے کاروبار کو ختم کر دے۔ آئندہ سے وہ حکومت ہند کی آمدنی میں سے ½ ۱۰ فیصدی کی حقدار ہوگی جس سے اس کا قرضہ بے باق کیا جائے گا۔ جن حصہ داروں کا سو پونڈ کا کمپنی میں حصہ ہوگا انھیں دوسو پونڈ دیے جائیں گے اور اس غرض کے لئے بیس لاکھ پونڈ کمپنی پارلیمنٹ کو ادا کرے گی تاکہ آئندہ یہ رقم سود در سود سے اتنی ہو جائے کہ حصہ داروں کے مطالبے پورے ہو سکیں۔

ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کا سول اور فوجی نظم و نسق گورنر جنرل اور اس کے ارکان کونسل کے سپرد ہوگا جو آئندہ سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کہلائے گا۔ اعلیٰ عہدوں کے تقرر کے اختیارات مجلس نظماء کو بدستور حاصل رہیں گے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان کی تعداد بجائے تین کے چار ہوگی۔ ایک رکن وضع قانون کے لئے ہوگا جس کا کمپنی کے ملازموں میں سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ بمبئی اور مدراس کی پریسی ڈنسیوں کے گورنروں کی کونسل میں ارکان کی تعداد دو ہوگی۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ اگر مناسب سمجھے تو پریسی ڈنسی کی حکومت گورنر کے سپرد کر دے اور ارکان کونسل کو ان کے فرائض سے سبکدوش کر دے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ہندوستان کے کل برطانوی مقبوضات کے لئے وضع قوانین کا اختیار حاصل ہوگا۔ صوبوں کے گورنر اپنے اپنے علاقوں کے لئے جو ضابطے نافذ کرنا چاہیں ان کے مسودے پہلے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی منظوری کے لئے پیش کرنا ہوں گے۔ اگر پریسی ڈنسیوں کی حکومت کو وضع قانون کے حق سے محروم نہ کیا جاتا تو ہندوستان کے کل برطانوی مقبوضات میں ایک مشترک اور یکساں قانون نافذ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے گورنروں کو قاعدے اور ضابطے بنانے کی اجازت دی گئی تھی تاکہ ان کے

کام میں بھی رکاوٹ نہ پڑے۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مجاز گردانا گیا کہ

(الف) کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جو قانون یا قواعد نافذ ہیں ان میں ترمیم یا تبدیلی کر سکے۔

(ب) کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جتنی بھی عدالتیں ہیں چاہے وہ شاہی منشور سے قایم ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں، ان میں اپنے منظور کئے ہوئے قوانین کو نافذ کرے۔

(ج) ہندوستانی مقبوضات کے تمام حصوں۔ مقامات۔ اور اشیاء پر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے منظور کردہ قوانین کا اطلاق ہوگا۔ کمپنی کی حدول میں جو لوگ بھی آباد ہوں چاہے وہ انگریز ہوں یا ہندوستانی، کمپنی کے ملازم ہوں یا نہ ہوں یا وہ انگریز جو ان دیسی والیان ملک کے ہاں ملازم ہوں جن کے ساتھ کمپنی کا معاہدہ ہو چکا ہے ان سب پر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے منظور کردہ قوانین کا اطلاق ہوگا۔

اس کے ساتھ اس امر کی بھی صراحت کر دی گئی کہ مندرجہ ذیل امور کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو وضع قانون کا حق حاصل نہ ہوگا۔

(الف) گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کوئی ایسا قانون وضع کرنے کا حق نہیں رکھتا جس کی رو سے ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کی دفعات یا ان قوانین کی دفعات کی خلاف ورزی۔ تنسیخ۔ تبدیلی یا التواعمل میں آنے کا اندیشہ ہو جو تاج یا کمپنی کے فوجی افسروں یا سپاہیوں کی فراری بہ حالت جنگ یا ان کی بغاوت کو فرو کرنے کے متعلق وضع کئے گئے ہیں۔

(ب) کوئی ایسا قانون نہیں وضع کیا جا سکے گا جس سے تاج کے اختیارات یا پارلیمنٹ کا اقتدار یا کمپنی کا اساسی دستور یا اس کے حقوق یا برطانیہ کے غیر تحریری دستور کا کوئی حصہ متاثر ہوتا ہو۔

(ج) ایسے قوانین وضع نہیں کئے جا سکیں گے جن کے متعلق پہلے سے مجلس نظماء سے منظوری نہ حاصل کر لی گئی ہو یا جن کی بدولت ان عدالتوں کو

جو شاہی منشوروں کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں اور دوسری عدالتوں کو یہ حق حاصل ہو جائے کہ وہ ہز مجسٹی ملک معظم کی رعایا کے ان افراد کو جو یورپ میں پیدا ہوئے ہیں یا ان کی اولاد میں سے ہیں کسی فرد کو سزائے موت دینے کا حکم دے۔

(د) ان عدالتوں کو جو شاہی منشوروں کے ذریعہ قایم ہوئی ہیں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے منظور کردہ قوانین سے توڑا نہیں جاسکتا۔

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے تمام منظور کردہ قوانین پارلیمنٹ کے سامنے منظوری کی غرض سے پیش کئے جائیں گے۔ پارلیمنٹ کو یہ حق رہے گا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کے لیے براہ راست قانون وضع کرسکے یا گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے قوانین کو منسوخ کردے۔

کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کیلئے جو قوانین وضع کئے جائیں گے ان کی ترتیب و تدوین کا کام حکومت ہند کرے گی تاکہ اس کے تمام مقبوضات میں یکساں عدالتی نظام قایم ہو۔ ان قوانین کی پابندی سب باشندوں پر جو کمپنی کے مقبوضات کی حدوں میں آباد ہیں بلا لحاظ طبقہ اور بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ یورپین ہیں یا ہندوستانی لازمی ہوگی۔ باشندوں کے رسم و رواج کا وضع قانون کے وقت خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ جن مقامات میں رسم و رواج بمنزلۂ قانون ہے وہاں رسم و رواج کو تسلیم کرنا چاہیئے اور اگر موقع ہو تو اس میں مناسب تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے۔

اس منشوری قانون میں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ہدایت کی گئی ہے کہ قوانین کی تدوین کے لئے زیادہ سے زیادہ پانچ رکنوں کا ایک کمیشن (انڈین لا کمیشن) مقرر کیا جائے جس کا کام یہ ہوگا کہ کمپنی کے موجودہ مقبوضات میں جتنے عدالتی ضابطے نافذ ہوں ان کے متعلق پوری چھان بین کرے اور رواجی قوانین کے متعلق بھی تحقیق کرکے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ کے غور کے لئے پیش ہوگی۔ میکالے اس کمیشن کا رکن تھا۔ اس کمیشن کی سفارشیں بعد میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوئیں جن پر تعزیرات ہند مبنی قرار پائی۔

۱۸۳۳ء کے منشوری قانون میں اس امر کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ ہز مجسٹی ملک معظم کی رعایا کے ہر فرد کو جو انگلستان میں پیدا ہوا ہو اس کی اجازت ہوگی کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جہاں چاہے رہے یا ان میں سے ہو کر گزر سکے لیکن اس کا فرض ہوگا کہ اپنا نام اور مقام کا پتہ جہاں وہ جانا چاہتا ہے اور ہندوستان آنے کی جو غرض ہے اس کے متعلق کروڑگیری کے متعلقہ افسروں کو آگاہ کردے۔ جو شخص انگلستان میں پیدا ہوا ہے اس کا مجاز ہوگا کہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں جائیداد خرید سکے۔ لیکن گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو اختیار ہوگا کہ ان لوگوں کا داخلہ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں ممنوع قرار دے جن کی نسبت اس کو خیال ہو کہ ان کا یہاں آنا یا رہنا مناسب نہ ہوگا۔ ایسے انگریز جو بلا اجازت نامہ (لائسنس) لئے ہوئے ہندوستان آئیں گے وہ قانوناً سزا کے مستوجب ہوں گے۔ یورپین لوگوں کا اگر کہیں دیسی باشندوں سے میل جول بڑھے تو اس صورت میں گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مجاز ہوگا کہ جلد سے جلد ایسے قوانین وضع کرے جن سے دیسی باشندوں کی حفاظت ہو سکے اور ان کی ذات پات۔ مذہب اور رسوم کی ہتک نہ ہو۔ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کا کوئی دیسی باشندہ اور نہ ہز مجسٹی ملک معظم کی رعایا کا کوئی فرد جو انگلستان میں پیدا ہوا ہو اور اس وقت ہندوستان میں رہتا ہو اپنے مذہب۔ جائے پیدائش۔ نسل اور رنگ یا ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے کمپنی کے تحت اعلیٰ عہدوں پر مامور ہونے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اس دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ دیسی لوگوں کو کمپنی کی ملازمت میں شریک کیا جائے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو ذمہ داری کا اہل ثابت کریں۔

اس منشوری قانون کے بعد سے حکومت ہند جو قانون بنائے گی وہ بجائے ریگولیشن کے ایکٹ کہلائیں گے۔ کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات میں وہ پارلیمنٹ کے منظور شدہ قوانین کی طرح موثر ہوں گے بشرطیکہ مجلس نظماء اور بورڈ آف کنٹرول کی منظوری ان کے متعلق لے لی گئی ہو۔ مجلس نظماء اور بورڈ آف کنٹرول

کو اختیار ہوگا کہ جو قانونی مسودے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی جانب سے پیش ہوں انھیں نامنظور کر دے۔ لیکن ایسی صورتیں بہت کم پیش آئیں۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے اختیارات کا لحاظ کرنا اس لئے اور بھی ضروری ہوگیا کہ انگریزوں کی تعداد ہندوستان میں بڑھ گئی تھی اور نئے انتظامی معاملوں میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں جنھیں بہ حیثیت مقامی اعلیٰ عہدہ دار کے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ کونسل کے معمولی اجلاسوں میں اگر گورنر جنرل کے علاوہ صرف رکن موجود ہو تو نصاب پورا سمجھا جائے گا اور اگر قانون وضع کرنا ہو تو گورنر جنرل کے علاوہ تین ارکان کونسل کی موجودگی لازمی قرار پائی۔ گورنر جنرل بنگال اب گورنر جنرل ہند کہلانے لگا۔ بنگال کی وسیع پریسی ڈنسی کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا اور صوبہ شمال مغربی کا انتظام بنگال سے علیحدہ کردیا گیا۔ اس منشوری قانون کے منظور ہونے کے بعد مجلس نظماء کو تجارتی کاروبار کے انتظام سے بڑی حد تک آزادی حاصل ہوگئی اور اس سے سیاسی معاملوں پر توجہ کرنے کا موقع ملا چنانچہ آئندہ پچیس سال میں مجلس نظماء نے حکومت و سیاست کے معاملوں میں جس قوت عمل، معاملہ فہمی اور اعتدال پسندی کا ثبوت دیا وہ ہر طرح قابل تعریف ہے۔

انگریزی تعلیم کا رواج ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اپنے ہندوستانی مقبوضات میں رہنے والے ہندوستانیوں کی تعلیم کا شروع میں کوئی خاص انتظام نہیں کیا اس لئے کہ اس کے پیش نظر اس ملک میں تمدنی مشغلوں کو ترقی دینا نہ تھا بلکہ محض نفع کمانا۔ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ میں عربی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قایم کیا تھا اور جوناتھن ڈنکن نے جو بنارس میں کمپنی کا ریزیڈنٹ تھا وہاں سنسکرت کالج قائم کیا۔ ان دونوں اداروں کا مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعہ سے انگریز عدالتی حکام کو اسلامی شریعت اور ہندوؤں کے شاستروں کی توضیح کرنے کے لئے موزوں ہندوستانی مل سکیں۔ کمپنی کی حکومت اس کے لیے تیار نہ تھی کہ ہندوستانیوں کو عدالت کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرے۔ چونکہ انگریز حکام ہندوؤں اور مسلمانوں کے

قوانین نہیں جانتے تھے اس لئے عربی اور سنسکرت جاننے والے ہندوستانیوں کو کمپنی کی ملازمت کے دائرے میں لینے کی ضرورت ہوئی۔ لیکن کلکتہ اور بنارس کے دونوں اداروں نے کوئی خاص ترقی نہیں کی کمپنی کی حکومت نے یہ کیا کم کیا کہ انھیں قائم رکھا۔ ان اداروں کے علاوہ تینوں پریسی ڈنسیوں میں خیراتی مدرسے قایم ہوچکے تھے جو مسیحی مبلغوں کے زیر انتظام تھے اور جنھیں کمپنی مالی امداد دیا کرتی تھی۔ ان خیراتی مدرسوں کے پیش نظر یہ تھا کہ کمپنی کے جو غریب ہندوستانی ملازمین ہیں ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور چپکے چپکے انھیں مسیحیت کی طرف مائل کیا جائے۔

سنہ ۱۸۱۳ء کے منشوری قانون میں پہلی مرتبہ کمپنی کی حکومت نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہندوستانی رعایا کی تعلیم کے لئے مخصوص کئے اسوقت بعض انگریز ارباب اقتدار کی ایک جماعت کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان سکھانی اور انھیں عیسائی مذہب کی طرف رغبت دلانی چاہیئے کیونکہ بغیر اس کے ان کی حالت سدھارنے کی اور کوئی موثر تدبیر نہیں ہوسکتی لیکن اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ منٹو کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو خود ان کے علوم وفنون کی تعلیم دینی چاہیئے۔ وہ اس بات کے خلاف تھا کہ کمپنی کی حکومت مسیحی مبلغین کے ذریعہ اہل ہند میں مسیحی تعلیم پھیلانے کی کوشش کرے اس سے اندیشہ تھا کہ کمپنی کے سیاسی مفاد کو کہیں ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے۔ منشوری قانون میں ایک لاکھ کی منظوری اس غرض کے لئے دی گئی تھی کہ ذی علم ہندوستانیوں کی ہمت افزائی کی جائے اور مغربی علوم کی ترویج کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ رقم اگرچہ بالکل ناکافی تھی لیکن اس کی منظوری سے یہ پتا چلتا ہے کہ کمپنی کی حکومت کی حکمت عملی میں اب تبدیلی پیدا ہوچکی تھی اور وہ اہل ہند کے اخلاقی فلاح وبہبود کو بھی ایک حد تک اپنے پیش نظر رکھنے لگی تھی۔ سنہ ۱۸۱۳ء کے منشوری قانون کے منظور ہونے کے بعد انگلستان کی تاریخ میں جو زمانہ گزرا اس میں ہمیں اصلاحی رجحانوں کا نشوونما

ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔ دراصل انھیں لبرل اصلاحی خیالات کا عکس ہمیں کمپنی کے ہندوستانی نظم ونسق میں بھی آئندہ سالوں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۲۴ء میں مجلس نظماء نے لارڈ ایمہرسٹ کو لکھا کہ اہل ہند کی تعلیمی ترقی کے لئے اگر کسی قسم کی تجویزیں پیش کی جائیں تو وہ ان پر ہمدردی سے غور کرے گی۔ خود اہل ہند میں ایک ایسی جماعت اس زمانہ میں پیدا ہوگئی تھی جو مشرقی علوم کے بجائے مغربی علوم و فنون کی ترویج کو زیادہ اہمیت دیتی تھی جن میں راجا رام موہن رائے برہمو سماج کے بانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجا رام موہن رائے نے لارڈ ایمہرسٹ کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اس امر پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ ہندوستان میں ایسا تعلیمی نظام قائم کرنا چاہئے جس میں ریاضی فلسفہ۔ کیمیا۔ علم البدن اور دوسرے مفید علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اب ہندوستانیوں نے انگریزی زبان کی سیاسی اہمیت کو تھوڑا بہت محسوس کرنا شروع کردیا تھا۔

۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کے ذریعہ صراحت کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ کوئی ہندوستانی اپنی ذات پات یا مذہب کی وجہ سے کمپنی کے اعلیٰ عہدوں سے محروم نہیں رکھا جائے گا بشرطیکہ وہ اس کی قابلیت رکھتا ہو منشوری قانون کے منظور ہونے کے بعد حکومت ہند نے تعلیم عامہ کی جو جنرل کمیٹی مقرر کی تھی اس کے ارکان میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ آیا سرکاری امداد صرف ان مدارس کو دینی چاہیئے جن میں مغربی علوم کی انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم ہوتی ہے یا ان مدرسوں کو بھی دینی چاہئے جن میں صرف مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں دو فریق ہوگئے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغربی علوم وفنون کی تعلیم دینے سے اہل ہند کو زیادہ اور حقیقی فائدہ ہوگا اور دوسرے فریق کا یہ دعویٰ تھا کہ فارسی یا سنسکرت کے ذریعہ قدیم علوم کی تعلیم زیادہ مفید ہوگی اسلئے بغیر اس کے اہل ہند اپنی تہذیب کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان میں سے ایک فریق اورنٹیلسٹ اور دوسرا انگلی سسٹ کہلاتا تھا۔ پہلے کی سربراہی ڈاکٹر ولسن

کر رہا تھا اور دوسرے کی حمایت میں میکالے میٹکاف۔ سر چارلس ٹریولین اور رسل کالون گورنر صوبہ شمال مغربی جیسے ذی وجاہت و ذی اثر اشخاص شامل تھے۔ میکالے بہ حیثیت گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانونی کے جب ہندوستان آیا تو اس کو تعلیمی کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ اس نے ۲ فروری ۱۸۳۵ء ہندوستان کے تعلیمی مسئلہ کی نسبت ایک یادداشت تیار کی جس میں اس نے صاف صاف اپنے خیالات ظاہر کر دیے ہیں۔ اس یادداشت میں اس نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی فوقیت کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مشرقی زبانیں جدید تمدن کے خیالات سے عاری ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ وہ سائنس کے نظریوں کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ بر خلاف اس کے انگریزی زبان کو نہ صرف یہ کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں ادبی اعتبار سے بلند مرتبہ حاصل ہے بلکہ وہ تمام حقیقی علوم و فنون کے خزانوں کی کنجی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ مدرسے جن میں مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی ہے اور جنھیں حکومت امداد دیتی ہے بند کر دینے چاہئیں۔ ایسا کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ مثال دیتا ہے کہ ہم ایک مقام کی آب و ہوا کو اچھا سمجھ کر وہاں صحت گاہ قایم کرتے ہیں۔ اب اگر فرض کرو کہ وہاں کی آب و ہوا امید کے موافق اچھی نہ ہو تو کیا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ایسی حالت میں بھی صحت گاہ کو وہاں برقرار رکھیں۔ محض اس وجہ سے کہ ہم نے اسے وہاں قایم کر دیا ہے۔ ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں علم و ادب نام کو بھی نہیں۔ عربی اور فارسی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ "یورپین کتب خانہ کی ایک چھوٹی سی الماری کی کتابوں میں ہمیں جو علم ملتا ہے اس کی قدر و قیمت ہندوستان اور عرب کے مجموعی علم و ادب سے زیادہ ہے"۔ اس نے مشرقی زبانوں کی غلط تاریخ۔ لغو مابعد الطبعیات اور مہمل طبعیات کا بڑی حقارت سے ذکر کیا ہے۔ بنٹنک اور مٹکاف دونوں میکالے کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ حکومت ہند نے ۷۔ مارچ ۱۸۳۵ء فیصلہ کیا کہ بجائے فارسی

کہ انگریزی زبان حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کی جائے اور آئندہ سے صرف ان مدرسوں کو سرکاری امداد کے لائق سمجھا جائے جن میں انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو۔ اس طرح انگریزی تعلیم کے حامیوں کی مشرقی تعلیم کی فوقیت جتانے والوں کے مقابلہ میں جیت ہوئی اور اس وقت سے آج تک کم و بیش وہی تعلیمی نظام ہندوستان میں رائج رہا ہے جس کی داغ بیل میکالے کی یادداشت سے پڑی تھی۔ ہندوستان میں ایک مناسب تعلیمی نظام قائم کرنے کے متعلق جو اختلاف گزشتہ کئی سالوں سے چلا آرہا تھا اس کا فیصلہ میکالے کی غیر معمولی جادو بیانی اور ذاتی اثر نے اس جماعت کے حق میں کرادیا جو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی حمایت کر رہی تھی۔

۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں پہلا میڈیکل کالج کھولا گیا جس میں جراحی اور دواؤں کے مغربی طریقوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس درسگاہ میں انگلستان کی اعلیٰ سندیں رکھنے والے استاد مقرر کئے گئے۔ حکومت نے بڑی فیاضی سے وہ تمام قیمتی آلات کالج میں بہم پہنچائے جن کے باعث یہ درسگاہ اسی قسم کی یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مذہبی اور اعتقادی وجوہ کی بنا پر یہ کالج کامیاب نہیں رہے گا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط نکلا۔ چند سال میں ہندوستانی طلبہ کی بڑی تعداد اس کالج میں داخل ہوئی اور مغربی فن طب کا رواج روز بروز اس ملک میں بڑھنے لگا۔ بعض ہندوستانی طلبہ نے اپنی طب کی تعلیم کی اس درسگاہ میں تکمیل کر کے انگلستان کا سمندر پار سفر کیا تاکہ مزید معلومات اور تجربہ حاصل کریں۔

میکالے کا یہ خیال کہ انگریزی زبان کو اہل ہند مغربی علوم وفنون کے حاصل کرنے کا وسیلہ بنائیں گے عرصے تک عملی صورت اختیار نہ کرسکا۔ ہندوستانیوں نے انگریزی تعلیم اس لئے حاصل کرنا شروع کی کہ اس سے روزی کے دروازے کھل جاتے تھے اور ملازمتیں حاصل کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ جیمز مل نے میکالے کی یادداشت کے سرکاری طور پر منظور ہونے کے بعد یہ پیشین گوئی کی تھی

ا۔ C. E. Trevelyan, On the Education of the People of India, 1838, p. 33

کہ ہندوستانیوں کے تعلیمی اصول کو اس طرح ایکا ایکی بدل دینے سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں نکلے گا کہ ہندوستانی نوجوانوں پر انگریزی تہذیب و تمدن کا ایک ہلکا سا اوپری رنگ چڑھ جائے جسے وہ حقیقی علوم کی تحصیل کا وسیلہ نہیں بنائیں گے بلکہ ملازمت کے حصول کا ایک پروانہ۔ جیمز مل کا خیال حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ پھر اس کے علاوہ اس تعلیمی نظام پر جو میکالے کی یادداشت پر مبنی قرار دیا گیا اور ایک اعتراض یہ ہے کہ انگریزی کبھی بھی ہندوستانیوں کی قومی زبان نہ آج سے سو برس پہلے ہو سکتی تھی اور نہ آج ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ زبان قومی تعلیم کا وسیلہ کبھی بھی نہیں بن سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہندوستان کی وسیع آبادی میں صرف کچھ لوگ اس زبان پر پورا عبور حاصل کر سکیں گے۔ خود میکالے نے بھی یہ محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اس کا خیال تھا کہ انگریز ہندوستان کی پوری آبادی کی تعلیم کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ وہ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ ایک محدود جماعت کو انگریزی تعلیم دیں جو عوام اور حاکم طبقہ کے درمیان ترجمانی کے فرائض ادا کر سکے۔ یہ جماعت اپنے رنگ روپ کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوگی لیکن اپنے ذوق، ذہنیت اور فکری طریق کے اعتبار سے انگریزوں سے مماثلت رکھے گی۔ انھیں کے توسط سے مقامی زبانوں کو شائستہ اور شستہ بنایا جائے گا تاکہ یہ زبانیں عوام میں مغربی خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بن سکیں۔ غرض خود میکالے نے یہ تسلیم کیا کہ انگریزی زبان سوائے ایک محدود طبقہ کے اہل ہند کی قومی زبان کبھی نہیں بن سکے گی جس کے ذریعے سے عوام کی ذہنی اور اخلاقی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ پھر میکالے کا یہ خیال بھی غلط نکلا کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات چھن چھن کر عوام تک پہنچیں گے اور ان کی زندگی کی سطح کو بلند کریں گے۔ ہوا یہ کہ چونکہ انگریزی تعلیم ملازمت کے لئے حاصل کی گئی نہ کہ علمی پیاس بجھانے کے لئے اس لئے مغربی

ا ے Thompson and Garratt, Rise and fulfilment of British Rule in India, p. 315